بازار کی رونق

رضی عابدی

بازار کی رونق

رضی عابدی

کتاب محل (پرائیویٹ) لمیٹڈ 17-اُردو بازار (الفضل مارکیٹ)، لاہور۔

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

ناشر --- کتاب محل (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اُردو بازار، لاہور۔

Ph: 042-7241760, 0333-2325008

تعداد --- 300

اشاعت --- 2018

قیمت --- 300روپے

بازار کی رونق

❖❖

نہ ہم گاہک نہ سوداگر ہم سے لینا دینا کیا
پھر بھی ہیں بازار کی رونق دیوانے کہلاتے ہیں

❖❖

رضی عابدی

فہرست

۱۔ سونی پت سے لاہور تک ۵
۲۔ ۴۷ کا ہندوستان اور پاکستان ۲۳
۳۔ اعلیٰ تعلیم ۴۵
۴۔ دیارِ فرنگ میں ۶۶
۵۔ امریکہ اور کینیڈا میں گرمی کی چھٹیاں ۹۳
۶۔ کیمبرج میں واپسی ۱۱۰
۷۔ یورپ۔ دیوار کے اِدھر اُدھر ۱۴۳
۸۔ عراق، ایران، افغانستان ۱۵۲
۹۔ وطن واپسی ۱۷۰
۱۰۔ امیر خسرو اور تاج محل ۱۸۲
۱۱۔ سیاست کی قلابازیاں ۱۹۳
۱۲۔ ایران کا سفر ۱۹۶
۱۳۔ قافلۂ امن ۲۰۳
۱۴۔ اٹلانٹا سے نیویارک ۲۱۸

(۱)

سونی پت سے لاہور تک

ایک نوجوان امام باڑے کے دروازے کے اندر دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھوں میں جوتیاں تھیں جو اس نے زور زور سے بجائیں اور گالیاں دیتا ہوا ننگے پیر واپس بھاگ گیا۔ امام باڑے کے چبوترے سے۔ جو ذرا فاصلہ پر تھا۔ دو تین لڑکے اس کے پیچھے بھاگے۔ مگر وہ ہاتھ نہیں آیا۔ دو دفعہ ایسا ہی ہوا مگر تیسری دفعہ لڑکوں نے اسے پکڑ لیا اور دیوار کی طرف دھکیل کر اس پر پل پڑے۔ رندھے ہوئے گلے سے ایک ہیبت ناک آواز نکلی: ''بھائی جمن۔ بچاؤ۔ میرا گلا گھونٹ دیا''۔ کچھ بڑے لوگ دوڑے اور لڑکوں کو علیحدہ کر دیا، سونی پت کی متعدد یادوں میں سے یہ ایک بات مجھے بار بار یاد آتی رہتی ہے۔

سونی پت دلی سے ۲۷ میل (۴۴ کلومیٹر) کے فاصلے پر دلی اور پانی پت کے درمیاں ایک قصبہ تھا جو کئی لحاظ سے دور وسطیٰ کے ہندوستان کا ایک منفرد نمونہ تھا۔ یہاں ایک بڑا سا ٹیلہ تھا جسے کوٹ کہا جاتا تھا۔ اس پر کوئی ایک ہزار یا اس سے بھی کم گھر آباد تھے۔ کوٹ پر چار محلے تھے۔ محلہ قاضیاں۔ محلہ پیرزادگان۔ نوابوں کا محلہ اور بختیاریوں کا محلہ۔ جسے پٹھانوں کا محلہ کہا جاتا تھا اس لیے کہ باقی تین محلے سیدوں کے تھے۔ پیرزادوں کے محلہ میں ایک دھانکوں کی گلی بھی تھی یہ دھانک زیادہ تر کہار تھے۔ ان چاروں محلوں کے رہنے والے قدیمی جاگیردار تھے، ان کی جاگیریں گھٹتے گھٹتے اب برائے نام ہی رہ گئی تھیں کہ وہ کئی نسلوں سے ان پر پلتے آ رہے تھے اور ہر لحاظ سے سہل پسند اور ناکارہ ہو چکے تھے۔ کوٹ کے نیچے چاروں طرف مختلف آبادیاں تھیں۔ شمال مغرب کی جانب ہندوؤں کا علاقہ تھا جو بڑا بازار کہلاتا تھا۔ باقی اطراف میں مسلمانوں کی بستیاں تھیں جو پیشوں کے لحاظ سے آباد تھیں۔ مثلاً قصائیوں

کا محلہ، رائیوں کا محلہ، کمہاروں کا محلہ وغیرہ۔ یہ سب رعیت کہلاتے تھے۔ نیچے اترنے کے لیے لمبے لمبے اور کافی گہرے راستے تھے جو محلوں کے نام سے جانے جاتے تھے۔ جیسے قصائیوں کی گھاٹی رائیوں کی گھاٹی وغیرہ۔ یوں سارا شہر خاندانوں اور پیشوں کے حساب سے بسا ہوا تھا۔ کوٹ سے تقریباً ایک کلومیٹر پر ریل کا سٹیشن تھا جس کے دوسری طرف منڈی تھی۔ دلی سے آنے والی ریل جنوب مشرق کی طرف سے آتی تھی اور نعل کی شکل کا گھیرا ڈال کر پورے سونی پت کا چکر لگاتی ہوئی شمال مشرق کی جانب پانی پت کی طرف روانہ ہو جاتی تھی کچھ ہی آگے پانی پت کا تاریخی میدان تھا۔ رات کو جب ریل گاڑی کی بتیاں جلی ہوئی ہوتی تھیں تو کوٹ سے ایسا لگتا تھا جیسے جھلمل کرتی ہوئی پریوں کی بگھیاں اڑتی جا رہی ہوں۔ یہاں کے نوجوانوں کی خاصی تعداد دلی میں برسرروزگار تھی۔ یہ روزانہ صبح کی گاڑی سے دلی جاتے اور شام کی گاڑی سے لوٹتے۔ جب صبح ہی صبح پانی پت سے آنے والی گاڑی کی آواز آتی تو یہ لوگ گھروں سے بھاگنا شروع کرتے اور اسٹیشن پر گاڑی پکڑ لیتے۔ اس گاڑی کو آدھا کہتے ہیں اس لیے کہ اس میں صرف تین ڈبے ہوتے تھے۔ دلی سے آتے ہوئے انجن سیدھا لگا ہوتا تھا لیکن واپسی پر الٹا انجن گاڑی کے آگے لگا ہوتا تھا اس لیے کہ پانی پت میں انجن کو گھمانے کا انتظام نہیں تھا۔ پھر چوں کہ فاصلہ تھوڑا تھا اس لیے انجن بھی آدھا ہوتا تھا اس میں کوئلہ کی گاڑی والا حصہ نہیں ہوتا تھا۔

کوٹ اتنی اونچائی پر تھا کہ وہاں کسی کنویں کے ہونے کا امکان نہیں تھا۔ پانی کو اوپر لانے کے لیے بیلوں کا استعمال ہوتا تھا جن پر پانی کی بڑی بڑی پکھالیں لٹکی ہوتی تھیں۔ سقے ان پکھالوں سے مشکوں میں پانی نکال کر گھروں میں پہنچاتے تھے۔ رائیوں کی گھاٹی کے نیچے ایک کنواں ایسا تھا جس کا پانی گوشت گلانے اور دال پکانے کے لیے بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ویسے تو یہاں ایک مڈل سکول اور دو ہائی سکول تھے لیکن پڑھائی کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ ہندو پڑھائی میں آگے تھے۔ سنا ہے کہ جب ایک مرتبہ سونی پت کا ایک ہندو لڑکا پنجاب یونیورسٹی میں اول آیا (اس وقت سونی پت پنجاب کے صوبے میں تھا۔ اب یہ ہریانہ کا ایک ضلع

ہے) تو ہاتھی پر اس کا جلوس نکالا گیا۔ اس کے باوجود یہاں کے سادات گھرانوں میں علم کی طرف کوئی رغبت نہیں ہوئی۔ گو قیام پاکستان کے وقت سونی پت کے لوگوں میں کم از کم کیمرج کے ایک پی ایچ ڈی جو دلی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے چند ایم اے، ایک دو وکیل اور کوئی درجن بھر گریجویٹ تھے۔

اسی سونی پت میں غالباً ۱۰ اگست ۱۹۳۰ء کو (بقول میری والدہ) میری پیدائش ہوئی۔ سکول سرٹیفکیٹ کے مطابق میری تاریخ پیدائش ۲۱ جنوری ۱۹۳۳ء ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان پڑھائی میں ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں مسلمان بچے پڑھائی مکمل کرنے سے پہلے ہی ملازمت کی عمر سے نہ گزر جائیں اور یہ بھی کہ وہ زیادہ عمر تک نوکری کر سکیں۔ مسلمان ہیڈ ماسٹر صاحبان داخلہ کے فارم پر طالب علم کی تاریخ پیدائش خود ہی دو تین سال آگے بڑھا دیتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی میں کئی ایسی مثالیں تھیں کہ وہ جنھیں میں ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھتا رہا میری ریٹائرمنٹ کے چار پانچ سال بعد تک ریٹائر نہیں ہوئے۔ ایک صاحب کو قائداعظمؒ سے ہاتھ ملانے کا دعویٰ تھا جب کہ وہ ۱۹۹۳ء کے بعد ریٹائر ہوئے۔ اس طرح قیام پاکستان کے وقت ان کی عمر کوئی تیرہ سال کی ہوگی۔

سونی پت جو اس وقت رہتک کی ایک تحصیل تھی اب ہریانہ کا ایک ضلع بن چکا ہے۔ یہ کئی لحاظ سے ایک منفرد بستی تھی۔ کوٹ پر سب اپنے ہی لوگ تھے اس لیے عورتیں آزادی سے گھروں میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ اگر کوئی غیر شخص وہاں سے گزر رہا ہوتا تو آواز دے کر اس سے کہتیں۔ ''بھائی۔ ذرا منہ پھیر لے۔ میں جا رہی ہوں''۔ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ کوئی ۸۰ سے اوپر ہی ہوں گی۔ وہ ہمیشہ صرف شلوار اور انگیہ پہنے ہوتیں اور اوپر ایک چھوٹا سا دوپٹہ ہوتا ان کا کہنا تھا کہ ان کے زمانہ میں شریف زادیوں کا یہی لباس ہوتا تھا۔ یہ بزرگ خواتین بڑی صاحبِ ذوق بھی ہوتی تھیں۔ ایک بڑا دلچسپ واقعہ مشہور تھا کہ ایک مجلس میں ایک نوجوان کو پڑھنے نہیں دیا گیا جب کہ اس کے ہم عمر دو بھائیوں کو مجلس میں پڑھنے دیا گیا۔ یہ لڑکا جس کا نام

عباس تھا بہت بددل ہوا۔ اس کی ماں نے یہ قطعہ لکھا جو بہت مشہور ہوا۔

بلتی کا حکم یہ ہے کہ سب آن کر پڑھیں
نواب نامدار کے دونوں پسر پڑھیں
کوئی اگر پڑھے تو تو منع نہ کیجیو
عباس نامراد کو پڑھنے نہ دیجیو

ظاہر ہے یہ میر انیس کی پیروڈی تھی۔ لیکن اس سے عوامی ذوق کا پتہ ہوتا ہے۔ یہ خواتین باقاعدہ مدرسہ نہیں جاتی تھیں لیکن گھر پر ہی ان کی اچھی خاصی تربیت ہو جاتی تھی۔ دو ایک نسل پہلے تک گھروں میں فارسی بولی جاتی تھی فارسی کے شہادت نامے پڑھے جاتے تھے۔ اردو کا ذوق اعلیٰ تھا۔ انیسؔ، دبیرؔ، غالبؔ، میر حسنؔ، رجب علی، بیگ سرورؔ وغیرہ معروف نام تھے۔ الف لیلیٰ اور قصہ چہار درویش عام پڑھے جاتے تھے۔ میری نانی کے زمانے میں مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق اتنی مقبول تھی کہ اس وقت کی دوشیزائیں کمروں میں اندر سے کنڈی لگا کر اس مثنوی کو پڑھتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ ہمارے ہاں تو نہیں۔ لیکن سنا ہے کہ دوسری جگہوں پر کچھ لڑکیوں نے اس مثنوی کو پڑھ کر خودکشی بھی کر لی تھی۔ میرا ابھی ابتدائی ذخیرہ شعرو ادب ماں اور نانی کی سنائی ہوئی کہانیوں کا مرہون منت ہے۔

سونی پت سے اسی طرح کی کچھ یادیں اور کچھ باتیں وابستہ ہیں اس لیے کہ یہ میرا آبائی وطن اور جائے پیدائش تھا لیکن زندگی زیادہ تر دلی میں گزری صرف محرم کے تقریباً دو مہینے سونی پت میں گزرتے تھے یا جینے مرنے اور شادیوں وغیرہ پر وہاں جانا ہوتا تھا۔ اسی لیے سونی پت کے متعلق میرا علم بہت سرسری ہے لیکن جذبات بہت گہرے ہیں۔ سونی پت سے متعلق آخری یادیں تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات سے وابستہ ہیں۔ میرے والد جو پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں ملازم تھے انھوں نے پاکستان کے حق میں رضامندی دی تھی اس لیے ان کو غالباً جون ۱۹۴۷ء میں ہی دلی سے لاہور تبدیل کر دیا گیا۔ یوں ہم مئی میں ہی دلی کو چھوڑ

کر سونی پت چلے گئے۔ اس وقت بنگال، بہار اور یوپی میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا مگر دلی اور پنجاب میں ابھی نسبتاً حالات معمول کے مطابق ہی تھے۔ پھر ۱۵ اگست کی تاریخ آئی اور ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ سونی پت میں ہندوستانی ترنگا لہرایا گیا جسے ہمارے لوگوں نے بھی سلامی دی۔ اس کے کچھ روز بعد ہی فسادات شروع ہو گئے۔ ریل گاڑیوں پر حملے ہوئے۔ گاؤں کے گاؤں جلا دیے گئے۔ میرے ایک ماموں اور ایک اور عزیز جب ایک صبح گاڑی سے دلی جا رہے تھے تو گارڈ نے جو ہندو تھا لیکن اس لائن پر چلنے کی وجہ سے سب سے واقف تھا سب کو خبردار کیا کہ اس گاڑی سے نہ جائیں۔ باقی سب تو لوٹ آئے مگر یہ ماموں اور ایک دوسرے عزیز سوار ہو گئے اور اس طرح فسادیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ میرے والد ان خبروں کو سن کر بہت پریشان ہوئے۔ ہمارے لیے ان خبروں کا واحد ذریعہ پشاور کا ریڈیو اسٹیشن تھا جو سونی پت میں صاف سنائی دیتا تھا۔ والد ستمبر کے شروع میں بذریعہ جہاز دلی پہنچے اور وہاں سے ایک دوست کی کار لے کر سونی پت آ گئے حالات بہت پرخطر ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ خود تو وہیں ٹھہر گئے لیکن مجھے اور میری دو بہنوں کو ایک اور عزیز اور ان کی تین نوعمر خواتین کے ساتھ اسی کار میں دلی روانہ کر دیا۔ لڑکیوں نے ساڑھیاں باندھیں اور ماتھے پر بندیا لگائی۔ ایک صاحب جو دلی سے ہی آئے تھے بندوق تان کر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور ہندو تھا اور گاڑی پر ترنگا لہرا رہا تھا راستے میں ہم نے دیکھا کہ لوگ کسیاں، کلہاڑیاں اور لاٹھیاں وغیرہ اٹھائے سونی پت کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ سونی پت پر حملے کی افواہیں پہلے ہی سے پھیل رہی تھیں اور لوگ اپنے دفاع کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جوانوں کو جنگی تربیت دی جا رہی تھی اور ہتھیار بنائے جا رہے تھے۔ لوہار اور ترکھان مستقل مصروف تھے۔ راستہ میں ہم نے سڑک پر کئی لاشیں بھی پڑی دیکھیں۔ ایک منظر تو آج تک اسی طرح واضح، آنکھوں کے سامنے ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ لہنگے کرتے میں ملبوس ایک عورت اوندھی پڑی تھی اس کی کمر میں چھرا لگا ہوا تھا اور قریب ہی ایک چھوٹا سا بچہ جو ایک دو

سال کا ہو گا پڑا ہوا تھا۔ ہماری کار ان سے بچ کر تیزی کے ساتھ نکل گئی۔ دلی پہنچے تو عجیب ہی منظر تھا ہم موری گیٹ سے ڈفرن پل کے پاس پروفیسر ڈاکٹر اظہر علی کے گھر منتقل ہو گئے۔ وہاں پہلے ہی اور لوگ بھی جمع تھے اور دو جوان بندوقیں صاف کر رہے تھے۔ وہاں بھی ہم تھوڑی ہی دیر ٹھہرے۔ پھر ایک ٹرک آیا جو سب کو پرانے قلعہ لے گیا جہاں مسلمانوں کے لیے کیمپ بنا دیا گیا تھا۔ وہاں دلی کے اطراف سے آئے ہوئے بہت سے لٹے پٹے خاندان جمع تھے۔ پرانے قلعہ کے ایک طرف ہمایوں کا مقبرہ تھا اور دوسری طرف مٹکے شاہ کی درگاہ۔ یہ دونوں جگہیں بھی کیمپ میں شامل ہو گئیں۔ مٹکے شاہ سے پناہ گزینوں کو بڑا فیض پہنچا۔ اس درگاہ کی روایت یہ تھی کہ جب کسی کی منت پوری ہوتی تھی تو وہ وہاں ایک مٹکہ چڑھا دیتا تھا۔ ہر طرف مٹکے تھے۔ دھات کے مٹکے۔ مٹی کے مٹکے اور ہر سائز کے یہ مٹکے لٹے پٹے پناہ گزینوں کے بہت کام آئے۔ آج بھی وہاں یہ درگاہ اپنے مٹکوں کے ساتھ موجود ہے۔ لاہور میں بھی ایک درگاہ گھوڑے شاہ کی ہے جہاں گھوڑے چڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن پتہ نہیں ان کی بھی کوئی افادیت ہو سکتی ہے یا نہیں۔

پرانے قلعہ میں سنا تھا کہ کیمپ میں کراچی سے جہازوں کے ذریعہ کھانا بھی آتا تھا۔ وہاں بھی کھانا پکتا تھا۔ ایک روز لیاقت علی خان بھی پرانے قلعہ میں آئے اور لوگوں سے ملے۔ قلعہ میں بھیڑ تھی۔ گندگی تھی افراتفری تھی۔ لیکن یہ سب تکلیفیں بے معنی لگتی تھیں اس لیے کہ قلعہ کی فصیل پر چڑھ کر دور دور تک دلی کے پورے شہر کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ راتوں کو لوگ دیکھتے کہ جگہ جگہ دھوئیں اٹھ رہے ہیں۔ آگ کے شعلے بھی نظر آتے تھے۔ لوگ اپنے اپنے علاقوں کو پہچان کر روتے اور ایک دوسرے کو بتاتے کہ فلاں جگہ آگ لگی ہے۔ فلاں محلہ جل رہا ہے۔ اسی اثناء میں خبر آئی کہ سونی پت پر زبردست حملہ ہوا ہے۔ والدین اور چھوٹے بھائی اور سب عزیز وہیں موجود تھے۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی کہ حملہ پسپا کر دیا گیا ہے۔ یہ حملہ ۱۵ ستمبر کی صبح کو ہوا تھا جسے سید حسن علی زیدی عنقا نے مکمل تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''روداد، فرقہ

وارانہ فسادات۔ سونی پت، ۱۹۴۷ء'' میں شائع کیا ہے۔

حملہ سے کچھ روز پہلے پنڈت جواہر لال نہرو بھی سونی پت آئے تھے اور ان کے حکم پر وہاں فوج بھجوا دی گئی تھی۔ اس کے بعد سونی پت کو ایک کیمپ بنا دیا گیا۔ یہاں کوٹ پر سب مسلمان اکٹھے ہو گئے۔ نیچے کے محلوں کے مسلمانوں کے علاوہ قریب و نزدیک کے دیہاتوں کے مسلمان بھی یہاں پناہ گزین ہوئے۔ ان دیہاتوں پر پہلے ہی حملے ہو چکے تھے اور بہت خون خرابا ہوا تھا۔ جب حملہ آور پسپا ہو کر لوٹ گئے اور فوج نے کوٹ کو اپنی حفاظت میں لے لیا تو قدرے سکون ہوا اور میرے والد دلی آ کر ہمیں واپس سونی پت لے گئے۔ یہاں سے چھ اکتوبر کو ہم ایک فوجی کانوائے کے ذریعہ جو بلوچ رجمنٹ سے متعلق تھا پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ کوئی دس بارہ ٹرکوں کا قافلہ تھا جس میں بہت تھوڑے لوگ ہی سفر کر سکتے تھے۔ فوجیوں نے سب کے سامان کی مفصل تلاشی لی۔ میری والدہ نے چند کپڑے کچھ چادریں وغیرہ اور باورچی خانہ کا سامان دست پناہ۔ سنسی 'توا' برتن وغیرہ دو صندوقوں میں بھرے ہوئے تھے۔ ان صندوقوں میں کوئی قیمتی سامان نہیں تھا۔ گھر کا عام سامان جو دلی سے ایک اونٹ گاڑی کے ذریعہ سونی پت لایا گیا تھا اس میں ایک صوفہ سیٹ، کرسیاں، میزیں اور ایک گھومنے والی کتابوں کی الماری وغیرہ ہم نے سونی پت میں ہی اک ہندو کے ہاتھ مناسب قیمت پر فروخت کر دیے تھے۔ ہمارے سامان میں ایسی بے ہنگم چیزیں دیکھ کر لوگ ہنسے بھی کہ یہ کیا سوغات پاکستان لے کر جا رہے ہیں۔ بہر حال جس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہی وہ لے کر جاتا ہے۔ یوں ہم سونی پت سے ملے جلے جذبات کے ساتھ رخصت ہوئے۔ میرے نانا ہمارے ساتھ آنے کے لیے قطعی تیار نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بزرگوں کی ہڈیوں کو اور اپنی مسجدوں اور امام باڑوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ ان سب کو اور اپنے گھر کو چھوڑنے کا دکھ بھی تھا اور پاکستان جانے کی خوشی بھی ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ یہ ہجرت عارضی ہے اور ہم جلد ہی کامیاب و کامران اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔

سونی پت سے لاہور تک کا سفر ہم نے تقریباً چار روز میں طے کیا راستے میں بہت سے مشکل مقامات بھی آئے لیکن مجھے کبھی کسی خطرے یا پریشانی کا احساس نہیں ہوا باقی لوگوں نے بھی بہت زیادہ تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ غالباً وہ اتنے دکھ دیکھ چکے تھے اور اتنے خطروں سے گزر چکے تھے کہ اب انھیں کسی بات کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ البتہ دو تین منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ راستے میں ہم نے پانی پت، کرنال اور انبالہ میں مسلمانوں کے کیمپ دیکھے اور کچھ قافلوں کو ریڑھوں بیل گاڑیوں میں سوار اور پیدل سفر کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ دوسری طرف پاکستان سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے قافلے بھی دیکھے۔ یہ لوگ بھی بہت پریشان اور سراسیمہ تھے۔ ان کے چہروں پر وحشت تھی جو بہت خطرناک لگتی تھی۔ راستے میں سڑکوں پر لاشیں بھی دیکھیں جلے ہوئے گاؤں بھی دیکھے۔ بہت سے تازہ تازہ بنے ہوئے قبرستان بھی دیکھے۔ جالندھر شہر سے گزرتے ہوئے ہندوستانی سپاہیوں سے ہمارے کانوائے والوں کا کچھ جھگڑا ہو گیا۔ دونوں طرف سے بندوقیں سٹین گنیں اور مشین گنیں تان لی گئیں۔ لیکن پھر کچھ سینئر ہندوستانی فوجی افسر آئے اور انھوں نے معاملہ رفع دفعہ کرا دیا۔ امرتسر سے کچھ پہلے ہم ایک ویران اجڑے ہوئے گاؤں میں رات گزارنے کے لیے ٹھہرے پانی پینے کے لیے ایک کنوئیں پر گئے تو دیکھا کہ اس میں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ دریائے بیاس میں غالباً طغیانی آئی ہوئی تھی۔ ہم نے کافی راستہ پانی اور دلدل میں طے کیا۔ دور دور تک زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے کہ اسی لق و دق ویرانے میں ہم نے ایک سکھ سنت کو دیکھا جس نے گہرے زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تین شاخہ نیزہ تھا اور کمر میں بڑی سی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس ماحول اور ذہنی کیفیت میں یہ آدمی بہت ہی ہولناک لگا۔ ۹ نومبر کی صبح ہم واہگہ کی سرحد پر پہنچے۔ پاکستانی پرچم کو دیکھتے ہی سب نے خوشی سے نعرے لگائے اور کچھ لوگ سجدے میں گر پڑے۔ وہاں سے ہم سرحد کے قریب ہی باولی کیمپ پہنچے۔ یہاں نوجوان والنٹیئرز (رضا کار) نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ لڑکے

اور لڑکیاں زیادہ تر طالب علم تھے۔ کچھ ڈاکٹر اور سماجی کارکن بھی وہاں موجود تھے۔ یہاں ہمیں پہلے کھانا کھلایا گیا اور پھر شہر روانہ کر دیا گیا۔ کچھ گاڑیوں میں بیٹھ کر ہم ایم اے او کالج پہنچے جو اس وقت مہاجرین کا کیمپ بنا ہوا تھا۔ اسی کالج کے پیچھے کرشن نگر کی آبادی تھی جہاں میرے والد کچھ عزیزوں کے ساتھ پہلے ہی سے مقیم تھے۔ ہم بھی ان کے پاس چلے گئے اور آج تک یہی ہمارا گھر ہے الاٹمنٹوں کے چکر چلے تو ہم بھی ان کے شکار ہونے سے نہ بچ سکے اور ہمارے ہی ایک عزیز جنھیں ہم نے اپنے گھر میں جگہ دی تھی انھوں نے چپکے ہی چپکے سارا گھر اپنے نام الاٹ کرا لیا ہمیں اس بات کا اس وقت پتہ چلا جب انھوں نے ہمیں کرائے کا نوٹس بھیجا۔ اس کے بعد مقدمہ بازی شروع ہوئی اور آخر گھر کا دو تہائی حصہ ہمارے پاس رہ گیا۔

لاہور میں پرانی انار کلی کے قریب جہاں آج کل سی پی او ''سنٹرل پولیس آفس'' کا دفتر ہے وہاں اس زمانے میں ایک بہت بڑا سا بھدا سا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر ''محکمہ پھر سے بساؤ'' لکھا ہوا تھا۔ یہاں روزانہ ان لوگوں کے ناموں کی فہرستیں لگتی تھیں جو بذریعہ ریل پاکستان آ رہے تھے اور راستے میں مارے گئے تھے ہم روزانہ بڑے سہمے ہوئے دل سے ان فہرستوں کو دیکھنے جاتے کیوں کہ ہندوستان سے مسلسل مہاجرین کی سپیشل گاڑیاں آ رہی تھیں جن پر راستہ میں برابر حملے ہوتے رہتے تھے۔ ہمارے بہت سے عزیز ابھی نہیں آئے تھے۔ بڑی ہی تشویش کا دور تھا اور یہ سلسلہ کافی پہلے سے چل رہا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے ۹ اگست کو میں اپنے ماموں خالہ اور ان کے گھر والوں کو خدا حافظ کہنے کے لیے نئی دلی آیا تھا۔ یہ سرکاری ملازمین کی سپیشل ٹرین تھی جو براستہ کھوکھرا پار کراچی جا رہی تھی۔ اگلے ہی روز خبر ملی کہ بھٹنڈے کے قریب اس کو بم سے اڑانے کی کوشش کی گئی۔ کچھ لوگ زخمی ہوئے اور ایک عورت ہلاک بھی ہوئی ماموں کو رخصت کرنے کے بعد میں دلی میں ہی گھومتا رہا۔ موری گیٹ چاولی گنج اور کشمیری گیٹ کے علاقوں میں ہمارے گھر تھے۔ میں سب جگہ گیا۔ لیکن سب گھر ویران پڑے تھے۔ ابھی ان میں دوسرے لوگ آ کر آباد نہیں ہوئے تھے۔ پورے شہر پر ایک ویرانی کا سا عالم

تھا۔ پہلی مرتبہ دلی میں اتنے سکھ گھومتے ہوئے نظر آئے۔ ان میں سے کئی نے بڑی بڑی ننگی تلواریں اٹھائی ہوئی تھیں۔ یہ ایک عجیب سا منظر تھا۔

دلی میں ہمارا گھر کشمیری دروازے کے اوپر تھا۔ کشمیری دروازے کی فصیل گھر کے برابر سے گزرتی تھی۔ یہ گھر جو ڈاکخانہ کے اوپر تھا بہت ہی خوبصورت مقام پر واقع تھا ہم اس میں کوئی آٹھ دس برس رہے۔ گھر کے پیچھے بہت وسیع باغات تھے۔ ٹیلر گارڈن میں ہاکی اور فٹ بال کے میچ ہوتے تھے۔ قریب ہی نکلسن باغ تھا جس میں پھلوں کے درخت تھے اور لوگ وہاں سیر و تفریح کے لیے آتے تھے۔ اس باغ میں ''کیت'' کے درخت تھے ''کیت'' کرکٹ کی بال جیسا ایک پھل تھا جو اسی بال کی طرح سخت ہوتا تھا۔ اس کے اندر گودا بہت ہی کھٹے مزے کا ہوتا تھا۔ لیکن جب بہار کے دنوں میں یہ اچھی طرح پک جاتا تو اس کا مزہ بھی میٹھا ہو جاتا تھا۔ لڑکوں کی ٹولیاں باغ میں کیت توڑ توڑ کر کھاتی تھیں۔ مالی ان کے پیچھے دوڑتا رہتا۔ ان کو زور زور سے کیت بھی مارتا رہتا۔ چوٹیں کھاتے مگر لڑکے باز نہ آتے۔ کبھی کبھی کوئی لڑکا مالی کے ہاتھ آجاتا تو وہ اس کا ہاتھ پلنگ کے پائے کے نیچے رکھ کر خود پائے پر بیٹھ جاتا۔ غریب شکار بہت بلبلاتا اور چیختا چلاتا۔ لیکن مالی کبھی بھی اسے سزا دیے بغیر نہ چھوڑتے۔ اس کے باوجود لڑکوں نے پھل توڑنا نہ چھوڑا اس باغ کے سامنے تھوڑے سے فاصلہ پر قدسیہ گارڈن تھا جہاں اکثر ٹینس کے میچ ہوتے رہتے تھے۔ یہاں سے کچھ دور تیمار پور تھا۔ جسے جیت گڑھ بھی کہتے تھے یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ دلی کا مشہور سینٹ سٹیفنز کالج یہیں تھا۔ اب وہاں دلی یونیورسٹی اور کئی دوسرے کالجوں کے کیمپس بن گئے ہیں۔ قدسیہ باغ سے جیت گڑھ جاتے ہوئے راستہ میں دلی کا مشہور اندر پرستھ گرلز کالج پڑتا تھا۔ اس طرح ہمارے گھر کا پچھلا حصہ بہت خوبصورت اور پر فضا تھا۔ کشمیری دروازہ دو دروازوں پر مشتمل ہے۔ ان دروازوں میں آنے اور جانے کے لیے علیحدہ سڑکیں تھیں اور اطراف میں دو چھوٹے چھوٹے دروازے پیدل چلنے والوں کے لیے تھے۔

ہمارے گھر کے سامنے کی طرف کشمیری گیٹ کا پر رونق بازار تھا۔ یہاں اسلحہ قالینوں اور دواؤں کی دکانیں تھیں۔ کچھ انگریزوں اور جرمنوں کی دکانیں بھی تھیں۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باغ تھا جو سنگھاڑا باغ کہلاتا تھا۔ یہاں اکثر احراریوں کے جلسے ہوتے تھے اور ہم گھر بیٹھے بڑے بڑے نامور مقرروں کے خطیبانہ جوہروں سے لطف اندوز ہوتے۔ باغ کے مشرق میں ایک بڑا سا گرجا تھا۔ مغرب میں ہندو کالج۔ جنوب میں بورڈ آف ایجوکیشن کا دفتر اور شمال میں کشمیری دروازہ تھا۔ غرض بہت پر رونق اور صاف ستھری جگہ تھی۔ ایک واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں شاید پانچویں چھٹی جماعت میں تھا کہ ایک روز جو بسنت کا دن تھا۔ سڑک پر غیر معمولی چہل پہل تھی۔ ہندو کالج کی طرف سے لڑکیوں کا ایک جھرمٹ ہنسی مذاق کرتا ہوا آیا۔ انھوں نے بسنتی رنگ کے شلوار قمیض اور ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں چند قدم پیچھے لڑکوں کا ایک گروہ ان پر آوازیں کستا ہوا آیا۔ میں اپنے برآمدے سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جب لڑکیاں بالکل ہمارے گھر کے نیچے پہنچیں تو ایک دم سے رک گئیں۔ مڑ کر انھوں نے لڑکوں کی طرف رخ کیا اور ان میں سے ایک لڑکی نے لڑکوں کو مخاطب کر کے کہا ''لو۔ اچھی طرح دیکھ لو'' یہ سنتے ہی وہ سب ایک دم بھاگ گئے وہ تو ہندو بھی تھے اور مسلمانوں سے زیادہ آزاد منش بھی تھے لیکن شاید پاکستان میں آج اس قسم کے شرمیلے لڑکے ملنے ممکن نہ ہوں۔

گھر کے بالکل سامنے رٹز سینما تھا جہاں انگریزی فلمیں لگتی تھیں۔ لیکن تقسیم سے چند برس پہلے وہاں اردو فلمیں لگنے لگی تھیں۔ غالباً سب سے پہلی ہندوستانی فلم جو وہاں لگی وہ کے سی ڈے کی دیوداس تھی۔ یہ سینما اب بھی وہیں ہے لیکن اب اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ دلی کے اکثر سینماؤں کا ایسا ہی حال ہے۔ البتہ کشمیری گیٹ کی سڑکیں اب بند کر دی گئی ہیں اور اس کے برابر سے فصیل توڑ کر سیدھی سڑک نکالی گئی ہے جو دلی کے بڑے کئی منزلہ بس سٹینڈ تک جاتی ہے جو قریب ہی ہے اور پھر وہاں سے آگے سڑکیں نکلتی ہیں۔ اس سینما سے مجھے بہت فائدہ تھا۔ وہ زمانہ سخت پردے کا زمانہ تھا اور لڑکیوں کو، جو میری خالائیں، پھوپھیاں اور ممانیاں وغیرہ

تھیں۔فلم دیکھنی ہوتی تو وہ ہم سے ملنے کا بہانہ کرکے ہمارے گھر آ جاتیں۔آتے ہی فلم کی فرمائش ہوتی۔میں ان سے رازداری کی فیس بھی لیتا۔فلم بھی دیکھتا اور وہاں بیٹھ کر پھل وغیرہ بھی کھاتا۔اس طرح میں نے بہت سی فلمیں دیکھ ڈالیں اور یوں مجھے فلموں کا شوق بھی ہوگیا۔سب سے نچلی کلاس کا کرایہ چار آنے تھا۔میرے دو آنے لگتے تھے۔پھر ہاف ٹائم میں ''واپسی'' بھی دو آنے میں بک جاتی تھی۔یوں میں مفت میں آدھی فلم دیکھ لیتا۔پھر میرے ایک ماموں نے وہاں پھلوں کی دکان کا ٹھیکہ بھی لے لیا اور یوں فلمیں دیکھنے اور کھانے پینے کی اور بھی آسانی ہوگئی۔

رٹز سینما کے پیچھے کچہری تھی۔اس سے آگے کافی نیچے اتر کر جمنا کا کنارہ آ جاتا تھا۔ یہاں کچھ مندر تھے اور سادھوؤں کی کٹیائیں تھیں۔عزیز اور کچھ دوست بچے ہمارے گھر آتے اور سب ایک ساتھ جمنا میں نہانے چلے جاتے۔وہاں عورتوں کے نہانے کے گھاٹ بھی تھے۔کنارے سے دو چار فٹ کے فاصلہ پر بانس گڑے ہوتے تھے۔عورتیں ان بانسوں کو پکڑ کر کپڑوں سمیت ہی دریا میں دو تین غوطے لگا کر اشنان کرتیں۔ہم ظاہر ہے بچے تھے اس لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔نہانے اور شرارتیں کرنے کے علاوہ دریا میں ہمیں دو اور دلچسپیاں بھی تھیں۔ایک تو یہ کہ کچھ فاصلہ پر ایک جزیرہ سا تھا جس پر بڑے بڑے تربوز اُگتے تھے۔ہم تیرتے ہوئے وہاں جاتے اور ایک بڑا سا تربوز لے کر اسے پیٹ کے نیچے رکھ کر تیرتے ہوئے واپس آ جاتے۔وہاں سے تربوز لاتے ہوئے ہمیں کبھی کسی نے نہیں پکڑا۔دوسری دلچسپی یہ تھی کہ ہم اوپر سے چھلانگ مار کے دریا میں گہرا غوطہ لگاتے اور تہہ کی مٹی میں زور سے ہاتھ مارتے تو ہمارے ہاتھ میں کبھی پیسہ اور کبھی دونی چونی بھی آ جاتی جو ہندو کثرت سے جمنا میّا (ماں) کی بھینٹ کرتے تھے۔جمنا کے پل کے قریب، جو فن تعمیر کا بڑا خوبصورت نمونہ تھا اور لال قلعہ کی دیوار سے ملا ہوا تھا۔زیادہ سکے ملتے تھے۔ایک دفعہ جو میں غوطہ لگا کر نکلا تو میرے ہاتھ میں مردے کی کھوپڑی تھی۔اتنا ڈر لگا کہ پھر کبھی پل کے نزدیک نہیں گئے۔

اس زمانے میں خواتین کے لیے تفریح کے مواقع بہت محدود تھے۔البتہ سال میں کم از کم دو سیریں ضرور باقاعدگی سے ہوتی تھیں۔ایک تو تاریخی ''پھولوں والوں کی سیر'' کے موقع پر تانگوں میں سوار ہو کر سب قطب مینار جاتے تھے۔یہ راستہ بھی بہت خوبصورت اور رومانوی تھا (پھولوں والوں کی سیر کا میلہ دلی میں اب بھی لگتا ہے دورِ مغلیہ میں یہ شاہی اہتمام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔اب دلی میں یہ سرکاری طور پر منایا جاتا ہے)۔

ہم لال قلعہ سے ہوتے ہوئے جامع مسجد کے ساتھ ساتھ دریا گنج پہنچتے تھے۔پرانے شہر سے نکلتے ہی نئی دلی میں داخل ہوتے تو ایک طرف انڈیا گیٹ اور دوسری طرف فیروز شاہ کوٹلہ کا وسیع میدان ہوتا۔پھر خونی دروازہ آتا جس پر اس وقت بھی لوگوں کو خون کے دھبے نظر آتے تھے۔یہاں ۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بعد مغل شہزادوں کو قتل کیا گیا تھا۔پھر مٹکے شاہ کا مزار آتا اور اس کے ساتھ ہی پرانا قلعہ جس کی تاریخ کورو پانڈو کی جنگ سے لے کر ۱۹۴۷ء کے مہاجروں کے کیمپ تک پھیلی ہوئی ہے۔اس سے آگے ایک بڑی سی باولی تھی۔(باولی اس کو کنوئیں کو کہتے ہیں جس میں نیچے تک سیڑھیاں جاتی ہوں۔واہ فیکٹری کے علاقہ میں آج بھی ایک باولی ہے) یہاں غوطہ باز اپنے کرتب دکھاتے تھے۔وہ ایک اونچی سی عمارت سے چھلانگ لگاتے۔نیچے سے کوئی ایک چونی پانی میں پھینکتا یہ غوطہ خور اس چونی کو وہاں سے نکالتے۔یہی ان کا انعام تھا۔پھر قطب مینار پر بڑی رونق ہوتی۔ہم مسجد قوت اسلام کے چقماق کے سیاہ پتھروں کے برآمدے میں ڈیرہ ڈال دیتے اور کچھ لوگ مہرولی کے گاؤں سے جا کر تندوری پراٹھے اور آم لے کر آتے۔یہاں ایک عجیب منظر ہوتا۔سیاحوں کے ہجوم کی وجہ سے بڑے بڑے کڑھاؤں میں آٹا گوندھا جاتا جسے دو آدمی ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیروں سے گوندھتے پھر بھی ہم یہ پراٹھے کھا لیتے تھے۔ہمیں بتایا گیا کہ اس جگہ سے ہمارا بھی کوئی پرانا تعلق تھا ہمارے جد امجد۔نصر اللہ ادیب۔جب ہرات سے التمش کی دعوت پر رضیہ سلطانہ کے اتالیق مقرر ہو کر آئے تو یہیں بختیار کاکی کے مزار کے پاس ہی ٹھہرے

تھے۔ وہی قطب الدین بختیار کاکی جن کے نام پر اس مسجد کا یہ عظیم مینار قطب مینار کہلاتا ہے۔

دوسری تفریح عورتوں کے لیے پردہ باغ کا میلہ تھا۔ یہ جامع مسجد کے سامنے ایک باغ تھا جہاں بدھ کے روز میلا لگتا تھا۔ دلی میں بدھ کا دن خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ بدھ کو سینماؤں میں عورتیں کے لیے خاص شو بھی ہوتے تھے۔ عورتیں اور بچے اس میلے میں تانگوں میں لدھ کر جاتے جو چاروں طرف پردوں سے منڈھے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ہمارے نانا نے ایک پرانی موٹر خریدی۔ شاید ۱۹۲۰ء کی چھوٹی سی آسٹن یا کوئی اور گاڑی تھی۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ دو مرد پانچ عورتیں اور کوئی درجن بھر بچے ٹھس کے بیٹھ گئے۔ نانا کے حکم سے گاڑی کی کھڑکیوں پر چاروں طرف چادریں منڈھ دی گئیں۔ جو پردہ باغ پہنچتے پہنچتے جالیاں بن گئیں اس لیے کہ عورتوں نے باہر کی سیر کرنے کے لیے بال پنوں (Hair Pins) سے جگہ جگہ ان میں سوراخ کر دیے تھے۔ پھر ایک روز جو اسی گاڑی میں سیر کو نکلے تو اب بھی اتنے ہی لوگ تھے۔ شہر سے ایک دو میل باہر گاڑی کے ایک پہیہ میں پنکچر ہو گیا۔ فالتو پہیہ تھا نہیں ڈرائیور نے نہایت ہوشیاری دکھاتے ہوئے ٹائر کو پتوں سے بھر دیا اور اس طرح گاڑی چل پڑی۔ مگر کچھ دور چل کر انجن میں کوئی خرابی ہو گئی۔ شام آ پڑی۔ ڈرائیور کسی مستری کو بلانے چلا گیا۔ ہم میں سے کسی کو گاڑی کی بتیاں بھی جلانی نہیں آتی تھیں بہت ڈر لگا۔ آخر ڈرائیور ایک تانگہ میں واپس آیا اسی تانگہ میں بیٹھ کر ہم واپس گھر آ گئے۔ ڈرائیور گاڑی ٹھیک کراتا رہا۔

دلی کے جو منظر ابھی تک آنکھوں میں پھرتے ہیں ان میں چاندنی چوک اور جامع مسجد کے علاقے بہت پر رونق تھے۔ عید بقرعید کے موقعوں پر جامع مسجد پر بڑی رونق ہوتی تھی لوگوں کا زبردست ہجوم ہوتا تھا اور چوک میں کٹورا بجتا تھا۔ سقے چار پانچ کٹورے ایک ساتھ ہاتھ میں لے کر بجاتے اور لوگوں کو پانی پلاتے جو ان کو ایک دو پیسے دے دیتے تھے جامع مسجد کے سامنے ایک بہت بڑا پارک تھا جو اردو پارک کہلاتا تھا۔ اس کے دوسری طرف لال قلعہ کی پرشکوہ عمارت تھی۔ اس پارک میں مسلم لیگ کے جلسے ہوتے تھے۔ کچھ جلسوں میں میں بھی اپنے

بزرگوں کے ساتھ گیا۔ ایک روز جو شاید کوئی سیاسی نوعیت کا دن تھا اور ۴۷ء کے شروع کا زمانہ تھا میں شیروانی اور جناح کیپ جس پر چاند تارہ لگا ہوا تھا۔ پہن کر سائیکل پر جامع مسجد گیا۔ وہاں پارک میں سے میں نے دیکھا کہ ایک طرف سے ایک ٹرک میں سوار ننگی تلواریں لیے ہوئے سکھ نعرے لگاتے ہوئے دریبہ کے بازار کی طرف سے آئے۔ جامع مسجد کے قریب پہنچ کر مسلمانوں سے ان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ میں ڈر کے وہاں سے بھاگا اور قلعہ والی سڑک پر آ گیا میرے سڑک پر پہنچتے ہی سائرن بجنے شروع ہو گئے اور شہر میں کرفیو لگ گیا قلعہ سے کشمیری دروازے تک کی سڑک چوں کہ شہر سے باہر تھی اس لیے اس پر کرفیو نہیں لگتا تھا اور میں صحیح سلامت لیکن تیزی سے گھر پہنچ گیا اور میں نے سنا کہ اس لڑائی میں کئی لوگ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔

چاندنی چوک البتہ دیوالی اور دسہرے پر بڑی خوبصورتی سے سجایا جاتا تھا۔ ہم بھی تانگوں میں بیٹھ کر دیوالی اور رام لیلا دیکھنے جایا کرتے تھے۔ تانگوں کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ گھوڑوں کے منہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خواتین کے منہ سے قریب ہوتے اور عورتوں کی ڈر سے چیخنے کی آوازیں آتیں۔ ان دنوں میں بڑی بڑی خوبصورت قندیلیں عام بکتی تھیں اور کھانڈ اور شکر کے بتاشوں کی طرح بنے ہوئے جانور اور کھلونے ملتے تھے۔ بڑا لطف آتا تھا۔ گھنٹہ گھر پر میرے ایک دوست کے والد کی بڑی سی حلوہ سوہن کی دکان تھی۔ اب وہاں نہ گھنٹہ گھر ہے، نہ فوارہ، نہ ٹرام کاریں چلتی ہیں۔ البتہ سائیکل رکشا عام ہیں۔

دلی کی ایک اور دلچسپ یاد بھی اب ذہن میں آتی ہے۔ ایک بوڑھا اندھا شخص تھا یہ تو پتہ نہیں کہ وہ فقیر تھا یا ویسے ہی شوقیہ نعتیں پڑھتا تھا۔ میں نے کبھی اسے مانگتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ کسی گھر کی دہلیز پر بیٹھ جاتا اور بڑی سریلی اور اونچی آواز میں گاتا رہتا۔ اس کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے۔

موسیٰ نبی سے کہہ دو گدھے اپنے تھام لے

بھیڑیں تمام حضرتِ عیسیٰ کی چر گئے

پھر آزادی کے فوراً بعد میں نے اس شخص کو کرشن نگر میں ہمارے گھر کے قریب ایک مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے یہی شعر پڑھتے سنا۔اس کے بعد وہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔

ہم زیادہ تر دلی میں ہی رہتے تھے۔کبھی کبھی والدہ سونی پت چلی جاتیں تو مجھے دلی میں ہی رہنا پڑتا۔دلی میں رہنے میں دو قباحتیں تھیں۔ایک تو والد کا خوف جن کے سامنے کبھی بھی آزادی سے کھیلنا بلکہ بیٹھنا بھی ممکن نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ زبردستی پڑھنا پڑتا تھا۔چنانچہ ایک روز جب وہ دفتر گئے ہوئے تھے تو جس دکان سے ہمارا سودا سلف آتا تھا میں وہاں گیا اور دکان دار سے کہا۔بھائی ناصر۔ابا کہہ گئے تھے کہ مجھے دو آنے دے دینا وہاں سے میں نے دو آنے لیے۔یہ دلی سے سونی پت کا ریل کا آدھے ٹکٹ کا کرایہ تھا۔میں نے دلی میں دو بانس بھی بنوائے ہوئے تھے جن کے درمیان میں پیر رکھنے کی کلیاں لگی ہوئی تھیں۔انگریزی میں انھیں stilts کہتے ہیں۔ان پر چڑھ کر قد بہت بڑا ہو جاتا ہے اور ان پر چلنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔میں یہ بانس بھی اپنے ساتھ سونی پت لے گیا۔وہاں میں بانسوں پر آگے آگے ہوتا تھا اور پیچھے پیچھے لڑکوں کا ایک ہجوم ساری بستی کے لوگ تنگ تھے۔چنانچہ ایک روز ایک صاحب نے غصہ میں آکر وہ بانس چھین لیے لیکن بچوں کی مدد سے ہم انھیں چپکے سے ان کے گھر سے اٹھالائے۔

شرارتوں میں کتنا لطف آتا تھا۔گرمیوں کی ایک تپتی دوپہر جب ہر طرف سناٹا ہوتا تھا کچھ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ایک سنسان سی گلی میں جا نکلے۔وہاں ایک سوکھا سا کیکر کا چھوٹا سا درخت تھا۔کسی نے کہا اس پر جن رہتے ہیں۔میں جنوں سے ملنے کے شوق میں اس پر چڑھ گیا۔ابھی آخری شاخ تک پہنچا ہی تھا کہ نیچے سے کسی نے چیخ ماردی اور میں ایک دم سے زمین پر آرہا۔سب اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوئے اور اس ہنگامے میں میری ایک بالکل نئی جوتی گم ہوگئی۔

جب میں غالباً چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھا تو میرے دوست مجھے سونی پت کے مقامی مڈل سکول میں اپنے ساتھ لے گئے۔ماسٹر مہدی وہاں ہیڈ ماسٹر تھے۔وہ انگریزی پڑھاتے تھے۔انھوں نے مجھ سے کچھ سوال پوچھے۔ایک تو انگریزی ویسے ہی کم آتی تھی دوسرے ان کا خوف بھی تھا۔جواب صحیح نہ بن پڑے۔ماسٹر مہدی نے اپنے شاگردوں کی طرف بڑے فخر سے دیکھا اور شہروں کے گرتے ہوئے تعلیمی معیار پر ایک بہت ہی عبرت آمیز تقریر کی۔۷۷ء میں پورے تیس برس کے بعد جب میں سونی پت گیا تو وہاں ابھی کچھ نہیں بدلا تھا۔صرف ایک انحطاط اور ویرانی کا سا عالم تھا۔ایک ایک گھر اور ایک ایک گلی میں جانی پہچانی آوازوں کی گونج سنائی دی اور انیسؔ کا شعر یاد آیا۔

یہ بے سبب نہیں سونے گھروں کے سناٹے
مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

لیکن جب میں ۹۶ء میں دوبارہ سونی پت گیا تو ہر چیز بدل چکی تھی، کہیں کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔جھیرے (گہری ڈھلانیں) تک آباد ہو گئے تھے۔گھاٹیوں پر اتنے مکان بن گئے تھے کہ اب اونچی چڑھائی کا احساس تک نہیں ہوتا تھا نالیوں تک پر عمارتیں بن گئی تھیں اور بڑی بڑی حویلیاں چھوٹے چھوٹے گھروں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔جی بہت مکدر رہا اسی طرح دلی بھی بہت بدنما اور پرشور ہوگئی تھی۔لیکن خود ہمارے ہاں لاہور اور کراچی وغیرہ کی حالت بھی کچھ کم خراب نہیں ہوئی ہے۔بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے اور زمین کس طرح آباد ہو کر اجڑتی اور اجڑ کر آباد ہوتی رہتی ہے۔

دلی میں سکول کی عمارت بند پڑی تھی۔کبھی اس کی بڑی شان ہوتی تھی۔یہ سکول موری گیٹ کے اندر واقع تھا اور غالباً مغلوں کے زمانے میں شاہی اصطبل کے طور پر کام دیتا تھا۔اس میں گہرے تہہ خانے تھے جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہاں سے لال قلعہ تک سرنگیں جاتی تھیں لیکن اب تہہ خانوں میں صدیوں کا پانی جمع تھا اور کسی کی ان کے اندر جانے کی ہمت نہیں

ہوتی تھی۔انگریزوں نے یہاں سینٹ سٹیفنز سکول قائم کیا تھا۔جب میں نے پانچویں جماعت میں یہاں داخلہ لیا تو اس وقت تک یہ سینٹ سٹیفنز ہائی سکول ہی تھا۔اس میں کتابوں کی ایک دکان بھی تھی اور اس کی اپنی سٹیشنری بھی تھی جہاں اسکول کے مونوگرام کے ساتھ کتابیں، نقشے، کاپیاں، پنسلیں اور دیگر چیزیں رعایتی نرخوں پر ملتی تھیں۔پھر مشنری انتظامیہ نے یہ سکول مقامی مسلمانوں کی انجمن کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اس کا نام مسلم ہائی سکول موری گیٹ ہوگیا اس انجمن کے دو سکول پہلے ہی اجمیری دروازے اور دریا گنج میں کھلے ہوئے تھے۔ایک لڑکوں کا کالج تھا جو پہلے دلی کالج کے نام سے قائم ہوا تھا۔ایک لڑکیوں کا کالج اور دیگر کچھ تعلیمی ادارے بھی تھے۔افسوس ہے کہ مسلم ہائی سکول بنتے ہی اس کا نہ وہ انتظام رہا اور نہ وہ ڈسپلن اور سٹیشنری کی دکان بھی بند ہوگئی۔

....

(۲)

۴۷ء کا ہندوستان اور پاکستان

ابھی ہم دسویں جماعت میں تھے کہ ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہوگیا۔ہمارے کچھ اساتذہ نے ہمیں الوداعی دعوتیں دیں۔ایک سائنس ماسٹر سردار علی صاحب تھے جو بعد میں لاہور کے ایچی سن کالج میں استاد ہوگئے تھے۔انھوں نے دیگر باتوں کے علاوہ ہم سے یہ کہا کہ ہماری انتہا ایٹم بم ہے، یہ تمھاری ابتدا ہے تم یہاں سے شروع کر رہے ہو۔پاکستان میں جا کر اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا۔کیا جذبہ تھا اس وقت! پھر اردو کے استاد محمد عمر صاحب تھے ۔یہ سخت کانگریسی اور پاکستان کے بننے سے بہت ناخوش تھے۔انھوں نے دو باتیں کہیں۔ایک تو یہ کہ انھوں نے کہا کہ میں بچپن سے یہ سنتا آ رہا ہوں کہ مسلمان قعر مذلت میں اتنا گر چکے ہیں کہ اب ان کے مزید گرنے کے امکان نہیں۔لیکن انھوں نے زور دے کر کہا کہ میں پچھلے پچاس برس سے یہی سنتا آ رہا ہوں اور مسلمان پستیوں میں گرتے جا رہے ہیں۔انھوں نے ہم سے کہا کہ آپ برسوں یہی سنتے رہیں گے کہ اب مسلمان اس سے زیادہ نہیں گر سکتے۔لیکن وہ گرتے چلے جائیں گے اور ان کے گرنے کی کوئی حد نہیں۔لیکن آپ مایوس نہ ہونا۔یہ یوں ہی گرتے رہیں گے۔اس وقت ہمیں محسوس ہوا کہ انھیں پاکستان کے بننے پر کتنا غصہ اور کتنا دکھ تھا۔پھر انھوں نے وہاں موجود شیعہ لڑکوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تم بھی وہاں جا کر امامستان بنا لینا۔اس لیے کہ مسلمانوں کو یک جہتی اور اتفاق سے رہنا بالکل پسند نہیں ہے۔ان کو پاکستان کے بننے پر کس قدر غصہ تھا وہ اس زہر میں بھرے ہوئے طنز سے واضح ہے۔

لاہور ہمیشہ سے ایک خوبصورت خواب کی طرح سر میں سمایا ہوا تھا۔دلی میں لاہور کے کئی لوگوں سے میل ملاقات تھی۔میں انھیں ہمیشہ رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور لاہور دیکھنے کی دل میں بڑی تڑپ تھی۔ہمارے خاندان سے لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے یا دلی کے سینٹ سٹیفنز

کالج میں جاتے تھے یا علی گڑھ۔مگر مجھے لاہور جانے کا بڑا شوق تھا۔چنانچہ ملٹری کانوائے سے آتے ہوئے راستے بھر میں لاہور کے خواب دیکھتا رہا۔لاہور کا پہلا ہی تاثر خاصہ رومانوی تھا۔ایک تو باولی کیمپ میں جو اپنایت اور تحفظ کا احساس ہوا وہ ہندوستان کے فسادات کے مناظر سے گزرنے کے بعد بالکل خوابوں خیالوں کا سا منظر لگتا تھا۔پھر کیمپ میں بڑی عزت افزائی ہوئی بڑی خاطر مدارت ہوئی۔لیکن سب سے بڑی بات تھی ان نوجوانوں کی سرگرمیاں جو بڑی تندہی سے پناہ گزینوں کی آؤ بھگت میں لگے ہوئے تھے۔کالجوں کے چست و چالاک طلبہ اور طالبات بڑی مستعدی اور خندہ پیشانی سے اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے نظر آتے تھے۔شاید مسلمان دوشیزاؤں کو اس طرح مردوں کے درمیان کام کرتے ہوئے دیکھنے کا یہ ہمارا پہلا ہی موقع تھا لگتا تھا کہ دنگا فساد کی دنیا سے ہم خلوص اور محبت کی دنیا میں آ گئے ہیں۔خدا جانے کیا کیا عزائم تھے اور کیا کیا خواب دیکھے تھے پاکستان کے لیے۔

پھر ایم اے او کالج ہوتے ہوئے اپنے نئے اور موجودہ گھر میں پہنچ گئے۔یہاں اور بھی عزیز و اقارب پہلے سے موجود تھے۔کرشن نگر کے اکثر مکان بند تھے ایک دو ہندو بھی ابھی یہاں تھے،تمام گھر ساز و سامان سے بھرے ہوئے تھے لیکن ہم چوں کہ اس گھر میں آئے تھے جہاں ہم سے پہلے لوگ پہنچ چکے تھے اس لیے ہمیں اس مکان میں سے صرف ایک بڑی سے بیضوی ڈائننگ ٹیبل ایک صوفہ سیٹ جو قدرے پرانا تھا۔ایک کپڑوں کی الماری اور چند میزیں اور کرسیاں ملیں۔جب کہ ہم سے پہلے آنے والوں کے پاس کپڑوں اور برتنوں سے بھری ہوئی الماریاں بھی تھیں۔یہ بھی دیکھا کہ لوگ ایک گھر میں داخل ہوئے وہاں سے سامان اکٹھا کیا اور دوسرے گھر میں چلے گئے اور اسی طرح دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے،ہمیں شاید یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ اپنے پاس بھی بہت سے کپڑے اور بہت سا سامان ہونا چاہیے۔

لاہور دیکھنے کی خواہش البتہ تھی۔چنانچہ ایک کزن کے ساتھ گھر سے نکلے شہر کا شہر اجڑا ہوا تھا۔شاہ عالمی کی عمارتوں سے ابھی دھوئیں اٹھ رہے تھے،کافی توڑ پھوڑ کا منظر تھا اور

ایک عجیب سی ویرانی تھی۔لیکن اس ویرانی میں بھی یہ شہر کتنا پیارا لگ رہا تھا۔یہاں آ کر بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن جذبہ تھا،امنگ تھی،امید تھی جو تمام مصیبتوں کو ہنسی خوشی سہہ گئے۔پورے گھر کو نئے سرے سے بسانا تھا۔اماں کے ایک دو زیور اس وقت کچھ کام آئے۔اسی دوران ہیڈن روڈ کی ایک بیکری Vegas میں کام کرنا شروع کیا۔کیک پیسٹری بنانے سیکھے۔کچھ ٹیوشنیں کیں۔میٹرک کا امتحان دلی میں ہی دے دیا تھا۔نتیجہ پاکستان پہنچنے کے بعد آیا۔ابا کے ایک ہندو دوست نے سرٹیفکیٹ بھی بھجوا دیا۔ہم ۶ نومبر ۴۷ء کو سونی پت سے چل کر ۹ نومبر کو لاہور پہنچے تھے اور اب مارچ کا مہینہ جا رہا تھا۔ایم اے او کالج باقاعدہ کھل گیا تھا،میرے ایک پرانے ہم جماعت وہاں داخل بھی ہو گئے تھے۔انھوں نے مجھے بھی داخلہ لینے کا مشورہ دیا۔میں نے کہا کہ بھائی اپنے پاس تو پیسے نہیں۔وہ بولے بس پچیس ہی روپے کر لو۔اس زمانے میں یہ بھی بڑی رقم تھی لیکن کسی طرح حاصل کر لی اور داخلہ لے لیا۔اس زمانے میں لاہور میں ایم اے او کالج کا ہونا کسی بڑی نعمت سے کم نہیں تھا۔نہ وہ فیس مانگتے تھے نہ میرٹ کی پروا کرتے تھے۔جو آیا اسے داخل کر لیا اور جس نے جو دے دیا لے لیا۔اگر ایم اے او کالج نہ ہوتا تو بہت سے لوگ جنھوں نے آگے چل کر بڑا نام پایا اور زندگی میں ترقیاں کیں کبھی تعلیم حاصل نہ کر سکتے اور کچھ نہ کر پاتے۔عالم یہ تھا کہ جب میں نے بی ایس سی میں داخلہ لیا تو صرف داخلہ فیس کے ۵ روپے ہی دیے۔

ایم اے او کالج میں وظیفے بھی آتے تھے اور طلبہ کے لیے امدادی سامان بھی کبھی سویٹر ملے کبھی کپڑے اور ایک مرتبہ سب طالب علموں کو ایک ایک گرم سوٹ کا کپڑا بھی دیا گیا لیکن میرا امدادی سوٹ مجھے راس نہ آیا بلکہ اس کے ساتھ ہی اور بھی چیزیں چلی گئیں۔میں لاہور سے ملتان جا رہا تھا۔کوئٹہ پسنجر رات کو لاہور سے چل کر صبح ملتان پہنچتی تھی۔اس میں آرام سے سوتے چلے جاتے تھے۔ابھی ریل گاڑیوں میں اتنی بھیڑ نہیں ہوتی تھی۔سوتے میں کسی نے میرا اٹیچی کیس چرا لیا۔میرے اپنے کپڑے تو گئے۔میرے چچا کا ایک اوورکوٹ بھی ان کے

ساتھ گیا جوان کے ایک اور بھتیجے نے بڑے خلوص سے بھیجا تھا۔ یوں یہ امدادی سوٹ بہت مہنگا پڑا۔ جب بھی کوئی امداد آتی تو کالج کی انتظامیہ کے لیے مسئلہ ہو جاتا کیوں کہ کالج میں سب ہی پناہ گزین تھے (جو ابھی مہاجر نہیں کہلاتے تھے) اور امداد اتنی نہیں ہوتی تھی کہ سب کو دی جائے۔ ایسے ہی ایک موقع پر پرنسپل دلاور حسین نے طلبہ کو ہال میں جمع کیا اور بڑی پرسوز تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ یہاں سب غریب ہیں۔ یہ کہہ کے وہ پیچھے کی طرف مڑ گئے اور کوٹ کا پچھلا دامن اٹھا کر سب لڑکوں کو دکھایا اور کہا کہ میں بھی غریب ہوں دیکھو میری پتلون پر پیوند لگے ہوئے ہیں، ہم میں کوئی ایسا نہیں کہ چابی گھمائے اور تجوری میں سے پیسے نکال لے۔ ہم سب ضرورت مند ہیں۔ لیکن جو امداد آئی ہے وہ بہت تھوڑی ہے۔ اس لیے یہ امداد وہی لے جو اس کے بغیر گزارہ نہ کر سکے۔ اچھے دن تھے۔ لوگ اچھی باتیں مانتے تھے۔ خود بھی سوچتے تھے۔ ایثار اور محبت کے جذبات مضبوط تھے، ابھی لوٹ کھسوٹ شروع نہیں ہوئی تھی، اس کی ابتدا تو ایوب خان کے دور سے ہوئی جب متروکہ جائیدادوں کی لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی اور جب عوام کی مشکلات کو نظر انداز کر کے خواص کو نوازا گیا۔ ایم اے او کالج کے قوم پر بڑے احسانات ہیں اور آج بھی یہ بہت غریب اور غریب پرور کالج ہے اسی لیے ہر سیاسی جماعت اس پر قبضہ کرنا چاہتی ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لاہور کے کالج اور یونیورسٹیاں سیاسی جماعتوں کے قبضہ میں ہیں۔ لیکن گورنمنٹ کالج میں کسی سیاسی جماعت کا گذر نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہاں حکمرانوں کے بچے پڑھتے ہیں جنھیں خود بھی حکمران بننا ہے۔ لگتا ہے کہ پاکستان میں حکومتوں کی تعلیمی پالیسی ہی یہ رہی ہے کہ صرف ایک مخصوص طبقہ تعلیم حاصل کرے اور باقی سب کو اس نعمت سے محروم رکھا جائے۔ طلبہ انجمنوں سے بہتر کوئی اس طرح جہالت پھیلانے کا کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں دو تعلیمی نظام ایک ساتھ چل رہے ہیں، ایک عوام کے لیے اور ایک خواص کے لیے اور عوام میں سے کوئی سر پھرا اگر تعلیم حاصل کرنا چاہے تو تعلیمی اداروں کو ہی کسی قابل نہ چھوڑا جائے۔ روز ہڑتالیں اور ہنگامے، دو سال کا کورس چار

سال میں مکمل نہیں ہوتا۔ چار کا چھ میں پورا نہیں ہوتا۔ ایم اے او کالج خصوصاً مسلسل رسہ کشی کا شکار رہتا تھا۔ لیکن آج ایم او کالج بالکل بدل گیا ہے خصوصاً پرنسپل مسعود الحسن بخاری نے بڑی محنت اور جذبہ سے اس کالج کو لاہور کے صفِ اول کے کالجوں میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یہاں اب ایف اے، ایف ایس سی، بی اے، بی ایس سی کے علاوہ بی کام کی کلاسیں بھی ہیں۔ کم از کم سات مضامین میں ایم اے بھی کرایا جاتا ہے اب طلبہ کی تعداد ۱۰ ہزار ہے جس میں سے تین ہزار لڑکیاں ہیں۔ اساتذہ میں بھی خواتین خاصی تعداد میں ہیں۔ بخاری صاحب نے بڑی کاوش کے بعد یہاں کی عمارات میں بھی خوبصورت توسیع کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر عبدالسلام اور فیض احمد فیض کا کالج ہے اور اسے ان کے شایانِ شان ہونا چاہیے۔

نقلِ وطن، فسادات اور تنگیٔ حالات کی وجہ سے میرے والد ٹی بی کا شکار ہو گئے اور مانسہرہ کے قریب دادر سینی ٹوریم میں داخل ہو گئے۔ اب گھر کی ذمہ داری مجھ پر آ پڑی۔ اے جی آفس میں درخواست دی۔ نزہت حسین وہاں اے اے جی تھے انھوں نے خصوصی رعایت کر کے یہ نوکری دلوا دی اس لیے کہ میری عمر ابھی پورے سولہ برس بھی نہیں تھی اور نوکری کے لیے کم سے کم عمر اٹھارہ برس تھی۔ لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ لوگ ہمدرد تھے۔ خدمت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۹۶/- روپے ماہوار پر میں جونیئر کلرک بھرتی ہو گیا اور کیش سٹیفکیٹ کے سیکشن میں لگا دیا گیا۔ وہاں جا کے اندازہ ہوا کہ سرکاری دفتروں میں کوئی خاص کام نہیں ہوتا اور اب تو بالکل بھی نہیں ہوتا۔ وہاں جو کیش واؤچر آتے تھے انھیں رجسٹر پر اتارنا ہوتا تھا۔ ایک دن میں تین سو واؤچر درج کرنا کام تھا۔ یہ تمام کام زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں کئی کئی روز دفتر نہیں جاتا تھا اور ایک دن جا کر سارا کام پورا کر دیتا تھا۔ یوں نوکری بھی چلتی رہی اور پڑھائی بھی۔ جب ایف ایس سی کے امتحان قریب آئے تو میں نے نوکری چھوڑ دی۔ یہ اس لیے بھی کہ اب لوگوں کا اصرار ہونے لگا کہ میں اسی دفتر میں مستقل ہو جاؤں اور سینٹرا کاؤنٹنٹ کا امتحان دے دوں۔ یہ مجھے منظور نہ تھا۔ لیکن بے روزگاری کب تک ساتھ دیتی

ایف ایس سی کرنے کے بعد میں پھر اسی دفتر میں ملازم ہوگیا لیکن اس مرتبہ بطور سینئر کلرک۔ لیکن مسلسل وہاں سے جان چھڑانے کی فکر میں رہتا۔ خوش قسمتی سے ٹیلیفون آپریٹروں کی آسامیاں نکلیں تو میں نے بھی درخواست دے دی۔ انٹرویو میں ڈائریکٹر نے بتایا کہ وہ میرے والد کو جانتے ہیں۔ نوکری مل گئی اور میں ٹرنک ایکسچینج میں ٹیلیفون آپریٹر ہوگیا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔

ٹیلیفون آپریٹری بہت دلچسپ کام ثابت ہوا۔ ابھی لاہور میں ٹیلیفون بہت کم تھے اور صرف بڑے بڑے لوگوں کے پاس ہوتے تھے۔ میں خاص طور پر ٹرنک ایکسچینج میں ہونے کی وجہ سے لوگوں کے بہت کام آسکتا تھا۔ اس لیے گورنروں اور منسٹروں تک سے خاصی واقفیت ہوگئی تھی اور اسی طرح بڑے لوگوں کے سیکنڈلز کا بھی علم ہوگیا تھا اور کچھ کے تو ہم راز دار بھی بن گئے تھے۔ لیکن ''حساب دوستاں دردل''۔ البتہ ایک واقعہ بہت دلچسپ تھا۔ میڈم نور جہاں لتا منگیشکر سے ٹیلیفون پر بات کیا کرتی تھیں۔ ایک روز انھوں نے بمبئی کی کال بک کرائی تو مجھے وہ آواز بہت ہی اچھی اور معصوم سی لگی اور میں نے یہ کہہ بھی دیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ نور جہاں ہیں اور جب معلوم ہوا تو میں نے جسارت کر کے کہا کہ میں آپ کی بات کرادوں گا مگر پہلے مجھے ''آج کی رات سازِ دل پر درد نہ چھیڑ'' سنائیں۔ تھوڑے سے تکلف کے بعد انھوں نے اس کی دو لائنیں سنائیں۔ پھر ایک اور دن انھوں نے کال بک کرائی۔ بمبئی کی لائن مل ہی نہیں رہی تھی۔ انھیں بہت غصہ آیا اور مجھے اچھی خاصی ڈانٹ بھی پڑ گئی۔ ان ہی دنوں ایک روز بڑی ہلچل سی مچی۔ یکا یک امرتسر فیروز پور اور دلی سے رابطہ منقطع ہوگیا اور بڑی تشویش ہوئی اور کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ راولپنڈی میں لیاقت علی خان کو گولی مار دی گئی۔ میں اس وقت کراچی کی کالیں لگا رہا تھا۔

ٹیلیفون ایکسچینج میں میں مستقل رات کی ڈیوٹی کیا کرتا تھا اور دن میں کالج جاتا تھا۔ اسی مقصد کے لیے یہ نوکری بھی کی تھی گو کہ یہاں تنخواہ اے جی آفس کے سینئر کلرک کی تنخواہ

سے کم تھی۔ ایکسچینج میں رات کے وقت گیارہ بجے سے صبح سات بجے تک تین آپریٹر ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک تو بس یوں ہی گھومنے پھرنے آتے تھے اس لیے کہ کسی فلم میں ایسٹیٹ کا کام کررہے تھے اور زیادہ وقت سٹوڈیو میں ہی گزارتے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے کام کی تقسیم یوں کی ہوئی تھی کہ ایک رات گیارہ سے تین بجے تک کام کرتا تھا اور دوسرا تین سے صبح سات بجے تک، کام کچھ زیادہ نہیں تھا اور رات بھر کچھ اچھے اچھے لوگوں سے باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں بمبئی، دلی اور امرتسر میں رات کی ڈیوٹی خواتین کرتی تھیں۔ ہم کراچی کے دوستوں کو بھی لائن پر لے لیتے اور گپ شپ اور لطیفہ بازی ہوتی رہتی اسی دوران بڑے بڑے لوگوں سے بڑی بڑی عجیب ملاقاتیں بھی رہیں میں ایک مرتبہ کراچی گیا تو وہاں کے آپریٹر نے مجھ سے کہا کہ چلیں آپ کو ایک وزیر سے ملاتے ہیں۔ یہ بنگالی وزیر تھے جن کا نام بواس تھا۔ ان کا اسلامی نام اب مجھے یاد نہیں ہمارے دوست نے انھیں ٹیلیفون کیا تو فوراً ہی انھوں نے ہمیں بلا لیا کوٹھی پر لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔ لیکن ہمیں ان کے بیڈ روم میں لے جایا گیا۔ وہاں وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ بڑی شفقت سے ملے اور مجھ سے کہا کہ آپ تو B.SC ہیں، میں صدر صاحب سے کہہ کر آپ کو بہت اچھی نوکری دلوادوں گا لیکن سوائے باتیں بنانے کے انھوں نے کچھ نہیں کہا۔

ٹیلیفون آپریٹر کی اہمیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ نواب گورمانی پنجاب کے گورنر تھے۔ صدر صاحب ڈھاکے میں تھے اور گورنر صاحب ان سے فوری رابطہ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ان سے پہلے صدر سے اور کسی کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے کہا کہ ڈھاکہ کی لائن ملتے ہی سب سے پہلے میں آپ کو کال ملوادوں گا وہ بظاہر بہت پریشان تھے اور بار بار فون کررہے تھے پھر انھوں نے کہا کہ وہ نماز پڑھنے لگے ہیں اگر کال مل جائے تو لمبی گھنٹی دے دینا۔ بہر حال میں نے ان کی کال لگادی۔ انھوں نے شکریہ کے ساتھ مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی۔ لیکن بسواس صاحب کے تجربہ کے بعد میں

نے ملاقات ضروری نہیں سمجھی البتہ اختر حسین صاحب سے ملاقات اچھی رہی۔ ایک تو انھوں نے میرے سامنے اپنے صاحب زادہ کو بہت ڈانٹ پلائی کہ دیکھو یہ نوکری بھی کرتے ہیں اور پڑھتے بھی ہیں اور آپ تمام سہولتوں کے باوجود پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے۔ وقت بڑے مزے سے گزرتا تھا۔ دن میں کالج جاتے تھے۔ اسی ملازمت کے دوران میں نے بی ایس سی کرلیا۔ یہاں خصوصاً سائنس کی تعلیم کا حال بہت برا تھا۔ کالج سے لے کر یونیورسٹی تک ایک ہی صورت حال تھی۔ تقریباً سب پروفیسر نوٹس لکھاتے تھے جو انھوں نے برسوں پہلے کہیں سے حاصل کیے تھے۔ البتہ دو پروفیسروں نے میری شخصیت پر مستقل اثرات چھوڑے: کیمسٹری کے ایک پروفیسر کرار بیگ صاحب تھے جو آرگینک کیمسٹری ایسے پڑھاتے تھے جیسے شاعری دوسرے پروفیسر نیاز قریشی تھے انھوں نے انگریزی ادب ایسا پڑھایا کہ پھر کچھ اور پڑھنے کو جی ہی نہیں چاہا باقی پروفیسر صاحبان زیادہ تر فرض ہی پورا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک پروفیسر صاحب نوٹس لکھوا رہے تھے ایک طالب علم کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ جو Equation آپ لکھوا رہے ہیں اس میں ربط نہیں ہے۔ انھوں نے ڈانٹ کے کہا۔ ''بہہ جا، تے لکھیں جا'' بے چارہ بیٹھ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ پھر کھڑا ہو گیا۔ ''سر یہ تو بالکل ہی بے ربط ہے'' ابھی پروفیسر صاحب اسے ڈانٹنے والے ہی تھے کہ ان کی نظر اپنی کاپی کے ایک صفحہ پر پڑی جو اڑ کر دور جا پڑا تھا۔ فوراً ہی وہ چلائے۔ ''پھڑیں۔ اوئے پھڑیں۔ اوہ صفحہ اڑ گیا'' یہ تو کالج کی صورت حال تھی۔ یونیورسٹی میں کیفیت اس سے بھی زیادہ مایوس کن تھی۔ ایک بہت سینئر پروفیسر بھی نوٹس ہی لکھاتے تھے ہم کہا کرتے تھے کہ اگر پروفیسر صاحب کی فائل غائب کر دی جائے تو وہ پیشہ بدل لیں۔ تاہم سائنس چھوڑ کر۔ ایم ایس سی کو خیر باد کہہ کر ادب کی طرف آنے کی اور بھی وجوہات تھیں۔ اس کی پہلی وجہ پروفیسر نیاز محمد قریشی تھے جو انگریزی ادب اس والہانہ انداز سے پڑھاتے تھے کہ ہمیں بھی اس کا چسکا لگ گیا۔ یوں تو پروفیسر کرار بیگ بھی تھے جو آرگینک کیمسٹری شاعری کی طرح پڑھاتے تھے اور بس سائنس کی وہی شاخ تھی جس سے ہمیں اس

مضمون کی کچھ سدھ بدھ ہوئی۔ لیکن وہ آرگینک کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھاتے تھے۔ وہ اس زمانے میں لاہور کالج فار ویمن میں بھی پڑھاتے تھے اور اکثر کہتے تھے کہ لڑکیوں کو ہم سے زیادہ کیمسٹری آتی ہے۔ ہم نے اصرار کیا تو انھوں نے ایک روز بتایا کہ کیمسٹری یاد کرنے کا ان کا انداز بہت ہی دلچسپ ہے۔ مثلاً وہ Oxalic Acid (Cooh) اور (Chooh) Acetic Acid کو آگزیلک اور ایسیٹک ایسڈ نہیں کہتیں بلکہ ککو اور چو کہتی ہیں۔ M.Sc. میں داخلہ تو لے لیا تھا مگر اس میں کچھ مزہ نہیں آیا۔ سب طلباء صرف نوٹس لیتے تھے۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا۔ امتحان میں Thermodynamics کی ایک اکویژن آ گئی۔ یہ ہم نے خوب اچھی طرح رٹی ہوئی تھی۔ لیکن جب سارا سوال کرلیا تو اندازہ ہوا کہ جواب دوسری اکویژن کا آرہا ہے۔ وہ بھی رٹی ہوئی تھی۔ بہت زور مارا لیکن بالکل پتہ نہ لگا کہ کس جگہ سے پٹڑی بدل گئی اور ہم دوسری اکویژن پر چلے گئے۔

ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ ہم پر کالج کے واجبات ۳۳۰/- روپے ہو گئے جو ہماری تقریباً چار مہینہ کی تنخواہ کے برابر تھے اور جن کا ادا کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ پھر ایک اور وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ ہم پانچ طلباء کی ایک ٹولی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہماری تیاری اتنی نہیں ہے کہ فرسٹ ڈویژن آسکے اور سیکنڈ ڈویژن بالکل بے کار تھی۔ اس سے تو سکول ماسٹری بھی مشکل سے ملتی تھی۔ اس لیے طے کیا گیا کہ امتحان آئندہ سال تک ملتوی کر دیا جائے۔

انگریزی کی طرف آنے کا قصہ بھی بہت دلچسپ اور نہایت حادثاتی ہے۔ ہم نے کبھی اس طرف آنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ انگریزی سے ڈر ہی بہت لگتا تھا، پھر ایک نوجوان تھے جن سے اکثر مال پر ملاقات ہو جاتی تھی، یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ شام کو مال روڈ پر چہل قدمی کرنا ہر پڑھے لکھے نوجوان کا شیوہ تھا اور مال روڈ تھی بھی واقعی سیر کی جگہ۔ اصلی ٹھنڈی سڑک دونوں طرف کیاریاں تھیں جن میں خوبصورت مہکتے ہوئے پھول کھلتے تھے۔ چوراہوں کے درمیان بھی خوبصورت باغیچے بنے ہوئے تھے اور ٹریفک تقریباً نہ ہونے کے برابر

تھی۔ ہمارے ایک پروفیسر دوست نے شادی نہیں کی۔ دوست اس بات پر اکثر انھیں چھیڑا کرتے۔ وہ ہمیشہ کہتے کہ ایک تو یہ مال روڈ بھی شادی نہیں ہونے دیتی۔ سڑکوں اور کیاریوں سے بھی زیادہ یہ شخصیتیں تھیں جو مال روڈ کو مال روڈ بناتی تھیں۔ ایک روز سردیوں کی آدھی رات تھی کہ ایک صاحب بڑا سا اوورکوٹ پہنے کہیں سے نمودار ہوئے اور پاک ٹی ہاؤس کے سامنے چوراہے پر رکھی ہوئی ٹریفک کانسٹیبل کی چوکی پر چڑھ گئے۔ وہاں انھوں نے ایک زبردست تقریر کی اور ملک کی سیاسی صورتِ حال پر غم وغصہ کا اظہار کیا۔ جب تقریر شروع ہوئی تو سننے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے کوئی پانچ چھ لوگ جمع ہو گئے۔ صاحب ممبر نے سامعین پر ایک نظر ڈالی۔ اوورکوٹ کے کالر کو اوپر چڑھایا اور بڑی حسرت سے بولے۔ ''اب ہمارا کیا ہوگا'' اور چوکی سے اتر کر روانہ ہو گئے۔

البتہ ان شب نوردوں میں دو شخصیتیں خصوصی اہمیت کی حامل تھیں ان میں سے ایک ناصر کاظمی تھے جو بقول انتظار رات کی تاریکی کو تخلیقی عمل کی بنیاد قرار دیتے تھے اس لیے کہ کائنات نے بھی ایک وحشت ناک تاریکی Chaos سے جنم لیا تھا۔ دوسری شخصیت پروفیسر اسرار احمد کی تھی جو اسلامیہ کالج سول لائنز میں شعبۂ طبیعات میں استاد تھے لیکن ایک موسیقار بھی تھے اور انھوں نے لاہور میں کافی موسیقار پیدا کیے۔ ان کے گھر پر بھی موسیقی کا چرچہ رہتا تھا۔ فیض کی نظم ''ہم بھی دیکھیں گے'' سب سے پہلے ان کی بنائی ہوئی دھن میں اقبال بانو نے الحمرہ ہال میں گائی تھی۔ ٹیلی ویژن پر بھی انھوں نے بہت سے پروگرام کیے تھے۔ وہ رات کو ۹،۱۰ بجے گھر سے نکلتے۔ کبھی بیڈن روڈ کی ایک چھوٹی سی چائے کی دکان پر کچھ گانے سنتے۔ ان کا خیال تھا کہ گانوں کا اس سے بہتر ذخیرہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ کبھی قلعہ کی پشت پر سیڑھیوں پر گانے گاتے ہوئے لوگوں کو سنتے اور کبھی موہنی روڈ کی بھائی جی کی موسیقی کی محفلوں میں شریک ہوتے اکثر فجر کے وقت گھر لوٹتے۔ ایک صاحب روزانہ مال پر ٹہلتے ہوئے ملتے۔ وہ کئی سال سے ایم اے انگریزی کی تیاری کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بہت ہی مشکل مضمون ہے جب

ہم ایم اے کر چکے تو اس وقت بھی وہ ایم اے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک روز کہنے لگے کہ یہاں کے ممتحن میری بات نہیں سمجھتے۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ لندن یونیورسٹی سے امتحان دوں۔ ایسے حالات میں ایم اے انگریزی کرنے کے متعلق سوچنا بھی مشکل تھا۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ میں سائیکل پر گول باغ کی طرف جا رہا تھا کہ میرے ایک دوست راستے میں مل گئے۔ وہ بھی سائیکل پر تھے انھوں نے بتایا کہ اسلامیہ کالج میں ایم اے انگریزی کا داخلہ ٹیسٹ ہو رہا ہے۔ وہ ٹیسٹ دینے جا رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے بھی ٹیسٹ میں بیٹھنے کی دعوت دی اور میں ان کے ساتھ چل دیا۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ تو ٹیسٹ پاس نہ کر سکے لیکن میرا نام انٹرویو دینے والوں کی فہرست میں آ گیا۔ انٹرویو میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے کہا کہ مجھے انگریزی ادب کی تو کوئی سوجھ بوجھ نہیں ہے لیکن میری انگریزی چوں کہ دوسروں سے بہتر ہے اس لیے وہ مجھے داخلہ دینے کو تیار ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اسی روز داخلے بند کر دیں گے۔ غالباً وہ سفارشوں کے بوجھ سے بچنا چاہتے تھے جب میں نے انھیں بتایا کہ سر دست میرے پاس فیس دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں تو انھوں نے کہا کہ صرف ۲۵ روپے لے آؤ تو میں داخل کر لوں گا۔ مختصر یہ کہ کسی نہ کسی طرح ۲۵ روپے جمع کر کے اسی روز داخلہ لے لیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب زبردست انسان تھے۔ وہ ایک Perfectionist تھے اور کافی بڑی عمر میں پہنچ کر انھوں نے کیمبرج سے M. Litt کی ڈگری لی تھی۔ ان کے دور میں اسلامیہ کالج بڑے عروج پر تھا۔ کم از کم دو درجن کے قریب مختلف قسم کی انجمنیں کالج میں سرگرم عمل تھیں اور وہ سب کی سرپرستی کرتے تھے۔ میں نے بھی ایک ادبی گروپ ''حلقہ ادب'' کے نام سے شروع کیا تھا اس میں بھی وہ باقاعدہ آتے تھے۔ اس حلقہ میں طلباء کے علاوہ جو اساتذہ شریک ہوئے ان میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے علاوہ پروفیسر ایرک سپرئن، پروفیسر کمالی، پروفیسر یوسف جمال انصاری اور پروفیسر سجاد باقر رضوی بہت دلچسپی لیتے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خان بہت ہی جرأت مند اور بڑی

خوبیوں کے مالک انسان تھے۔ ان کی کچھ عادتیں اب لوگوں کو عجیب لگیں گی۔ مثلاً ان کی اصول پسندی۔ میں ان کے ٹیوٹوریل گروپ میں شامل تھا۔ دو طالب علم اور بھی تھے۔ اس وقت وہ کالج کے پرنسپل بن چکے تھے اور پرنسپل کے دفتر میں ہی ٹیوٹوریل کی کلاس لیتے تھے۔ ایک روز صرف میں اکیلا ہی ان کی کلاس میں حاضر تھا۔ وہ دفتر کے کام میں مصروف تھے۔ جیسے ہی کلاس کا وقت ہوا انھوں نے چپڑاسی کو ہدایت کی کہ دروازہ بند کردے اور کسی کو نہ آنے دے۔ پھر وہ اٹھ کر اپنے ریٹائرنگ روم میں گئے اور وہاں سے گاؤن پہن کر آئے۔ پھر انھوں نے رجسٹر کھولا۔ میری حاضری لگائی اور اس کے بعد میرا مضمون چیک کرنے لگے وہ ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ پر بحث کرتے تھے۔

ایک مرتبہ پروفیسر صاحب نے کلاس میں بتایا کہ جب انھوں نے اسلامیہ کالج میں ایم اے انگریزی کی کلاس شروع کی تو اس میں لڑکیوں کو بھی داخل کیا اسلامیہ کالج میں لڑکیوں کا داخل کرنا بڑی ہمت کی بات تھی۔ (آج بھی وہاں ایم اے ہے مگر لڑکیاں نہیں ہیں جب کہ لاہور کے کوئی آدھی درجن تعلیمی اداروں میں .M.A ایم اے کی مخلوط تعلیم رائج تھی) ممبران انجمن جو بڑے ہی روایت پرست لوگ تھے اس خبر سے چونک اٹھے۔ یہ خبر بھی انھیں اس طرح ہوئی کہ سالانہ بجٹ اجلاس میں کالج نے ایک ''مائی'' کی آسامی مانگی۔ ممبران نے کہا کہ لڑکوں کے کالج میں مائی کا کیا کام۔ جب انھیں بتایا گیا کہ وہاں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں تو بڑا ہنگامہ ہوا۔ لوگ بہت برہم ہوئے اور اس پالیسی کے خلاف تقریریں ہوئیں۔ آخر میں پروفیسر صاحب کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اسی شہر میں عیسائیوں کے کالج میں لڑکیاں ایم اے میں داخل ہیں اگر ہم نے انھیں یہاں سے نکال دیا تو وہ اس کالج میں چلی جائیں گی۔ پھر انھوں نے معزز ممبران سے پوچھا کہ کیا وہ اس بات کو پسند کریں گے کہ ان کی مسلمان بیٹیاں عیسائیوں کے پاس چلی جائیں؟ یہ نسخہ بہت کامیاب ہوا اور مائی کی اسامی کی منظوری دے دی گئی۔

پروفیسر صاحب میں بلا کا اعتماد تھا۔ آج ہمارے تمام ادارے صرف اس وجہ سے تباہ ہوگئے کہ جب بھی جس بڑے مقام پر کوئی شخص پہنچ گیا تو اس کی کوشش یہی رہی کہ اس کے محکمہ میں کوئی اس سے زیادہ اہل شخص آنے نہ پائے۔ ہر شخص کم سے کم تر کی تلاش میں رہا اور اہلیت گناہ بن گئی یونیورسٹی کے ایک شعبہ کے پروفیسر نے جب ایک ریڈر کی پوسٹ کا مطالبہ کیا تو ایک سینئر پروفیسر نے اسے سمجھایا کہ کیوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہو۔ کل یہی ریڈر تمھارے مقابلہ پر آ کھڑا ہوگا۔ چنانچہ کئی شعبوں کی حالت یہ تھی کہ ایک پروفیسر اور اس کے بعد صرف جز وقتی استاد یا صرف لیکچرار ہوتے۔ پروفیسر حمید احمد خان اس سلسلے میں ایک عظیم مثال تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ایرک سپرئن طلباء اور ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہیں اس کے باوجود خطرات مول لے کر انھیں اسلامیہ کالج میں رکھا۔ اسلامیہ کالج میں ہندوستان کے کیمونسٹ پارٹی کے ایک اہم ممبر کو لانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

پروفیسر حمید احمد خاں کے زمانہ میں ڈرامے بھی سٹیج پر ہونے شروع ہوگئے۔ پہلے ڈرامہ کا سٹیج سیکرٹری میں تھا۔ اس میں گانے ڈانس سب تھے۔ صرف اتنا تھا کہ لڑکیوں کے رول بھی لڑکوں نے کیے تھے۔ پھر ہم نے کالج میں ایک فلم سوسائٹی بھی شروع کی۔ اس کا ہر اتوار کو ایک شو صبح کے وقت رتن سینما میں ہوتا تھا سینما والے ہم سے کوئی کرایہ نہیں لیتے تھے فلم کا کرایہ پچاس روپے تھا جس میں وہ ہمیں ہال کے ساتھ آپریٹر بھی مہیا کرتے تھے یہ عید محمد صاحب کی بڑی مہربانی تھی ہماری فلم سوسائٹی کا چندہ صرف چار آنے ماہانہ تھا تقریباً ۸۰۰ ممبر تھے۔ یعنی کم و بیش سب ہی طلباء۔ پروفیسر صاحبان اعزازی ممبر تھے۔ دروازہ پر ہمارے ہی والنٹر کھڑے ہوتے تھے۔ باکس پروفیسران اور ان کے اہل خانہ کے لیے مخصوص تھے۔ باقی ساری سیٹیں طلباء کے لیے تھیں اور ہال کو ہم اوپر سے بھرنا شروع کرتے تھے اس طرح پہلے آنے والوں کو اونچے درجے میں جگہ مل جاتی تھی۔ ہم نے پاکستان، ہندوستان اور دیگر ممالک کی بہترین فلمیں وہاں دکھائیں۔ فلم ہمیں صرف پچاس روپے میں ملتی تھی۔ جب تک میں زیر تعلیم رہا

سوسائٹی چلتی رہی۔غرض بہت خوب دن تھے۔رات کو نوکری،دن کو کالج اور شام کو محفلیں۔لیکن کبھی تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوا۔صرف ایک مرتبہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔شام کا ہلکا ہلکا سا دھندلکا تھا۔مجھے کچھ تھکاوٹ محسوس ہوئی اور میں نے سوچا کہ سرِشام ہی دفتر میں جا کر سویا جائے۔گھر میں اس وقت صرف میں اکیلا ہی تھا۔میں نے سائیکل اٹھائی۔لیکن پھر کچھ دیر سانس لینے کے لیے سائیکل کو دیوار سے لگا کر پاس پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔جب آنکھ کھلی تو تقریباً ویسا ہی دھندلکا تھا۔یہ مجھے اندازہ تھا کہ میں کافی دیر سویا تھا لیکن یہ پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ یہ دھندلکا شام کا ہے یا صبح کا میں گھر سے نکلا دکانیں بھی کچھ کھلی تھیں کچھ بند۔چراغ بھی جل رہے تھے۔وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہوا اور کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ یہ صبح ہے یا شام کہ کہیں وہ مجھے پاگل نہ سمجھے۔اسی تذبذب میں دفتر پہنچا۔معلوم ہوا کہ رات گذر چکی ہے۔میرے ساتھی نے دیکھتے ہی پوچھا ''کیا بات ہے نہ کل آئے نہ آج''؟

ایم اے کرنے کے بعد کیڈٹ کالج میں سینئر ماسٹر کی ملازمت مل گئی گھر کے ماحول میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوئی۔جو فوری طور پر بہت تکلیف دہ بھی تھی اس لیے کہ تقریباً ۱۰۰ روپے ماہانہ (بحیثیت ٹیلیفون آپریٹر) سے بڑھ کر تنخواہ ۴۷۰/- ماہانہ ہو گئی لیکن جن لوگوں کو سرکاری نوکریوں کا تجربہ ہے، انھیں معلوم ہے کہ سرکاری ملازم کو پہلی تنخواہ چھ ماہ سے پہلے نہیں ملتی۔چنانچہ روزگار کی فراہمی بیروزگاری سے بھی زیادہ سخت گذرتی ہے۔بہرحال گھر میں تو جوں توں گذارہ ہو گیا لیکن حسن ابدال میں ہم آرام سے تھے۔وہاں روٹی، کپڑا، مکان مفت تھے۔کیڈٹوں کے لیے وہاں سب سہولتیں موجود تھیں۔دھوبی، نائی، موچی اور درزی سب کیمپس پر ہی موجود تھے۔چھ مہینے تک یہ سب صرف آرڈر پر کام کرتے رہے۔پھر جب اکٹھی تنخواہ ملی تو سب کے واجبات ادا کر دیے گئے۔دوسری طرف یہ سہولت تھی کہ غیر شادی شدہ اساتذہ میں بوٹیوں پر جھگڑا شروع ہو گیا اور اس کے بعد سے انتظامیہ نے ان سے بھی کھانے کے پیسے لینے شروع کر دیے۔پھر بھی یہ ۴۷۰/- روپے ماہانہ بہت تھے جب کہ کالج کے لیکچرار کو

اس وقت صرف ۲۹۶/- روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور اس میں سے مکان کا کرایہ بھی نکالنا پڑتا تھا جب کہ حسن ابدال میں رہائش مفت تھی۔

حسن ابدال کئی لحاظ سے ایک منفرد درس گاہ تھی۔ویسے بھی پہاڑیوں کے درمیان چشموں سے آتی ہوئی ندی اور وہاں کا پورا ماحول نہایت ہی صاف شفاف اور خوبصورت تھا۔حسن ابدال کا کیمپس بھی بہت خوبصورت ہے۔یہ جرنیلی سڑک پر پشاور اور راولپنڈی کے درمیان واقع ہے۔اس کے بالکل سامنے ایبٹ آباد کے لیے سڑک نکلتی ہے۔یہ ایک قدیم تاریخی شہر ہے اس میں مغل باغات بھی ہیں اور سکھوں کا مقدس گوردوارہ پنجہ صاحب بھی ہے۔یہاں ایک بڑے سے پتھر پر گورونانک کے ہاتھ کا نشان نقش ہے اور اسی پتھر سے ایک چشمہ بھی نکلتا ہے جس کا پانی سکھوں کے عقیدہ کے مطابق مقدس ہے اور ساری دنیا سے آنے والے سینکڑوں سکھ زائرین تبرکاً یہاں سے پانی بھر بھر کے لے جاتے ہیں۔گوردوارہ کے برابر ایک اونچی سی پہاڑی ہے جس کی چوٹی پر پیر بابا کی درگاہ ہے۔روایت یہ ہے کہ پیر بابا یہاں سے براہ راست اوپر اٹھا لیے گئے تھے۔اس پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے جس میں غالباً چند مغل شہزادیاں دفن ہیں۔روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ پیر بابا اور گرونانک کے درمیان ایک روحانی مقابلہ ہو گیا۔پیر بابا نے ایک بڑی چٹان اٹھا کر ان پر ماری۔گورونانک نے اپنے ہاتھ سے اسے روک لیا اور اس ہاتھ کا نشان اب بھی موجود ہے۔پھر اس پتھر کے نیچے سے میٹھے پانی کا ایک چشمہ نکل آیا۔

حسن ابدال سے بالکل ملا ہوا ایک قدیم مغل باغ ہے اور اس سے ذرا آگے واہ فیکٹری ہے جہاں ایک خوبصورت مغل دور کی باؤلی ابھی تک اچھی حالت میں موجود ہے۔اس سے بالکل ملا ہوا ٹیکسلا کا قدیم شہر ہے جس کے پیچھے ٹیکسلا یونیورسٹی کے آثار سینکڑوں برس بعد آج بھی اس قدیم دور کی تہذیب اور علم و فن کے شاہد ہیں۔

حسن ابدال کا تدریسی ماحول بھی منفرد ہے۔یہاں داخلے میرٹ کی بنیاد پر ہوتے

ہیں اور اکثر طلباء کو وظائف بھی ملتے ہیں۔ یہاں نیم فوجی طرز کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن طالب علموں پر یہ پابندی نہیں ہے کہ وہ فوج میں ہی جائیں۔ فوجی ماحول کی وجہ سے یہاں علمی روایات کی نسبت عسکری روایات زیادہ مقبول ہیں۔ بری، بحری اور ہوائی افواج کے نمائندے یہاں کے سٹاف میں شامل ہیں جو بالترتیب کپتان لیفٹیننٹ کمانڈر اور سکوئڈرن لیڈر ہوتے ہیں۔ یہاں داخلہ مقابلہ کے امتحان کے ذریعہ ہوتا ہے اور بچوں کو آٹھویں جماعت میں داخل کیا جاتا ہے۔ لیکن آٹھویں سے میٹرک کا کورس پڑھانا شروع کر دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ لوگ دو سال کا کورس تین سال میں کرتے ہیں اور اس طرح مضامین پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہو جاتی ہے۔ یہاں کے طلباء بورڈ کے امتحانوں میں اعلیٰ پوزیشنیں حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ایف اے اور ایف ایس سی کی کلاسیں بھی ہیں۔ یہ کالج سیکشن کہلاتا ہے۔ یہاں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سکول سیکشن کی کسی کلاس میں طلباء کی تعداد ۱۵ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جب کہ کالج سیکشن میں یہ تعداد ۲۵ تک ہو جاتی ہے۔

اس کالج میں طالب علموں کو قوم کی قیادت کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انھیں زندگی کی اعلیٰ ترین اقدار کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً ریل میں سفر کرتے ہوئے انھیں سب سے اونچی کلاس میں سفر کرنا ہوتا ہے۔ سینما میں بھی سب سے اعلیٰ درجہ میں ہی بیٹھ سکتے ہیں، اسی طرح انھیں ملازموں کے رہائشی علاقہ میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان تمام احکام کی خلاف ورزی کرنے پر وہ سزا کے مستحق ہوتے ہیں اور انھیں جرمانے کیے جاتے ہیں۔ پھر کالج کی حدود سے باہر بلکہ سڑک تک جانے کے لیے بھی انھیں باقاعدہ اجازت نامہ لینا پڑتا ہے۔ گو اساتذہ پر ایسی کوئی پابندیاں نہیں ہوتی ہیں پھر بھی وہ ماحول کی اس گھٹن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پھر ایسے اداروں میں چاہے وہ پبلک سکول ہوں یا یونیورسٹی ملازم مکمل طور پر حاکم کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اس لیے کہ نہ یہاں ٹرانسفر ہو سکتا ہے نہ اس ماحول سے کسی طرح چھٹکارا ممکن ہوتا ہے اس لیے یہ ادارے سازشوں کا گڑھ بن جاتے ہیں۔ فضا بالکل درباری

ہوتی ہے اور ہر شخص بوس کے مصاحبوں میں شامل ہونا چاہتا ہے اور دوسروں کو اس سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ ایسے ماحول میں ذہنی سکون ممکن نہیں ہوتا پھر سکول اور کالج کو اکٹھا کرنے کا تجربہ بھی کچھ زیادہ صحت مند ثابت نہیں ہوا۔ اس سے سکول کے شعبہ کے لوگوں میں زبردست احساس کمتری اور احساس محرومی پیدا ہوتا ہے چنانچہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ایسے استاد جو کئی کئی برس سے وہاں پڑھا رہے تھے انھیں نظر انداز کر کے سلیکشن بورڈ کے ذریعہ کم عمر اور ناتجربہ کار لوگوں کو بطور سینئر ماسٹر مقرر کیا گیا جب کہ سینئر اساتذہ جونیئر ماسٹر ہی رہے۔ مجھے بھی ان سے بہت ہمدردی تھی اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کیا یہاں سہولتیں تو بہت ہیں لیکن ذہنی ترقی کے امکانات بہت کم ہیں۔ میری شروع سے ہی یونیورسٹی میں پڑھانے کی خواہش تھی۔ لیکن پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے انگریزی کی کلاسیں نہیں ہوتی تھیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کسی گورنمنٹ کالج میں نوکری تلاش کی جائے۔ ویسے بھی گھٹن کا احساس بڑھتا جا رہا تھا میرے ایک اور ہم جماعت جو یہاں میرے ساتھ ہی منتخب ہوئے تھے وہ بھی اس ماحول سے تنگ تھے چنانچہ ہم جب بہت تنگ ہوتے تو سڑک پر آ کر کھڑے ہو جاتے اور فوراً جس طرف کی بس ملتی بیٹھ جاتے۔ کبھی راولپنڈی، کبھی ایبٹ آباد اور کبھی اٹک پہنچتے اور فوراً ہی دوسری گاڑی میں واپس آ جاتے اور یوں وقت گزارتے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ سکول نے بھی جونیئر اور سینئر ماسٹروں کے عہدوں کو ختم کر کے ایک ہی کاڈر بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

جب میں پبلک سروس کمیشن میں انٹرویو کے لیے گیا تو چیرمین نے مجھ سے پوچھا کہ اتنی اچھی اور زیادہ تنخواہ کی ملازمت چھوڑ کر میں کم تنخواہ پر ایک عام کالج میں کیوں آنا چاہتا ہوں تو میں نے یہی کہا کہ یہ تدریسی کام صرف ایک مشنری سپرٹ سے کیا جاتا ہے اور صرف ان لوگوں کے لیے جو خود کو بچوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دیں۔ یہ یقیناً ایک اچھا جذبہ ہے لیکن میں خود اپنی ذہنی استعداد کو بڑھانا چاہتا ہوں اور یہ مدرسہ کی سطح کی پڑھائی میں ممکن نہیں ہے اور یوں میں نے حسن ابدال کو خیر باد کہا۔

تاہم حسن ابدال سے کچھ اور دلچسپ یادیں بھی وابستہ ہیں۔ ہمارے سٹاف پر یہاں نیازی صاحب ہوا کرتے تھے جو ناہید نیازی کے چچا تھے۔ جب ان کے ریٹائرمنٹ کے دن آئے تو ہم ان سے ملنے گئے۔ چائے وغیرہ کے دوران انھوں نے ایک ''عبرتناک'' کہانی سنائی ایک سپاہی فوج سے ریٹائر ہو کر گھر پہنچا تو گھر کے سب لوگوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ سب کی نگاہیں اس بڑے سے ٹین کے صندوق پر لگی ہوئی تھیں جو اس کی واحد پونجی تھی جسے وہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ ایک روز اس نے یہ صندوق کھولا اپنی وردی نکالی اور بڑے تکلف کے ساتھ اسے پہنا۔ پھر اس نے ٹوپی سر پر رکھی اور بڑے سپاہیانہ انداز میں سب کو سلوٹ مارا اور کہا ''بندے کی صفائی دیکھو'' نیازی صاحب نے کہا کہ ہم بھی اسی طرح گھر جائیں گے۔ اتنے برس یہاں نوکری پر گزرے کالج کی طرف سے کوٹھی ملی۔ وہ کوٹھی فرنشڈ تھی۔ اب جاتے ہوئے ہمارے پاس اپنی ایک چارپائی بھی نہیں۔ سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔ بس یہ ایک بڑا سوٹ کیس ہے جس میں کچھ کپڑے ہیں وہی ساتھ لے جائیں گے اور باقی بندے کی صفائی ہے۔ یہ کہانی عبرت ناک اس لیے ہے کہ اساتذہ ویسے ہی قناعت پسند ہوتے ہیں اور پھر سہل انگار بھی۔ جب رہنے کے لیے گھر موجود ہے اور باقی تمام آسائشیں بھی مہیا ہوں تو پھر بے کار کے دردسر اور فضول خرچ سے کیا فائدہ۔ چنانچہ کئی ایسے سرکاری افسران دیکھے کہ جب ریٹائر ہوئے تو کرایہ کا مکان ڈھونڈتے پھرے البتہ یہ ایک خوشگوار تجربہ ہوا کہ معاشرہ اساتذہ کو کوئی مقام دے یا نہ دے کم از کم پراپرٹی ڈیلرز کی نظروں میں وہ معتبر ہیں۔ کئی ڈیلروں نے یہ تسلی دی کہ پروفیسر صاحب کے لیے مکان ملنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ البتہ ایک مسئلہ رہا کہ ان کی ''حیثیت'' کا مکان ان کی استطاعت سے باہر ہی ہوتا تھا۔ بلکہ بہت باہر۔

۱۹۵۹ء کے ستمبر میں بطور لیکچرار میں گورنمنٹ ڈگری کالج اصغر مال روڈ راولپنڈی میں آ گیا۔ یہاں تین برس بہت مفید۔ بہت سرگرم عمل اور بہت دلچسپ گذرے، ابھی میری ملازمت کو صرف دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ مجھے بی اے کی ایک کلاس دے دی گئی، اس سے

میرے صدر شعبہ اس قدر ناراض ہوئے کہ آخر دم تک ان کی ناراضگی نہ گئی، لیکن گورنمنٹ کالج میں سازشوں کا اتنا زور نہیں تھا اور اس ناخوشگوار واقعہ سے کچھ زیادہ بدمزگی پیدا نہیں ہوئی۔

البتہ خوش قسمتی سے کالج میں مجھے بہت ہی اچھے رفقاء ملے۔ یہاں کا ماحول نہایت خوشگوار اور دوستانہ تھا سوائے پرنسپل کے جس سے سب تنگ تھے۔ خصوصاً پرنسپل صاحب کو لوگوں کی ACR خراب کرنے کا بڑا شوق تھا۔ کالج کھنڈر ہوا پڑا تھا مگر اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ آخر کچھ لوگوں نے ڈائریکٹر سے شکایت کی کہ یہ پرنسپل صاحب یہاں گذشتہ دس برس سے مسلط ہیں، اگر یہ بہت اچھے ہیں تو دوسروں کو بھی ان کی صلاحیتوں سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع ملنا چاہیے اور اگر یہ واقعی اتنے اچھے نہیں ہیں تو ہمیں ان سے نجات دلائی جائے۔ آخر نئے پرنسپل آ گئے یہ بہت جوشیلے اور محنتی آدمی تھے۔ ان کے آتے ہی کالج کی شکل بدل گئی۔ کھیل کے میدان میں، ادبی منظرنامہ پر، ڈرامہ اور دوسری سرگرمیوں میں کالج کا نام خوب چمکا۔ کالج کی عمارت کی طرف بھی توجہ دی گئی اور اس کی اچھی خاصی شکل نکل آئی۔ جب سابق پرنسپل صاحب سے ان خوشگوار تبدیلیوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتے یہ سارا پیسہ جو اب خرچ ہو رہا ہے میں نے ہی تو بچا بچا کے رکھا تھا۔

راولپنڈی ایک چھوٹا سا خوبصورت صاف ستھرا شہر تھا۔ اسلام آباد کی ابھی بنیاد ہی رکھی گئی تھی۔ شہر میں اتنی بھیڑ بھاڑ بھی نہیں تھی آبادی کم تھی اور تقریباً سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ صدر میں ''ووگی'' (Vogie) ریسٹورنٹ دانشوروں سے بھرا رہتا اور شہر میں مشاعروں کی فضا عام تھی، خصوصاً واہ فیکٹری کے سالانہ مشاعرہ کی تو تاریخی حیثیت تھی۔ اس وقت وہاں مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کا دور تھا۔ سید محمد جعفری، ضمیر جعفری، شوکت تھانوی وغیرہ اسی شہر میں تھے۔ ایک اکبرآباد کے بزرگ شاعر تھے جن کے بیٹے اور پوتے بھی ان کے ساتھ مشاعروں میں آتے اور غزلیں پڑھتے ایک روز ایک مقامی کالج میں مشاعرہ تھا۔ بزرگوار کی باری آئی تو وہ رعشہ سے کانپتے ہوئے لاٹھی کے سہارے مائیک پر آئے۔ لڑکے یہ عالم دیکھ کر

ان پر ہنسے اور پھبتیاں کسنے لگے۔ بڑے میاں نے ایک نظر مجمع پر ڈالی اور نہایت کڑکتی ہوئی آواز میں یہ شعر پڑھا۔

سنا رہے ہیں وہ افسانہ یوں جوانی کا
ہمارا جیسے کبھی عالم شباب نہ تھا

اور مشاعرہ لوٹ لیا۔ لیکن یہ زمانہ شاعری کا تھا۔ جس میں میں نے کچھ مزاحیہ نظمیں لکھیں۔ ایک دو بار ریڈیو کے مشاعروں میں بھی شرکت کی وہاں شاعروں کی باقاعدہ ایک ٹولی سی بن گئی تھی۔ ایک روز پوری ویگن بھر کر شاعر حضرات ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے جا رہے تھے کہ راستہ سے بھٹک گئے۔ کافی دیر اِدھر اُدھر گھومتے رہے مگر مشاعرہ کے مقام تک نہیں پہنچ سکے۔ ایک ویران سی جگہ ویگن رکی تو ایک شاعر نے نیچے اتر کر نعرہ لگایا۔ ''مشاعرہ کرالو'' لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اس زمانہ میں خواجہ مسعود اور ان کی بیگم جو سی بی گرلز کالج کی پرنسپل تھیں دونوں راولپنڈی کی ثقافتی زندگی کی جان تھے۔ سی بی کالج میں اکثر کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی۔ غرض یہاں بہت خوشگوار اور نہایت تخلیقی ماحول تھا اور حسن ابدال کے تجربہ کے بعد تو پنڈی جنت لگتا تھا۔

راولپنڈی میں میرا قیام کوئی تین برس رہا۔ ان تین برسوں سے بڑی تلخ و شیریں یادیں وابستہ ہیں۔ ہم نے وہاں انگریزی ادب کا حلقہ قائم کیا۔ پشاور یونیورسٹی سے پروفیسر مظہر علی خاں کو اور پنجاب یونیورسٹی سے پروفیسر حمید احمد خاں اور پروفیسر ایرک سپرئن کو دعوت دی اور انھوں نے وہاں بڑے دلچسپ لیکچر دیے۔ صدر ایوب نے اسی زمانہ میں ایک حکم جاری کیا کہ اساتذہ حضرات بہت سست ہوتے ہیں اور ان کی پی ٹی کرائی جایا کرے۔ اس کی ابتدا اصغر مال کالج سے ہوئی۔ بلکہ شاید یہ اس کالج میں ہی ہوئی۔ صبح صبح بزرگ استاد بنیانیں اور نیکریں پہن کر پی ٹی کیا کرتے تھے اور شریر لڑکے ان کو دیکھ کر ہنستے تھے۔ چند ایک لوگوں کو اس میں واقعی بڑی ذلت محسوس ہوتی تھی۔ پچپن برس سے زیادہ عمر کے لوگ پریڈ سے بچ گئے۔ کچھ

لوگ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لے آئے۔ ایک صاحب کو جو کہ اسلامیات کے استاد تھے یہ شکایت تھی کہ پی ٹی کا لباس غیر شرعی تھا اور اس میں ستر پوشی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ بھی اس سے بچ گئے۔ لوگ عام طور پر اس زبردستی کے حکم سے کچھ بددل ہی تھے۔ میں نے ''مشقِ سحر'' کے نام سے ایک مزاحیہ نظم لکھ کر ایک روز پی ٹی کے بعد اس پروگرام کی تکمیل کی تقریب میں سنائی تو سب ہنس پڑے اور یوں صبح صبح ورزش کرنے پر جو انھیں غصہ تھا وہ دور ہوگیا۔ دلچسپ اتفاق یہ تھا کہ اس کے فوراً بعد کچھ بزرگ پروفیسران کی شادیاں ہوگئیں۔

اسی دوران دو تین اہم واقعات بھی ہوئے۔ نیاز فتح پوری صاحب نے غالب پر میرا مضمون ''نگار'' لکھنؤ میں چھاپا جو کراچی ایڈیشن سے بھی چھپا۔ یہ میری پہلی پبلیکیشن تھی۔ ان ہی دنوں جعفر طاہر کے اعزاز میں کالج میں ایک شام منعقد کی گئی۔ میں نے ''ہفت کشور'' پر ایک مضمون پڑھا جو بعد میں ''ماہِ نو'' میں چھپا۔ جعفر طاہر اس پر بہت برہم ہوئے اور شکایت کی کہ نقاد شاعروں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ میں نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس مضمون میں ان کی بہت تعریف کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی ان امکانات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جو آئندہ اس سے بہتر نظم کی تخلیق کا سبب بنیں گے۔ یہ بات جعفر طاہر کو اچھی نہیں لگی، ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ میں نے واہ کے سالانہ مشاعرے میں ایک نظم پڑھی۔ جو بہت مقبول ہوئی۔ فتح محمد ملک نے مجھ سے کہا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے یہ نظم فنون کے لیے مانگی ہے۔ میں نے کبھی شاعری کو ذریعہ عزت نہیں سمجھا اور کبھی کہیں اپنی کوئی نظم چھپنے نہیں بھیجی۔ لیکن فتح محمد کو یہ نظم دے دی۔ قاسمی صاحب نے سال بھر تک اسے نہیں چھاپا۔ اسی دوران میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی کو چھوڑ کر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں آ گیا۔ ''فنون'' کا دفتر قریب ہی تھا۔ میں خود ہی وہاں چلا گیا۔ قاسمی صاحب نے کہا کہ ایک اصلاح کے لیے وہ میری اجازت چاہتے تھے اور اسی وجہ سے اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔ میں نے نہایت ادب سے عرض کی کہ آپ جیسے معروف ادیب شاعر اور نقاد میری اصلاح کریں تو میرے لیے اس سے بڑی

عزت کی بات اور کیا ہوسکتی ہے، آپ اصلاح کر دیں اس کے بعد بھی ایک برس اور گزر گیا۔ میں پھر قاسمی صاحب سے ملا۔ میں نے عرض کی کہ مجھے نظمیں چھپوانے کا کوئی شوق نہیں اور اگر وہ میری نظم واپس کر دیں تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آخر کار وہ نظم چھپ گئی۔ لیکن صرف آدھی، مجھے یہ بات سخت ناگوار گزری اور میں نے قاسمی صاحب سے گلہ کیا کہ ایک لفظ کو بدلنے کے لیے تو آپ نے دو سال انتظار کیا لیکن آدھی نظم کو خارج کر دیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔ ان کا جواب یہ تھا کہ اس نظم میں کچھ دوستوں پر زد پڑتی تھی۔ مجھے بہت تعجب ہوا اور میں نے کہا کہ میں تو آپ کو بہت بے باک اور حق پسند سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور اس سے بھی زیادہ صدمہ مجھے اس وقت پہنچا جب انھوں نے یہ کہہ کر جعفر طاہر پر میرا مضمون چھاپنے سے معذوری ظاہر کی کہ 'ہفت کشور'' کو چوں کہ آدم جی انعام مل گیا ہے اس طرح اس پر سرکاری ٹھپہ لگ گیا ہے اور وہ اسے شائع نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اس پر تنقید کو حکومت پر تنقید سمجھا جائے گا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تو آپ کو بڑا انقلابی سمجھتا تھا اور آپ حکومت سے اتنا ڈرتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ یہی مضمون حکومت کے اپنے رسالہ ''ماہ نو'' میں شائع ہوگیا۔

....

(۳)

اعلیٰ تعلیم

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے میں ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی میں آ گیا تھا پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر تھے اور پروفیسر سراج الدین انگریزی کے پہلے صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ اس سے پہلے یونیورسٹی میں انگریزی کا شعبہ نہیں تھا۔ ہم نے ہی اس شعبہ کو شروع کیا پنجاب یونیورسٹی کی ایک بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہ کبھی بھی ایک علمی درس گاہ نہیں تھی۔ اس کا کام صرف امتحانات منعقد کرنا تھا۔ یونیورسٹی ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی۔ سب سے پہلا شعبہ غالباً اورینٹل کالج تھا۔ پھر کیمسٹری کا شعبہ قائم ہوا اور اس کے بعد یونیورسٹی لاء کالج۔ تقسیم ہند کے وقت یونیورسٹی میں صرف چند تدریسی شعبے تھے۔ تعلیمی کام ملحقہ کالجوں میں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی حیثیت کو یہاں کبھی اہمیت نہیں دی گئی۔ علم سے بے اعتنائی پنجاب یونیورسٹی کے خمیر میں ہے اور اس کے سائے میں جو دوسری یونیورسٹیاں پروان چڑھیں ان کا بھی عالم تقریباً ایسا ہی ہے۔ بہر حال جب ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی میں انگریزی کا شعبہ قائم ہوا تو میں لاہور میں آ کر وائس چانسلر صاحب سے ملا۔ یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ تھا۔ میں نے ایک پرچی پر اپنا نام لکھ کر دفتر میں بھجوایا تو خان صاحب نے فوراً ہی مجھے بلالیا۔ وہاں اس وقت ان کے ساتھ ڈاکٹر سید عبداللہ بیٹھے ہوئے تھے۔ خان صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ میرے عزیز شاگردوں میں سے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے بے ساختہ کہا کہ جس طرح یہ اندر آئے اور انھوں نے جس طرح ادب سے آپ کو سلام کیا میں اسی سے سمجھ گیا کہ یہ آپ کے شاگرد ہی ہیں اس واقعہ سے یونیورسٹی کی عمومی فضا کا بھی کچھ اندازہ ہوا۔ جس خوبصورتی سے انھوں نے پروفیسر حمید خان صاحب کو اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی اپنا گرویدہ بنالیا اس سے

ان کے حسن سلوک کا انداز ہوتا تھا۔ یونیورسٹی جیسے Closed اداروں میں اس حسن سلوک کی بہت ضرورت ہوتی۔ بہر حال یہ تفصیل آئندہ پروفیسر صاحب میرے ارادے سے بہت خوش ہوئے اور میں نے یونیورسٹی میں ملازمت کے لیے درخواست دے دی۔ جب میں درخواست لے کر اپنے پرنسپل ایس ایم انور کے پاس گیا تو انھوں نے مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ یونیورسٹی کا ماحول سازشوں اور درباریوں سے بھرا ہوا ہے اور وہاں مجھے سخت مشکلات کا سامنا ہوگا۔ مگر میں پکا ارادہ کر چکا تھا اس لیے انور صاحب کو میری درخواست آگے بھیجنی ہی پڑی۔

یہاں پہلی دفعہ میرا سرخ فیتے سے واسطہ پڑا۔ میں بڑی بے صبری سے یونیورسٹی کے انٹرویو کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک روز اچانک جب میں کلاس میں ہی تھا کہ ایک ڈاکیا میرے نام کی رجسٹری لے کر آیا میں نے لفافہ کھولا تو اس میں میری درخواست واپس کی گئی تھی اور ایک چھوٹا سا نوٹیفیکیشن افسر کی طرف سے تھا کہ درخواست دیر سے موصول ہوئی اس لیے واپس کی جا رہی ہے۔ چوں کہ ابھی انٹرویو میں تقریباً ایک ہفتہ تھا میں فوراً چھٹی لے کر لاہور بھاگا اور حمید خاں صاحب سے ملا۔ انھوں نے ڈپٹی رجسٹرار کو بلایا۔ ان کے بھائی شعبہ تعلیم میں ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ انھیں درخواست دی اور کہا کہ اسے سیکریٹریٹ سے فارورڈ کرالائیں۔ یہ کام اسی روز ہو گیا اور میں فوراً واپس کالج جا کر انٹرویو میں شریک ہونے کی باضابطہ اجازت لے کر واپس آ گیا اور سلیکشن بورڈ میں حاضر ہو گیا۔ مختصر یہ کہ ۲۴ دسمبر ۱۹۶۳ء میں یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں بطور لیکچرار شامل ہو گیا۔ شروع میں ہی مجھے یونیورسٹی کی فضا سے واسطہ پڑا۔ چوں کہ میں سرکاری نوکری سے آیا تھا اس لیے گورنمنٹ نے مجھے ڈیپوٹیشن پر بھیجا تھا۔ ایک روز میں شعبہ کے دفتر میں کھڑا تھا کہ سراج صاحب آ گئے۔ وہ مجھ پر بہت برہم ہوئے اور بڑے غصہ سے کہا کہ میں کسی کو ڈیپوٹیشن پر نہیں لوں گا۔ میں نے عرض کی وہ اگر چاہیں تو مجھے واپس بھیج دیں۔ اس لیے کہ میں باقاعدہ سلیکشن بورڈ اور سنڈیکیٹ کے ذریعہ آیا ہوں۔ کسی سفارش سے نہیں آیا۔ وہ کچھ سوچنے لگے تو میں نے کہا کہ اگر آپ فرمائیں تو میں گورنمنٹ کو لکھ

دیتا ہوں کہ میرا Lien ختم کر دے۔ بولے کہ یہ لکھ کر دو۔ چنانچہ میں نے اس سلسلہ میں درخواست دے دی سیکرٹریٹ سے خط آیا کہ اگر یونیورسٹی میری تقرری کو کنفرم کر دے تو ڈیپوٹیشن ختم ہو جائے گا چنانچہ میں پہلے سال ہی کنفرم ہو گیا۔ اس طرح میں شعبہ انگریزی میں کنفرم ہونے والا پہلا استاد تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سراج صاحب کی برہمی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا خیال تھا کہ میں حمید احمد خان صاحب کا ''آدمی'' ہوں اور شاید ان کے لیے مسائل پیدا کروں۔ دوسرے چوں کہ ان کا تعلق گورنمنٹ کالج سے تھا اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ اسلامیہ کالج کے لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ بہر حال یہ پہلا طوفان گذر گیا۔

چنانچہ یونیورسٹی میں آنے کا تجربہ پہلے پہل بہت عجیب سا لگا۔ چھ مہینے تک سراج صاحب نے نئے لیکچرارز کو پڑھانے کا کوئی کام ہی نہیں دیا۔ ہم چار نوجوان اساتذہ تھے جو روز آتے تھے اور گپ شپ لگا کر واپس چلے جاتے تھے۔ ایک روز میں نے سراج صاحب سے عرض کی کہ ہم ایک بڑی مضحکہ خیز صورت حال سے دوچار ہیں۔ روزانہ ڈیپارٹمنٹ آتے ہیں۔ آتے جاتے لڑکے اور لڑکیاں ایک عجیب سے تمسخرانہ انداز میں ہمیں دیکھ کر مسکراتے ہیں جیسے کہتے ہوں کہ یہ بھی پڑھائیں گے! اس لیے ہمیں آپ پڑھانے کا کچھ کام دے دیں۔ انھوں نے بڑی شفقت کے ساتھ کہا کہ ساری عمر پڑی ہے پڑھانے کے لیے ایسی جلدی کیا ہے۔ تاہم میرے اصرار پر انھوں نے مجھے بیکن تیار کرنے کے لیے کہا اور ہدایت کی کہ میں اس پر کچھ وقت لگاؤں اور جب کچھ تیاری ہو جائے تو پڑھانے کا کام شروع کر دوں۔ ایک تو نثر کو ہمیشہ خشک غیر دلچسپ اور پھیکا مضمون سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بھی نثر خوشی سے نہیں پڑھاتا۔ دوسرے خصوصاً بیکن کے متعلق مشہور تھا کہ اس کی انگریزی بہت ہی سخت ہے اور باتیں بھی عجیب عجیب کرتا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک چیلنج سمجھ کر بیکن کو پڑھانا شروع کیا اور اس کی جتنی تحریریں دستیاب تھیں سب پڑھ ڈالیں۔ اس کے مضامین تو کورس میں تھے۔ میں نے اس کی کتاب Novam Organum بھی پڑھی۔ اس کے اوپر جو مواد موجود تھا سب

پڑھا یہاں تک کہ Baconian Theory بھی پڑھی جس کے مطابق شیکسپیر کے ڈراموں کا اصل خالق بیکن تھا۔ پڑھا تو بہت کچھ لیکن کسی باقاعدہ فکری نقطۂ نظر کے بننے میں کافی وقت لگتا ہے۔ بہر حال میں نے بڑے زور وشور سے پڑھانا شروع کیا اور کوئی بیس پچیس کی کلاس میں سے صرف چار پانچ حضرات وخواتین نے میری کلاس میں آنے کی زحمت گوارا کی۔ لیکن میں دل برداشتہ نہیں ہوا یہاں تک کہ ایک طالبہ نے ایک روز سب کے سامنے کہہ دیا کہ عابدی صاحب کو اور کچھ آتا ہو نہ آتا ہو بیکن بالکل نہیں آتا۔ میں نے اپنی علمیت پر کبھی اصرار نہیں کیا اور اپنی کم علمی پر مجھے کوئی شرمندگی بھی کبھی نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ میں ہمیشہ سے اس بات کا قائل ہوں کہ کم علمی انسان کا مقدر ہے اور انسان کی کامیابی بس اسی میں ہے کہ جتنا جان سکتا ہے جان لے۔ پھر ایسے دل شکن تبصرے اس وجہ سے بھی ناقابل برداشت نہیں تھے کہ یہ ڈیپارٹمنٹ بالکل نیا تھا اور ہم پڑھانے والے بھی ابھی مبتدی ہی تھے۔

پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کے شروع ہونے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ حمید احمد خان صاحب جب اسلامیہ کالج کے پرنسپل اور انگریزی کے صدر شعبہ تھے تو وہ انگریزی کے بورڈ آف سٹڈیز کے صدر مقرر ہو گئے۔ یہ ان ہی کی کوشش تھی کہ پنجاب یونیورسٹی میں انگریزی کے شعبہ کے کھلنے کی صورت بنی اس سے پہلے ایم اے انگریزی کی تعلیم گورنمنٹ کالج، ایف سی کالج، اسلامیہ کالج، لاہور کالج فار ویمن، مرے کالج سیالکوٹ اور گورڈن کالج راولپنڈی میں دی جاتی تھی۔ جب یونیورسٹی میں یہ شعبہ قائم ہوا تو حمید احمد خان صاحب نے اپنی اسلامیہ کالج کی رواں کلاس یونیورسٹی کے شعبہ کو دے دی۔ اس شعبہ کے لیے انھوں نے دیگر اسامیوں کے ساتھ دو پروفیسروں کی جگہ رکھی تھی۔ انھوں نے سراج صاحب کو جو سرکاری ملازمت سے فارغ ہو چکے تھے اس شعبہ کی سربراہی کی دعوت دی۔ دوسری جگہ انھوں نے خود اپنے لیے رکھی۔ لیکن چوں کہ اسی دوران ان کا بطور وائس چانسلر تقرر ہو گیا اس لیے دوسری پوسٹ کے لیے ڈاکٹر امداد حسین صاحب کو جو سرکاری ملازمت سے فارغ ہو چکے تھے اس شعبہ

کی پروفیسری کی دعوت دی۔ وہ چند روز اس عہدہ پر فائز بھی رہے لیکن پھر یہ ملازمت چھوڑ گئے۔ پروفیسر ایرک سپرئن کو ان کی جگہ لانے کی کوشش کی گئی لیکن بوجوہ وہ بھی کامیاب نہ ہو سکی چنانچہ یہ جگہ خالی ہی پڑی رہی یہاں تک کہ جب غالب کی صد سالہ یادگار کی تیاریاں شروع ہوئیں تو یہ پوسٹ غالب چیئر کے نام سے اورینٹل کالج کو دے دی گئی۔

یونیورسٹی کے نئے شعبہ کو چلانے کے لیے لاہور میں موجود تمام سینئر اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ چنانچہ یونیورسٹی میں جو پروفیسر صاحبان باہر سے پڑھانے کے لیے آئے تھے ان میں ڈاکٹر شیٹس ایف سی کالج سے، پروفیسر ایرک سپرئن اسلامیہ کالج سے، ڈاکٹر امداد حسین گورنمنٹ کالج سے اور ڈاکٹر صادق صاحب دیال سنگھ کالج سے آتے تھے اور یوں یہ ڈیپارٹمنٹ بہت بھاری بھرکم ہو گیا تھا۔ اتنے عظیم اساتذہ کے ہوتے ہوئے اگر کوئی میرے متعلق یہ کہے کہ اسے پڑھانا نہیں آتا تو یہ کوئی دکھ کی بات نہیں تھی۔

یہ دور غالباً یونیورسٹی کی علمی تاریخ کا سب سے اچھا دور تھا، مباحثے، سیمینار، ادبی اور علمی محفلیں عام ہوتی تھیں۔ مختلف شعبوں کے اہم افراد کو ڈیپارٹمنٹ میں اپنے خیالات کے اظہار کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ اساتذہ نے بھی انگریزی زبان و ادب پر گفتگو کرنے کے لیے ایک انجمن قائم کر لی تھی جس کے پہلے جلسہ میں جو اسلامیہ کالج سول لائنز میں منعقد ہوا ڈاکٹر امداد حسین صاحب نے ایک مضمون پڑھا جس پر بعد میں بحث بھی ہوئی۔ اسی طرح ایک جلسہ کنیئرڈ کالج لاہور میں بھی ہوا ایک ایسی ہی نشست میں مسز سراج نے بھی ایک مضمون پڑھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب طلباء میں بھی علمی اور ادبی دلچسپیاں زوروں پر تھیں۔ مذاکرے، مباحثے، مشاعرے عام ہوتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ لاہور کے ہر کالج میں کوئی نہ کوئی سرگرمی جاری رہتی اور اسلامیہ کالج میں تو تقریباً آدھے درجن انجمنوں کے جلسے تقریباً ہر روز ہوا کرتے بلکہ کالجوں سے باہر بھی فضا بہت ادبی تھی۔ حلقہ ارباب ذوق کے جلسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہر ہفتہ وائی ایم سی اے ہال میں ہوتے۔ اس کے علاوہ یہاں کے

ریسٹوران بھی اپنا اپنا ایک مزاج رکھتے تھے۔ چینیز ٹی ہاؤس میں زیادہ تر گورنمنٹ کالج کے دانشور اپنے حلقے بنائے بیٹھے ہوتے کافی ہاؤس زیادہ تر سیاسی مبصروں کی آماجگاہ تھی اور پاک ٹی ہاؤس پر اسلامیہ کالج اور اورینٹل کالج کا قبضہ تھا۔ اس کے تھوڑا سا آگے چل کر ریگل پر ''شیزان'' تھا جہاں بیوروکریٹس کا جمگھٹا رہتا۔ اس کے علاوہ انارکلی کے شروع میں احمد ندیم قاسمی کا اڈا تھا اور بازار میں اندر کو جا کر احسان دانش کی بیٹھک تھی۔ اسی انارکلی میں ایک مرتبہ ساغر صدیقی کو دیکھا۔ ننگے پیر، ایک بوتل ہاتھ میں، اونچی سی لنگی باندھے دنیا سے بے فکر تیز تیز چلے جارہے ہیں۔ بے ساختہ ان ہی کا شعر یاد آیا۔

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

لاہور کی سب سے معتبر اور سب سے قدیم نشست البتہ حلقہ ارباب ذوق کی تھی اور اس کے اجلاس بہت دلچسپ اور بہت عالمانہ ہوتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا شیرازہ بکھر چکا تھا کبھی کبھی چٹکلے بھی ہو جاتے۔ مثلاً ایک مرتبہ حبیب جالب نے منیر نیازی کے کسی شعر پر تنقید کی تو منیر نیازی نے حبیب جالب کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ''یہ سر صرف ٹوپی رکھنے کے لیے بنایا گیا ہے''۔ ایک مرتبہ کسی نسبتاً کم عمر کے ادیب نے عابد علی عابد کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ اس کے ہم عصر ہیں تو عابد صاحب کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے زور دے کر کہا کہ آپ میرے ہم عصر نہیں ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کا یہ وہ دور تھا جب تقریباً شہر کے سب ہی معروف ادیب، شاعر اور نقاد اس میں شرکت کرتے تھے اب بھی حلقہ ارباب ذوق موجود ہے اور باقاعدگی کے ساتھ اس کے اجلاس ہوتے ہیں اور انتخابات منعقد کیے جاتے ہیں لیکن اب بزرگ دانشوران جلسوں میں شامل نہیں ہوتے۔ یہ جلسے پاک ٹی ہاؤس کی اوپر کی گیلری میں ہوتے ہیں اور اکثر بزرگ لکھنے والے نیچے بیٹھ کر چائے پیتے رہتے ہیں۔ اس سے ادبی اجلاس

کا معیار بہت گر گیا۔ نئے آنے والوں کی مناسب تربیت نہیں ہوسکی ہے اور ان میں سے زیادہ تر نے تنقید کے کچھ گر اور محاورے سیکھ لیے ہیں اور ان ہی پر بحث کرتے رہتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کا شوق تقریباً مفقود ہے (1) مثلاً جب میں نے سعادت سعید کے ایما پر بریخت، لورکا، آئیسکو، سارتر اور گورکی وغیرہ پر حلقہ میں مضامین پڑھے تو انھیں بہت سراہا گیا۔ صرف ایک مرتبہ ایک صاحب نے جو تازہ تازہ جنوبی امریکہ سے آئے مجھے ہسپانوی ناموں کے تلفظ پر ٹوکا۔ مارکیسز اور نرودا کے حوالہ سے صحیح نام جاننے ضروری ہیں۔ بس اس کے علاوہ اکثر ضرورت سے زیادہ میرے مضامین کی مدح سرائی کی گئی۔ تو میں نے سوچا کہ اب ایسے موضوعات پر لکھا جائے جن سے لوگ واقف ہوں۔ لیکن یہاں پہلے سے بھی زیادہ مایوسی ہوئی۔ میں نے انتظار حسین کے ناولٹ ''دن'' پر مضمون پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہاں موجود صرف ایک صاحب نے یہ ناولٹ پڑھا تھا اور وہ بھی برسوں پہلے۔ لیکن بحث بہت گرما گرم ہوئی اور سب نے حصہ لیا۔ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات تب ہوئی جب میں نے عبداللہ حسین پر ایک مضمون پڑھا۔ لوگ بہت برہم ہوئے اور تقریباً سب نے ہی احتجاج کیا کہ میں نے عبداللہ حسین کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ لیکن جب میں نے کہا کہ بتائیں زیادتی کہاں ہوئی ہے تو جواب ملا کہ ابھی عبداللہ حسن کو پڑھا نہیں ہے۔ پڑھ کر بتائیں گے۔ غرض یہ آج کا حلقہ ارباب ذوق ہے۔ گو آج بھی وہ لوگ موجود ہیں جو کم از کم حلقہ کے سالانہ انتخاب میں ووٹ ڈالنے ضرور آتے ہیں مگر اسے فعال بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان میں سے کچھ کنگ میکرز بنا چاہتے ہیں اور نوجوان ادیبوں کو آگے لانے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ شاید الزام ان بزرگوں کو بھی نہ دیا جاسکے اس لیے کہ ان میں سے اکثر نے اب لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور اپنی ماضی کی شہرت پر ہی زندہ ہیں۔

1- اب پاک ٹی ہاؤس بند ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ناصر باغ میں ''چوپال'' کو مقبول بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

حلقہ ارباب ذوق نوجوان شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کے لیے ایک بہت اچھی تربیت گاہ تھی جس کی افادیت میں اب بہت کمی آئی ہے۔لیکن اس کی وجوہات حلقہ سے کہیں حلقہ کے باہر کے حالات میں مضمر ہیں۔حلقہ کے عروج کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب درسگاہوں میں علم کا چرچا تھا اور سڑکوں پر سیاست کی چہل پہل، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں علمی بحثیں ہوتی تھیں اور ہر شعبہ کی اپنی اپنی انجمنیں تھیں۔ذوق تنقید کی تربیت صرف درسگاہوں میں ہی ممکن ہے۔لیکن اب درسگاہوں میں صرف نصاب کی حد تک ہی تعلیم دی جاتی ہے اور مقصود نظر صرف امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔چنانچہ دانشوروں کی دانشوری محض ذاتی لڑائیوں اور سازشوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

یونیورسٹی ہمیشہ سے ہی سازشوں کا گڑھ رہی ہے اور یہاں کبھی علمی ماحول پیدا نہیں ہو سکا۔اورینٹل کالج کو کسی حد تک مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے کہ کم از کم قیام پاکستان کے وقت تک اس کا ملک میں ایک علمی، ادبی اور تحقیقی مقام تھا۔لیکن بعد میں یہ ادارہ بھی سازشوں کا شکار ہو گیا۔ڈاکٹر عبادت بریلوی، سابق پرنسپل اورینٹل کالج اور کچھ دوسرے لوگوں نے بھی یونیورسٹی کی سازشوں پر کافی روشنی ڈالی ہے اس لیے میں اس موضوع کو یہیں چھوڑتا ہوں اور ظاہر ہے جب کوئی کام نہیں ہوگا تو سازشیں ہی ہوں گی۔اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ شعبہ انگریزی کی موجودہ چیئرپرسن شائستہ سراج الدین اس بات پر بہت زور دیتی ہیں کہ انھیں پروفیسر شپ میرٹ پر ملی ہے۔ایک اور واقعہ ہمارے بزرگ یوں بھی سناتے تھے کہ ایک شعبہ کے پروفیسر نے ایک مرتبہ اپنے شعبہ میں ایک ریڈر کی اسامی قائم کرنے کی درخواست کی تو دوسرے شعبوں کے پروفیسر انھیں سمجھانے آئے کہ کیوں اپنے پیر پر کلہاڑی مارتے ہیں۔کل یہی ریڈر آپ کو ہٹانے کی سازش شروع کر دیں گے۔چنانچہ کچھ شعبوں میں بہت عرصہ تک پروفیسر اور لیکچرار ہی ہوتے تھے۔بلکہ لیکچرارز کی جگہ بھی کنٹریکٹ پر کچھ اساتذہ جز وقتی طور پر رکھے ہوتے تھے۔

جب پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تھی اس وقت اس کا کام صرف امتحانات منعقد کرنا ہوتا تھا۔اس کی یہ روایت آج تک قائم ہے اور یہاں کنٹرولر آف ایگزیمینیشن اور رجسٹرار کو ہمیشہ پروفیسروں سے زیادہ وقار حاصل رہا ہے۔چنانچہ پروفیسروں کی بڑی خواہش ہوتی ہے کہ انھیں رجسٹرار لگا دیا جائے۔یہاں تک ۱۹۷۳ء کے بعد سے پروفیسروں کو گریڈ ۲۰ دے دیا گیا ہے جب کہ رجسٹرار اور کنٹرولر آف ایگزامینیشن کا گریڈ ۱۹ ہے پھر بھی آج تک پروفیسر حضرات رجسٹرار کی چاپلوسی میں لگے رہتے ہیں اور ان کو اپنا افسر اعلیٰ ہی سمجھتے ہیں۔لگتا ایسا ہے کہ انگریزوں نے پنجاب والوں کے ساتھ یہ چال چلی تھی۔پنجاب ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن کہلاتا تھا اور یہاں سے تاج برطانیہ کی محافظ فوج بھرتی کی جاتی تھی۔برطانوی حکمران نہیں چاہتے تھے کہ یہاں کے لوگ پڑھ لکھ جائیں اور فوج کے علاوہ دوسرے شعبوں کی طرف توجہ کریں۔آج بھی یہاں فوج کے ایک کرنل کی یونیورسٹی کے پروفیسر سے کہیں زیادہ عزت ہے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے یعنی انگریزوں نے۔ایک ایسا نظام اختراع کیا کہ جس کے ذریعہ ڈگریاں تو دی جائیں لیکن علم ان تک نہ پہنچنے دیا جائے کیا کوئی کسی ایسی یونیورسٹی کا تصور کر سکتا ہے جس میں نہ تحقیقی ادارے ہوں نہ تنقیدی شعبے ہوں اور نہ کوئی علمی کانفرنسیں اور سیمینار ہوں۔یہ فخر پنجاب یونیورسٹی کو حاصل ہے۔اسی لیے اس شہر کے ایک عظیم دانشور اور صحافی جنھیں ان کی اسی عظمت کی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کا ممبر بنایا گیا تھا۔سینٹ میں شعبہ انگریزی پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کتنی شرم کی بات ہے کہ اسلامی مملکت کی ایک یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی میں 'ہملٹ' پر تحقیق کی جاتی ہے۔

اس دور کے پنجاب یونیورسٹی کے علمی کارناموں میں سے صرف دو تین کا ذکر کروں گا۔کہیں سے یونیورسٹی کے شعبہ فزکس کو کسی نے ایک اوسلوسکوپ تحفۃً دے دیا۔پروفیسر صاحب نے طلباء کو اس کی کارکردگی دکھائی۔ایک طالب علم نے پوچھا کہ اس پر جو الیکٹرانک بیم نظر آتی ہے وہ سبز رنگ کی کیوں ہے۔پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ پاکستان کے لیے بنی

ہے۔یہ باتیں اس زمانے کی ہیں جب میں فزکس میں ایم ایس سی کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔اسی زمانے میں ایک پروفیسر صاحب نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ پر ایٹامک بم پر ایک لیکچر دینے کا اعلان کیا لیکچر سننے کے لیے دو امریکی بھی آ گئے پروفیسر صاحب بہت پریشان ہوئے اور ایک ساتھی سے کہا کہ انھیں وہاں سے نکالے اور ساتھی نے امریکیوں سے کہا کہ یہ لیکچر سکول کی سطح کے طالب علموں کا ہے آپ کی دلچسپی کے مطابق نہیں چنانچہ وہ چلے گئے لیکن اس دور کا سب سے اہم واقعہ وہ تھا جب فزکس ڈیپارٹمنٹ نے سائنسی نمائش کا اعلان کیا جو یونیورسٹی ہال میں لگائی گئی تھی۔صدر ایوب کو اس کے افتتاح کی دعوت دی گئی۔اس نمائش کی نمایاں بات ''اسلامی بم'' کو پیش کرنا تھا۔اخباروں میں کافی چرچا ہوا۔صدر صاحب افتتاح کے لیے تشریف لائے۔ان کے لیے ایک مائیک رکھا گیا۔جس پر انھوں نے سیٹی بجائی تو خاص طور پر بنایا ہوا دروازہ خود بخود کھل گیا۔صدر صاحب کو بتایا گیا کہ آواز کی قوت کو اس سے بھی زیادہ اور اس حد تک بڑھایا جا سکتا ہے کہ اس میں ایٹم بم کی طرح دھماکہ پیدا ہو سکتا ہے سنا ہے کہ بعد میں ان صاحب کو حکومت کے ہاتھوں کچھ مشکلات بھی پیش آئیں یہ ہیں ہماری مادر علمی کے عظیم کارنامے۔

پھر بھی اس زمانہ میں علمی فضا نہ سہی طالب علمانہ فضا ضرور موجود تھی مختلف تعلیمی اداروں میں غیر نصابی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب ڈرامے، مشاعرے، مباحثے عام تھے۔ان میں صرف مقامی ہی نہیں بلکہ بین الصوبائی مقابلے بھی ہوتے تھے۔کراچی، کوئٹہ، پشاور اور حیدر آباد سے ٹیمیں آتی تھیں۔اسی زمانہ میں ہمارے طالب علموں، خصوصاً شہر یار راشد اور وحید احمد نے طبع زاد ڈرامے بھی لکھے اور سٹیج کیے۔اسی طرح کھیل کے میدان میں بھی بہت گہما گہمی تھی۔پنجاب یونیورسٹی کے اور گورنمنٹ کالج کے انگریزی کے شعبوں کے درمیان کرکٹ وغیرہ کے میچ ہوتے جن میں لڑکے لڑکیاں اور اساتذہ بھی شریک ہوتے۔لیکن سب سے زیادہ دلچسپ وہ میچ تھے جو اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج

کے درمیان ہوتے تھے۔خصوصاً کرکٹ کے میچ جس میں تقریباً سارا شہر لگتا تھا دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گیا ہے ایک گورنمنٹ کالج کی اور ایک اسلامیہ کالج کی۔سپورٹس مین شپ کی روایت ابھی تک قائم تھی اور کھیل کو کھیل سمجھ کر ہی کھیلا جاتا تھا۔یہ نظارہ بعد میں لندن میں دریائے ٹیمز پر کیمبرج اور آکسفورڈ کے درمیان کشتیوں کے مقابلے میں دیکھنے کو ملا۔اس موقعہ پر وہاں پورے شہر میں ایک جشن کا سا سماں ہوتا ہے۔سارا شہر دو پارٹیوں میں بٹ جاتا ہے۔

ابھی یونیورسٹی میں میرا دوسرا ہی سال تھا کہ ۶۵ء کی جنگ شروع ہو گئی۔چھ ستمبر کی صبح میں تقریباً آٹھ بجے تیار ہو کر یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوا۔ابھی کارپوریشن کے سامنے تھا کہ دو زبردست دھماکے ہوئے اور ساتھ ہی دو جنگی جہاز نیچی پرواز کرتے ہوئے مال روڈ پر سے گزرے یہ بھارت کی سرحد کی طرف سے آ رہے تھے۔سڑک پر بھگدڑ سی مچ گئی۔لیکن میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا یونیورسٹی پہنچا۔ڈیپارٹمنٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہندوستان نے حملہ کر دیا ہے۔

پھر سترہ روز تک ہواؤں میں، میدانوں میں اور سمندر میں جنگ جاری رہی۔شکیل احمد نے بڑے جوش و خروش سے ریڈیو پر اس جنگ کو جاری رکھا اور ملکہ موسیقی نور جہاں نے بڑی عقیدت کے ساتھ وطن کے نغمے گائے۔لوگوں میں جینے کی ایک نئی تڑپ پیدا ہوئی یک بیک ایک زبردست تبدیلی نمایاں ہوئی۔سب بڑے ہی خوش اخلاق اور دیانت دار ہو گئے بس کنڈکٹر جو اکثر ٹکٹوں سے بچی ہوئی ریزگاری یہ کہہ کر رکھ لیا کرتے تھے کہ ان کے پاس ٹوٹے ہوئے سکے نہیں ہیں اب خاص طور پر بچے ہوئے ایک پیسہ کو بھی واپس کرتے تھے۔اس زمانہ میں روپے میں ساٹھ پیسے ہوتے تھے اور پیسہ پیسے کی شکل کا ہوتا تھا۔مستری لوگ اسے مشینوں میں واشر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔غرض لوگوں میں ایمان داری، حب الوطنی اور بھائی چارے کے جذبات جاگ اٹھے تھے۔جنگ کس طرح دلوں کو بدل دیتی ہے اس کا احساس ہوا۔لیکن زندہ دلان لاہور کو جنگ کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔وہ لڑاکا ہوائی جہازوں کی

ڈوگ فایٹ کو کھیل سمجھ کر دیکھتے تھے۔ غیر ملکی صحافی سخت حیران تھے۔ وہ بلٹز Blitz کی تباہ کاریاں دیکھ چکے تھے۔ ان کے ذہنوں میں جنگ عظیم کے مناظر تھے۔ وہ سمجھ ہی نہ پائے کہ یہ لاہور کے لوگ کس قسم کے انسان ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ جنگ دو ایسے لوگوں کے درمیان تھی جو برسوں سے اکٹھے رہتے آئے تھے اور سیاسی تقسیم کے باوجود جذبات کی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ دونوں طرف کے فوجیوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا کہ کہیں کوئی آبادی ان کی زد پر نہ آ جائے اور وہ اسے زد پر بھی نہ لاتے۔ ہمارے فضائی مجاہد ہندوستانی ٹھکانوں پر حملے کرتے لیکن وہاں تاج محل ہے جامعہ مسجد ہے، لکھنؤ ہے، اجمیر ہے کیا یہاں بھی کوئی پاکستانی گولے برسا سکتا تھا۔ یہی حال ادھر تھا۔ یہاں ننکانہ صاحب ہے اور وہ شہر ہیں جو ہندوستانیوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہیں۔

پنجہ صاحب حسن ابدال میں ہے بودھ آثار ٹیکسلا میں ہیں۔ غرض دونوں طرف جذبات الجھے ہوئے ہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ جنگ دو ایشیائی ہمسائیوں میں لڑائی تھی اور ایشیاء ایک امن پسند خطہ ہے۔ یہاں مغرب کی بربریت اور اس کا وحشیانہ پن نہیں ہے۔ جہاں ہتھیار ڈالنے کے بعد جرمنی پر آگ برسائی جاتی ہے۔ جہاں یہودیوں کے ساتھ کتوں سے بھی زیادہ ذلت آمیز برتاؤ کیا جاتا ہے۔ جہاں بوسنیا میں اور کوسوو میں قتل و غارت اور عصمت دری کے تمام ریکارڈ توڑ دیے جاتے ہیں یہ صرف مغرب میں ہو سکتا ہے۔ مشرق کبھی اتنا وحشی اور اتنا ظالم نہیں ہوا۔ انفرادی طور پر یہاں بھی ظالم افراد ظالم حکمران اور ظالم گروہ غارت گری کرتے رہے۔ لیکن ایک پوری قوم کی دہشت گردی صرف مغرب کا ہی خاصہ ہے اور یہ بات بھی اب ثابت ہوگئی ہے کہ پنجاب میں ۴۷ء کے فسادات لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سازش تھے۔

اسی جنگ کے دوران میں ایک روز مال پر ٹہلنے نکلا۔ وائی ایم سی اے کے قریب پہنچا تو سائرن بجنے لگے۔ گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی ہوگئیں۔ لوگ درختوں کے نیچے چھپ

گئے۔ اس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دل میں آیا۔ مجھے اچانک مال روڈ بہت خوبصورت لگی۔ یونیورسٹی کا پرانا کیمپس اور عجائب گھر نظروں کے سامنے آ گئے۔ قریب ہی جی پی او کی بلڈنگ اور ہائی کورٹ کی پرشکوہ عمارت نے دل کھینچ لیا، مجھے لگا کہ شاید کل یہ عمارتیں یہاں نہ ہوں۔ ان کی جگہ ان کا ملبہ ہو۔ جنگ حقیقتوں کو کتنا واضح کر دیتی ہے۔

پھر تاشقند کا معاہدہ ہوا۔ عوام کو زبردست دھچکا لگا۔ انھیں محسوس ہوا کہ انھیں دھوکہ دیا گیا ہے۔ اس معاہدہ کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ ہماری ایک طالبہ ریحانہ سرور (وہ ریحانہ سرور نہیں جو بعد میں سیاست میں آئیں) انھوں نے مال پر جلوس نکالا جس میں جنگ میں شہید ہونے والوں کی بیوائیں بڑی تعداد میں شریک ہوئیں۔ وہ اپنے پیاروں کا حساب مانگتی تھیں۔ ان احتجاج کرنے والی خواتین کی پولیس سے جھڑپ بھی ہوئی۔ اب لوگوں کو پتہ لگا کہ سیاست کیا ہے۔ حکمرانوں کے مفادات کیا ہیں اور عوام کے جذبات کیا ہیں، اس جنگ سے ایک شعور پیدا ہوا جس کے بعد صدر ایوب زیادہ دیر تک صدر نہ رہ سکے۔ لیکن کتنے دکھ کی بات ہے کہ بقول بریخت یہ شعور جنگ کی صورت زبردست قیمت دینے سے حاصل ہوتا ہے اور اس سے بھی بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ ذاتی مفادات رکھنے والے اس شعور سے محروم رہتے ہیں۔ وہ تجربہ سے صرف اتنا سیکھتے ہیں جتنا ایک خرگوش کی لیبارٹری میں چیر پھاڑ کی جائے تو وہ اپنی اناٹومی کے متعلق سیکھتا ہے۔

۶۵ء کی جنگ کے بعد صدر ایوب کا اقتدار کمزور ہونا شروع ہوا پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی اور عوام میں سیاست اس زور و شور سے داخل ہوئی کہ نوجوان بھی اسی زور و شور سے سیاست میں داخل ہو گئے جیسے کہ وہ تحریک پاکستان کے دور میں تھے۔ یہیں سے دائیں اور بائیں بازو کی سیاست نے تعلیمی اداروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اساتذہ انجمنیں فعال ہوگئیں اور تعلیمی ماحول بگڑنے لگا۔ آئے دن ہڑتالیں اور ہنگامے ہونے لگے، یہاں تک کہ تعلیمی اداروں سے تعلیم آہستہ

آہستہ خارج ہوتے ہوتے بالکل ہی رخصت ہوگئی۔ سیمینار، مباحثے اور ڈرامے وغیرہ ختم ہوگئے اور تعلیم محض امن وامان کا مسئلہ ہوکر رہ گئی، حکومت کا اہم مسئلہ صرف یہ رہ گیا کہ طلبا کو کسی بھی طرح مشتعل نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ اگر انھوں نے کہا کہ نصاب مشکل ہے تو اسے آسان بنادیا گیا۔ اگر انھوں نے اصرار کیا کہ امتحانات ملتوی کردیے جائیں تو وہ ملتوی کردیے گئے اور یوں تعلیمی اداروں پر طلباء کا مکمل کنٹرول ہوگیا انگریزی اکثر طلباء کے لیے بڑا مسئلہ تھی۔ اس کا نصاب کم ہوتے ہوتے ایک وقت بالکل ہی ختم ہوگیا اور س کی جگہ Functional انگریزی کو دے دی گئی۔ چنانچہ B.A. کا معیار انگریزی میں اتنا ہی رہ گیا جتنا کسی اچھے سکول میں چھٹی جماعت کے طالب علم کا اور یہ بات عام طور پر مانی جانے لگی کہ جو طالب علم B.A. کے امتحان میں انگریزی میں فیل ہوتا ہے وہ چھٹی جماعت کے انگریزی کے امتحان میں بھی فیل ہوجائے گا۔ سرکاری مدارس کالجوں اور یونیورسٹیوں کی اس بگڑتی حالت کے پیش نظر بہت سے لوگوں نے تعلیم کے میدان کو خالی پایا اور یکا یک نجی تعلیمی اداروں کی ایک کھیپ میدان میں اتر آئی۔ اس طرح صاحب حیثیت لوگوں کے بچوں کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست ہوگیا لیکن عوام کے بچوں کے تعلیمی ادارے سیاسی اکھاڑے اور قتل وغارت کا بازار ہوکر رہ گئے طوائف الملوکی کے اس دور میں سیاسی سطح پر سنگین صورت حال ابھر کر سامنے آئی، مشرقی پاکستان نے کھلم کھلا مغربی پاکستان کے خلاف محاذ بنالیا۔ ہمارے سادہ لوح عوام کو بتایا گیا کہ بنگالی بے دین اور غدار ہیں چنانچہ بنگالیوں کو مار مار کر ہمارے مخلص پاکستانی نوجوان غازی بن گئے۔ صدر ایوب نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا بقول ان کے وہ اپنی آنکھوں کے سامنے پاکستان کی تباہی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہی تباہی جس کے وہ خود بھی کافی حد تک ذمہ دار تھے اور یوں قوم ایک اور مارشل لاء کے شکنجے میں آگئی۔

اس وقت میں کیمبرج میں تھا۔ میری یورپ اور امریکہ جانے کی کہانی بھی ایک الف لیلوی کہانی لگتی ہے۔ وہ شخص جو محض اس لیے M.Sc. نہیں کرسکا کہ اس کے پاس

اسلامیہ کالج لاہور کے واجبات جو صرف ۳۳۳ روپے بنتے تھے نہیں تھے وہ کیمبرج جانے کے خواب دیکھتا تھا۔ شاید پہلے یہ ذکر گذشتہ صفحات میں آیا ہو کہ ایک زمانے میں میں نے فزکس میں M.Sc. کرنے کی کوشش کی تھی۔ قصہ یوں تھا کہ جب میں نویں جماعت میں آیا تو میں نے اپنے لیے فلسفہ تاریخ وغیرہ کے مضامین چنے۔ جب والد صاحب کو معلوم ہوا تو وہ سخت برہم ہوئے اور اسکول میں جاکر وہ مضامین کاٹ کر انھوں نے فزکس کیمسٹری اور ریاضی لکھ دیے۔ مرتا کیا نہ کرتا ہی پڑھنے پڑے۔ لیکن اس طرف رجحان بالکل نہیں تھا۔ پھر ہمارے ہاں سائنسی مضامین کے پڑھانے کا طریقہ بھی عجیب تھا جس کی کچھ جھلکیاں گزشتہ اوراق میں آچکی ہیں، کافی عرصہ پہلے غالباً پانچویں جماعت میں بھی ایک ایسا تجربہ ہوچکا تھا۔ دلی کے سکولوں میں اس زمانے میں پنجاب کا جغرافیہ پڑھایا جاتا تھا۔ اس میں پنجاب کے ضلعے اور ان کی تحصیلوں کو رٹنے کا کام بڑا مشکل اور بے مزہ تھا۔ اگر دلی کے اطراف کی یا دلی کے محلوں کی بات ہوتی تو جلد یاد ہوجاتی، پھر بھی ایک ضلع اور اس کی تحصیلیں پڑھتے ہی یاد ہوگئیں، ان میں سے بھی سوائے ضلعی صدر مقام کے میں نے آج تک کوئی شہر نہیں دیکھا۔ ان تحصیلوں کی ترتیب ایک گردان تھی:

''اٹک، اٹک میں اٹک، پنڈی گھیپ، تلہ گنگ، فتح جنگ''

اس میں بڑی موسیقیت ہے، بڑی روانی ہے، لیکن اس زمانے میں تعلیم کے لیے رجحان کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی (اب بھی نہیں دی جاتی) ورنہ فوراً پتہ لگ جاتا کہ مجھے کیا پڑھایا جانا چاہیے۔ بہر حال، طوعاً و کرہاً میں نے سائنس پڑھنی شروع کردی اور اس کے بعد میٹرک کرلیا۔ اب یہ کمپلیکس پیدا ہوا کہ جب میٹرک سائنس کے ساتھ کیا ہے تو FSc کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایف ایس سی بھی کرالیا، اس دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ ہمارے والد کے ایک دوست جو دلی میں کاروبار کرتے تھے اور سکول میں استاد بھی رہ چکے تھے ہندوستان سے پاکستان آئے تاکہ وہ یہاں اپنا کاروبار قائم کرنے کے امکانات کا جائزہ لیں، والد نے

ان سے کہا کہ مجھے کچھ ٹرگنو میٹری پڑھا دیں، چنانچہ انھوں نے پڑھانا شروع ایلفا + بیٹا آ کے = ایکس اور ہم نے اسے رٹ لیا۔

ہم بڑے زور وشور سے ان سے درس لیتے رہے۔ بہت عرصے کے بعد پتہ لگا کہ ''آ کے'' ان کا تکیہ کلام ہے۔ اب والد کا اصرار تھا کہ انجینئرنگ کی جائے۔ یہ شعبہ مجھے سخت ناپسند تھا کیوں کہ میں نے سنا تھا کہ انجینئروں کا صرف ایک کام ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اپنی کمیشن کس طرح لی جائے۔ جہاں تک کام کا تعلق تھا تو ٹھیکیداروں کے اپنے انجینئر ہوتے تھے وہ سارا کام خود ہی کر لیتے تھے۔ سرکاری انجینئر کو کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا تھا۔ ویسے بھی طبیعت ادھر نہیں آتی تھی۔ پھر .F.Sc میں نمبر بھی تھوڑے آئے تھے۔ والد صاحب مجھے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کے پاس لے گئے جو اس وقت انجینئرنگ کالج میں پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے صاف طور پر کہا کہ وہاں داخلے صرف میرٹ پر ہوتے ہیں اور ویسے وہ کسی سے سفارش کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ والد صاحب نے ان کے انکار کو اہمیت نہیں دی اور کہا کہ وہاں بڑے سینئر پروفیسروں سے ان کے مراسم ہیں داخلہ ہو جائے گا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے ان کی حکم عدولی کی اور فارم ہی داخل نہیں کرائے اور .B.Sc میں داخلہ لے لیا۔ مجھے تدریس کا شعبہ ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا اور میں پروفیسر بننا چاہتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ میں پڑھتا سائنس تھا اور میرا آئیڈیل انگریزی کے پروفیسر تھے خصوصاً پروفیسر نیاز احمد قریشی صاحب جو اس قدر ڈوب کر انگریزی پڑھاتے تھے کہ کافی دیر تک ان کے لیکچر کا نشہ برقرار رہتا تھا۔ چنانچہ اس طرح .B.Sc بھی کر لیا۔

اب ایم ایس سی میں داخلے کا سوال آیا۔ میرے ایک دوست عبدالباری صاحب تھے جن کے والد علی گڑھ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ ان کے ایک عزیز ریلوے میں ایک اعلیٰ عہدہ پر تھے۔ ان کی وساطت سے ۱۹۴۹ء میں پنجاب یونیورسٹی کے ایک سینئر اور مشہور استاد خواجہ صلاح الدین صاحب سے ملاقات ہوئی یہ شعبہ کیمیکل انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی میں

تھے اور یونیورسٹی کے انتہائی بااثر لوگوں میں سے تھے۔ انھوں نے بہت اصرار کیا کہ میں ان کے شعبہ میں داخلہ لے لوں۔ انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیج دیں گے اور واپسی پر پروفیسر بھی بنا دیں گے۔ لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ سے ایک مسئلہ رہا ہے کہ انتظامی معاملات میں شعبہ کے سربراہ سے اختلافات کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔ میں نے کبھی بھی ایک حد سے زیادہ اتھارٹی کو اہمیت نہیں دی۔ لیکن اگر ماتحت ماتحتی کے ساتھ ساتھ احسان کے بوجھ تلے بھی دبا ہو تو اس کے ہاتھ بالکل ہی بندھ جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کے شعبہ میں آنے سے انکار کر دیا اور انھوں نے مجھے فزکس میں داخلہ دلوا دیا۔ یہ مسئلہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے ساتھ بھی ہوا۔ جب ایم اے انگریزی کے امتحانات ہونے والے تھے تو خاں صاحب نے جو اس وقت شعبہ انگریزی کے پروفیسر اور کالج کے پرنسپل بھی تھے۔ پوری کلاس کو الوداعی دعوت دی اور وہاں انھوں نے اعلان کیا کہ کالج میں نئی اسامیاں خالی ہونے والی ہیں اور میں عابدی صاحب کو ان میں سے ایک آسامی پر رکھنا چاہوں گا۔ میں نے فوراً ہی کہا کہ میں تو سرکاری ملازمت میں جانا چاہوں گا۔ میری اس بدتمیزی پر انھیں بہت دکھ ہوا جس کا ذکر بعد میں پروفیسر ایرک سپرین نے کیا۔ لیکن خاں صاحب اس بدمزگی کو ٹال گئے۔ سپرین صاحب نے مجھے ڈانٹ پلائی کہ اگر کہیں ایسی Goodwill بنی ہوئی ہو تو اسے یوں برباد نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے عرض کی کہ میں ان کے تحت ملازمت نہیں کر سکتا جن کا احترام کرتا ہوں۔ پھر اس کا مجھے تجربہ بھی ہوا۔ جب میں شعبہ انگریزی میں آ گیا تو خواجہ صلاح الدین صاحب نے مجھے اپنے شعبہ کا انگریزی کا پرچہ دے دیا۔ جب نتیجہ مرتب ہونے لگا تو انھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ آپ نے بالکل صحیح نمبر لگائے ہیں۔ لیکن آپ تو صرف پرچہ دیکھتے ہیں۔ ہم ایک طالب علم پر پورے سال نظر رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی طالب علم کا پرچہ اس کی اصل صلاحیت کا مظہر نہ ہو اس لیے ہم چاہیں گے کہ آپ کچھ نتائج میں ردوبدل کر دیں، میں ساری بات سمجھ گیا اور میں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ جس کے نمبر بڑھوانا چاہیں میں

بڑھادوں گا۔لیکن میں کسی کے نمبر کم نہیں کروں گا۔چنانچہ میں نے کچھ نمبر بڑھا دیے جن کی پہلے ہی سے ان کے پاس فہرست تھی۔لیکن گھٹائے کوئی نہیں۔اس کے بعد میں اس شعبہ میں ممتحن نہیں رہا۔یہی صورتِ حال گورنمنٹ کالج میں بھی پیش آئی جہاں پرنسپل سے میرے بہت اچھے مراسم تھے۔جب میں نے انتظامی وجوہات کی بنا پر ان مراسم کو بگڑتے دیکھا تو گورنمنٹ کالج میں پڑھانا چھوڑ دیا۔

بہر حال میں نے انگریزی میں ایم اے کیا اور حسن ابدال میں سینئر ماسٹر متعین ہو گیا۔ایک سال وہاں گزارا پھر تین برس گورنمنٹ کالج اصغر مال، راولپنڈی میں گزارنے کے بعد یونیورسٹی میں آ گیا، اب میں نے خود خاں صاحب سے درخواست کی کہ میں ان کے ماتحت کام کرنا چاہتا ہوں۔چنانچہ میں یونیورسٹی میں آ گیا۔اور یوں بھی خوش تھا کہ حمید احمد خاں صاحب براہِ راست میرے صدر شعبہ نہیں تھے۔اگلے ہی برس یعنی ۶۴ء میں میں نے سنٹرل اور سیز ٹریننگ COT کے وظیفہ کے لیے درخواست دے دی۔ساتھ ہی میرے ایک اور ساتھی استاد نے بھی درخواست دی۔یہ شروع سے ہی حمید احمد خاں صاحب کی نظر میں ایک بہت ہی ہونہار نوجوان تھے۔لیکن تعلیمی کوائف کے معاملے میں مجھ سے ذرا کچھ پیچھے تھے۔دفتر والوں نے ہمارا ایک تقابلی خاکہ تیار کرایا تھا۔خان صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں اس مقابلے سے دستبردار ہو جاؤں۔میں نے عرض کی کہ میں قطعی طور پر مقابلے میں نہیں ہوں بلکہ مجھے تو علم بھی نہیں کہ کوئی اور امیدوار بھی ہیں۔بہر حال میرے ساتھی کو وہ وظیفہ مل گیا کچھ عرصہ کے بعد میں نے خاں صاحب سے گزارش کی کہ کیمبرج میں داخلہ کے لیے مجھے ریفرنس دے دیں۔پھر سراج صاحب نے بھی مجھے ایک بہت ہی اچھا سرٹیفکیٹ دیا جس کا علم مجھے کیمبرج میں اس وقت ہوا جب میرے ٹیوٹر نے مجھے بتایا کہ میرے متعلق سراج صاحب نے یہ کچھ لکھا ہے۔مختصر یہ کہ مجھے داخلہ مل گیا۔

یہاں سے سرخ فیتے کی کہانی پھر شروع ہوتی ہے۔یونیورسٹی نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے

لیے رخصت دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی مہربانی کی کہ میری تنخواہ کا آدھا حصہ مجھے پاؤنڈز میں ملے گا۔اس کے لیے سٹیٹ بنک میں درخواست دینی پڑی۔وہاں سے یہ جواب ملا کہ آپ کو فورن ایکسچینج نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ یونیورسٹی کا فورن ایکسچینج کوٹا ابھی منظور نہیں ہوا ہے۔پوچھا کہ یہ کب تک ہوگا۔بتایا گیا کہ جب ایگزیکٹو کمیٹی CEC کی میٹنگ ہوگی، جو ہو سکتا ہے اگلے برس ہو۔میں نے کہا کہ کیمبرج والے صرف ایک دفعہ ہی داخلہ دیتے ہیں اور پھر دوبارہ درخواست لیتے ہی نہیں ہیں اور نہ ہی داخلہ کی تاریخ میں کوئی توسیع کرتے ہیں۔پھر میں نے درخواست کی کہ مجھے یونیورسٹی ملازم کی حیثیت سے نہیں بلکہ عام طلبہ کا کوٹہ ہی دے دیا جائے۔یونیورسٹی کے خزانہ دار ابرار خاں صاحب نے بھی بڑی حمایت کی اور سٹیٹ بنک کو لکھ دیا کہ جونہی یونیورسٹی کا کوٹہ منظور ہوا وہ میرے حصہ کی رقم سٹیٹ بنک کو واپس کر دیں گے۔یہ ساری درخواست کراچی روانہ کر دی گئی جہاں سے یہ نامنظور ہو گئی۔میں سخت پریشان تھا۔لاہور کے سٹیٹ بنک کے متعلقہ افسر کو میری حالت پر رحم آ گیا اور اس نے کہا کہ میں آپ کو متعلقہ منظوری دے دیتا ہوں آپ جائیں میں بعد میں نمٹ لوں گا۔

زندگی میں میرا کوئی کام کبھی سیدھی طرح نہیں ہوا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں ہمیشہ چادر سے زیادہ پاؤں پھیلاتا ہوں۔اب تک میرا اعتماد اس حد تک متزلزل ہو چکا تھا کہ آخری وقت تک یہی ڈر رہا کہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ آگے آ جائے گی اور میرا جانا رک جائے گا۔ہوائی جہاز پر بھی مجھ پر یہ خوف طاری رہا کہ کہیں نہ کہیں سٹیٹ بنک کی طرف سے، گورنمنٹ کی طرف سے یا یونیورسٹی کی طرف سے یہ ہدایت پہلے سے ہی پڑی ہوگی کہ مجھے واپس لوٹا دیا جائے۔یہ خطرہ اس وقت تک قائم رہا جب تک میں لندن میں ہیتھرو ایئر پورٹ سے باہر نہیں آ گیا۔

سب سے بڑی مصیبت کیمبرج میں پہنچ کر اس وقت پیش آئی جب مجھے اپنی نااہلی اور کاروباری حساب کتاب سے قطعی ناواقفیت کا اندازہ ہوا جانے سے پہلے میں نے تمام اخراجات کا تخمینہ لگایا۔کیمبرج میں ایک سال میں تین ٹرمز ہوتی ہیں میں نے دیکھا کہ فی ٹرم

۸۰ پاؤنڈ فیس ہے۔ میں نے ٹرم کو سال سمجھا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ۸۰ پاؤنڈ تو صرف ایک ٹرم کے تھے۔ میں نے دو سال کے لیے ۱۶۰ پاؤنڈ کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ اب پتہ لگا کہ دو سال کی فیس کے لیے ۴۸۰ پاؤنڈ درکار ہیں جب کہ میرے پاس سارا انتظام کل ۱۶۰ پاؤنڈ کا تھا۔ بڑی مشکل پیش آئی۔ اپنے اخراجات کو بے انتہا کم کرنا پڑا۔ کچھ وقت دوستوں کے سہارے گزارنا پڑا اور پھر کچھ امدادِ غیبی بھی حاصل ہو گئی۔ اس ملک کے ساتھ ہمیشہ فراڈ ہوتے رہے ہیں۔ اس وقت بھی ایک فراڈ چل رہا تھا۔ ایک خاص اسکیم کے تحت سرکاری شرح پر پاؤنڈ ساڑھے گیارہ روپے کا ملتا تھا۔ جب کہ بازار میں اس کی قیمت ۲۳ روپے تھی۔ میں نے بھی اس قانونی فراڈ سے تھوڑا سا فائدہ اٹھایا۔ لندن میں سو پاؤنڈ بیچ کر اسی پیسے سے پاکستان سے ۲۰۰ پاؤنڈ آ جاتے تھے۔ اس طرح کچھ کفایت شعاری سے کچھ حکومت کی پالیسی کی مہربانی سے ایک سال آسانی سے کٹ گیا اب سوچتا ہوں کہ جن کے پاس ہزاروں، لاکھوں پاؤنڈ تھے انھوں نے کتنی کمائی کی ہو گی۔

میں ستمبر ۶۷ء کے آخری ہفتہ میں ایک اتوار کے روز کراچی سے لندن کے لیے سوار ہوا۔ میں نے خاص طور سے فلائیٹ بک کرائی تھی اس لیے کہ اسے کراچی سے تہران، ماسکو اور فرنکفرٹ کے راستہ لندن جانا تھا۔ اس زمانہ میں ماسکو جانا بہت مشکل تھا اور میں نے سوچا کہ اس طرح شاید کچھ تھوڑا بہت ماسکو دیکھنے کا موقع مل جائے۔ جہاز صبح ۸ بجے کراچی سے روانہ ہوا اور ایک گھنٹہ تہران میں قیام کر کے کوہِ قاف پر سے پرواز کرتے ہوئے ماسکو کے لیے روانہ ہوا۔ ماسکو کے ہوائی اڈے پر تقریباً سب ہی مسافروں کو یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ جہاز کو رن وے پر روک دیا گیا ہے اور اسے ایرپورٹ تک جانے کی اجازت نہیں ملی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس جہاز میں دو امریکی باشندے سفر کر رہے تھے جو یقیناً کوئی اہم افسر ہوں گے، ماسکو پر چند ایک لوگ اترے اور ایک پاکستانی طائفہ لندن کے لیے سوار ہوا یوں ماسکو کی ایک جھلک دیکھنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ البتہ فرنکفرٹ کے ہوائی اڈے پر

منظر ہی اور تھا۔ وزیٹرز گیلری میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا لیکن سب بالکل بت بنے ساکت کھڑے جہاز سے لوگوں کو اترتے دیکھ رہے تھے، یہ منظر بڑا عجیب اور کچھ ماورائی سا لگا۔ کراچی سے ہی ایک ایر ہوسٹس جو خاصی خوش شکل اور کسی حد تک نوعمر ہی تھی میرے ساتھ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتی رہی۔ تہران کے ہوائی اڈے پر بھی وہ میرے ہی ساتھ رہی۔ ماسکو پر بھی اس نے مجھ سے کہا کہ موقع لگا تو میں آپ کو ایرپورٹ لے چلوں گی لیکن ہوائی اڈے کے اہلکاروں نے جہاز کے عملہ کو بھی نیچے اترنے کی اجازت نہیں دی۔ فرنکفرٹ کے ہوائی اڈے پر بھی وہ میرے ساتھ ساتھ اور کافی مانوس سی نظر آتی تھی۔ تب خود ہی اس نے مجھے بتایا کہ جہاز کا کپتان اس پر بری طرح مرتا ہے اور وہ اس طرح میرے ساتھ حل مل کر اسے جلا رہی ہے۔ پھر اس کا ایک مقصد اور بھی تھا۔ اس نے مجھ سے اپنے متعلق ایک بہت ہی زوردار رپورٹ لکھوائی اس نے مجھے اپنا لندن کا پتہ بھی دیا۔ لیکن جیسے ہی جہاز لندن کے ہوائی اڈے پر اترا وہ غائب ہو گئی اور پھر کبھی نہیں ملی۔ فرینکفرٹ سے اڑ کر جہاز لندن کی طرف روانہ ہوا۔

....

(۴)

دیارِ فرنگ میں

لندن ابھی میرے لیے کہانیوں اور خوابوں کا شہر تھا یا اس کی کچھ تصویریں دیکھی تھیں یا کہانیوں میں اس کے متعلق پڑھا تھا۔ یوں تو ساری دنیا دیکھنے کے بعد اب یہ تجربہ ہوا کہ کوئی حقیقت کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو تخیل کے پیدا کیے ہوئے تصور جس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چاہے وہ نیویارک اور پیرس ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تخیل کا ماضی ہمیشہ ہمیں حقیقت حال سے بہت زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔ البتہ ایک شہر ایسا تھا جو بالکل خیالوں کی طرح حسین لگا۔ اس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ اس کے متعلق پہلے بہت ہی کم پڑھا یا سنا تھا اور اس کی کوئی خیالی تصویر ذہن میں نہیں تھی۔ کسی انگریز ادیب نے کہا تھا کہ تاج محل کا حسن تخیل کو بھی مات کرتا ہے مگر وہ بھی مجھے اتنا خوبصورت نہیں لگا جتنا میں نے سوچا تھا اور لندن نے تو بہت ہی مایوس کیا۔ پہلے تو برٹش چینل (اسے صرف انگریز ہی برٹش چینل کہتے ہیں) پر سے گزرنے کے بعد جہاز جب ذرا نیچے ہو کر مضافات لندن سے گذرنے لگا تو یہ شہر ایسا لگا جیسے ہم فوجی بارکوں کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ تقریباً سارے مکان ہی ایک جیسے نظر آ رہے تھے۔ میں نے سوچا یہ تو لندن کے باہر کے علاقے ہیں۔ اصل شہر زیادہ پرشکوہ ہوگا۔ لیکن جب لندن میں گھومنے پھرنے کا اتفاق ہوا تو شہر کا تاثر کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

لندن کے ہیتھرو ٹرمنل پر مجھے زیادہ دیر نہیں لگی گو کہ میں مسلسل ڈرتا رہا کہ راستے میں ہی کہیں سے مجھے واپس پاکستان بھیج دیا جائے گا مگر مجھ سے کہیں بھی کچھ پوچھ گچھ نہیں ہوئی اور میں ہوائی اڈے سے باہر آ گیا۔ یہاں میرے ایک بہت ہی عزیز دوست بدرالاسلام سید

اپنی جرمن نژاد بیوی والٹروڈ کے ساتھ میرے منتظر تھے۔ انھیں بڑی حیرانی تھی کہ میں اتنی جلد کیسے باہر آ گیا جب کہ پاکستان سے آنے والوں کی چیکنگ میں اکثر کئی گھنٹے لگ جاتے تھے۔

ہوائی اڈے میں ہم بدر اور والٹروڈ کے ساتھ ان کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ بھر پھر اسی قسم کی یکساں عمارتیں اور سڑکیں تھیں۔ شہر میں اس قدر یکسانیت تھی کہ متلی سی محسوس ہوتی تھی۔ البتہ شہر اور سڑکیں صاف ستھری تھیں اور ماحول عام طور پر خاصا پرسکون تھا۔ لاہور یا کراچی کا ہمارا مشاہدہ تو یہ تھا کہ یہاں کوئی بھی دو مکان ایک جیسے نہیں تھے اور ان گھروں میں اس کے برعکس ایک یکرنگی محسوس ہوتی تھی۔ تاہم لندن کے متعلق اتنا کچھ سنا ہوا تھا کہ مجھے پورا یقین تھا کہ جو علاقے میں نے دیکھے تھے وہ لندن نہیں تھے اور اصل لندن یقیناً بہت خوبصورت ہوگا۔

گھر پہنچے تو والٹروڈ نے بڑے اچھے پاکستانی کھانے بنائے ہوئے تھے لیکن اسے روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔ میں نے کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں میں نے بھی پہلے کبھی روٹی نہیں پکائی تھی۔ بدر صاحب بازار سے آٹا لے آئے اور میں نے گوندھ کر روٹی بنائی تو بہت اچھی بنی اور بعد میں مجھے لندن میں روٹی بنانے کا ایکسپرٹ سمجھا جانے لگا اور بھی کئی دوستوں کی یورپی بیویاں تھیں ان کے ہاں دعوت ہوتی تو روٹی میں بناتا۔ پھر انھیں بھی سکھا دیتا۔ اس کے بعد کیمبرج میں بھی میں نے اپنے دوستوں کو روٹیاں پکا کر کھلائیں وہاں کئی پاکستانی ہندوستانی ہوٹل تھے جہاں ایک چھوٹی سی روٹی ایک شلنگ یا کوئی سوا روپے میں ملتی تھی جب کہ پاکستان میں اس سے کہیں بڑی روٹی اس وقت صرف ایک آنے میں ملتی تھی۔

ابھی میرا لندن میں دوسرا ہی دن تھا کہ بدر صاحب کو تیز بخار ہو گیا اور یوں لندن دیکھنے کا پروگرام ملتوی ہو گیا۔ لندن دیکھنے سے بھی بہت زیادہ ضروری ایک اور کام تھا۔ میرے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد میرے ایک عزیز کا ٹیلیفون آیا کہ میرے رشتے کے ایک چچا کا جمعہ کی شام کو انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی میت کو مردہ خانے میں رکھوا دیا گیا تھا اس لیے کہ وہاں کے

قانون کے مطابق میت کو گھر میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ چوں کہ لندن میں ہفتہ اور اتوار کو چھٹی ہوتی ہے اس لیے تجہیز وتکفین پیر کے روز نو بجے صبح ہونی تھی۔ ان کا گھر سڑتھم میں تھا۔ میں رات کو پتے اور بسوں کے نمبر پوچھ کر اکیلا ہی وہاں پہنچ گیا۔ وہاں کافی عزیز جمع تھے۔ یہ ایک نئی طرح کی تعزیت تھی کہ سوگوار وہاں تھے لیکن میت وہاں نہیں تھی۔ صبح مردہ خانے پہنچنے کا وعدہ کر کے میں واپس آ گیا۔ اگلی صبح مجھے پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ میت جا چکی تھی۔ قبرستان کا پتہ پوچھا اور وہاں پہنچا تو وہاں سے بھی سب لوگ جا چکے تھے۔ البتہ ایک تازہ قبر وہاں بنی ہوئی تھی۔ غالباً وہی اُن کی قبر تھی، یوں تین روز تک میں لندن کے باہر ہی باہر پھرتا رہا۔ لیکن دو ہی دن میں لندن میں اتنا پھر لیا کہ لگتا تھا برسوں سے یہیں رہ رہا ہوں۔ بول چال میں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ بس کنڈکٹروں کی انگریزی تو کوئی اور زبان ہی لگتی تھی اور بہت دنوں کے بعد ہی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی۔

ایک روز میں ہاؤنسلو گیا تو کچھ دقت پیش آئی۔ ایک دکان پر میں نے پوچھا کہ آپ کے پاس بلیڈ ہیں۔ وہاں نوعمر لڑکیاں دکان سنبھالے ہوئی تھیں۔ میں نے جس لڑکی سے پوچھا اسے میری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ دوسری لڑکی کو بلا لائی۔ میں نے پھر اس سے کہا کہ مجھے شیونگ بلیڈ چاہئیں تو اس نے جواب دیا ''وی ڈانٹ ڈاؤ رائزرز'' اس نے دو تین دفعہ دہرایا تو میں سمجھا کہ وہ کہہ رہی ہے ''وی ڈاؤٹ ڈاؤ رائزرز'' (We don't do razors) ایک تو انگریزی غلط، پھر تلفظ بھی غلط۔ پتہ لگا کہ انگریزوں کو تو بالکل انگریزی نہیں آتی۔

بدر صاحب کا گھر ہیسٹن ولیج میں تھا جو ایک صاف ستھری اور خاموش پر سکون جگہ ہے اکثر مکان کوئی ۱۲۰ گز میں بنے ہوئے ہیں اور دو منزلہ ہیں ان کے گھر میں سامنے کی طرف ایک دروازہ اور ایک گیراج تھا۔ دروازے میں ہی کچن بنایا گیا تھا اس طرح کہ مشرق دیوار کے ساتھ ساتھ چولھے اور فرج وغیرہ تھے جنھوں نے آدھی جگہ گھیری ہوئی تھی اور باقی آدھا

حصہ ایک لمبی سی گذرگاہ تھی۔ گیراج کے اوپر غسل خانہ اور کچن کے اوپر ایک کمرہ تھا۔ اندر جا کر ایک ڈرائنگ روم تھا جن کے اوپر ایک کمرہ اور ایک غسل خانہ تھا۔ ڈرائنگ روم میں سے ہی ایک زینہ اوپر دونوں کمروں کو جاتا تھا۔ گھر چھوٹا مگر صاف ستھرا اور آرام دہ تھا اور نیا ہی بنا ہوا تھا۔ پہلے روز مجھے ہیسٹن سے سڑتھم جانا پڑا اور تین روز تک یوں ہی آنا جانا ہوتا رہا اور یوں لندن آنے کے بعد میں تین روز لندن سے باہر باہر ہی پھرتا رہا۔ یہاں بھی مکان تقریباً ایک جیسے ہی تھے۔ لگتا تھا ایک ہی ٹھیکیدار نے بنائے ہوئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ تقریباً ہر تیسرے مکان پر FOR SALE کی تختی لگی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ سارا لندن ہی برائے فروخت ہے لندن کی گلیاں اور سڑکیں بہت صاف ستھری تھیں اور سڑکوں پر ٹریفک بھی بہت نظم اور احتیاط سے رواں تھی۔ تین روز کے بعد میں اپنے چچا کے سوئم وغیرہ سے فارغ ہوا اور بدر صاحب کی صحت بھی بحال ہوگئی میں بدر اور والٹر روڈ کے ساتھ لندن کے مرکزی علاقہ میں گیا۔ یہ بھی کوئی ایسا خاص خوبصورت نہیں تھا۔ صفائی تھی، نظم وضبط تھا۔ مگر کوئی شان وشکوہ نہیں تھا۔ ٹرافلگر سکوئر میں فوارہ، درمیانی ستون اور اس پر بنا ہوا بت اور چاروں طرف کی بڑی بڑی عمارتیں صدیوں کا دھواں کھا کھا کر سیاہ ہوگئی تھیں۔ البتہ ذرا آگے جا کر ویسٹ منسٹر کا علاقہ تھا جہاں سرکاری عمارتیں، پارلیمنٹ ہاؤس، بڑا سا گھنٹہ گھر ''بگ بین'' اور ویسٹ منسٹر کا گرجا کچھ بہتر تھے۔ (ویسٹ منسٹر میں انگلستان کے بڑے بڑے مشاہیر دفن ہیں)۔ تقریباً سارا لندن ایک عجیب سی سیاہی میں لپٹا ہوا تھا۔

لندن کی ایک اہم خصوصیت وہاں کی زیر زمین ریلوے سروس کا نظام ہے۔ یہ بہت سبک رفتار اور جلد جلد آنے جانے والی سروس ہے۔ البتہ جب ریل سرنگوں میں سے گذرتی ہے تو دھول اڑتی ہے اور بڑا شور مچتا ہے حالانکہ ڈبے پوری طرح Airtight ہوتے ہیں۔ ایک دو مقامات پر تو تین تین سٹیشن اوپر نیچے بنائے گئے ہیں جن پر مسافر برقی زینوں سے آتے جاتے ہیں۔ اوپر زمین پر صبح ہوتے ہی لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا ہے جو دو تین منٹ کے اندر اندر زمین

میں غائب ہو جاتا ہے۔اسی طرح شام کے وقت سنسان سڑک ایک دم ہجوم سے بھر جاتی ہے اور منٹوں میں یہ ہجوم صاف ہو جاتا ہے اور ایک نیا ہجوم اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

دفتروں، فیکٹریوں اور مکانوں کے اوقات اس طرح مقرر کیے گئے ہیں کہ سب دفتر ایک ہی وقت نہیں کھلتے اور نہ بند ہوتے ہیں بلکہ وقفے وقفے سے کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔یوں کسی ایک وقت میں سارا ہجوم اکٹھا نہیں ہوتا۔ٹی ایس ایلیٹ نے اس کے لیے بڑا صحیح استعارہ استعمال کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ زمین ایک بلا (Dragon) کی طرح صبح لوگوں کو نگل لیتی ہے اور شام کو انھیں اگل دیتی ہے۔

لندن کی دنیا ہماری دنیا سے بہت مختلف ہے۔وہاں سڑکوں پر جو منظر نظر آتے ہیں ہمارے ہاں ممکن نہیں بلکہ تصور میں بھی نہیں آسکتے۔انفرادی آزادی کا اس قدر احترام ہے کہ باغوں اور پارکوں میں ہی نہیں بلکہ سڑکوں اور پٹریوں پر مرد اور عورت بوس و کنار میں محو نظر آتے ہیں بلکہ ہم آغوشی میں لیٹے ہوتے ہیں۔کوئی ان کی طرف دیکھتا بھی نہیں بلکہ لوگ ان سے بچ کر اوراوپر سے چھلانگ لگا کر گزرتے رہتے ہیں۔گرمی کا موسم ہو تو خواتین کم سے کم لباس میں بازار میں چلتی پھرتی نظر آجاتی ہیں۔سمندر کے کنارے تفریح گاہوں کا حال دوسرا ہی ہوتا ہے۔سینکڑوں تعداد میں نیم برہنہ مرد عورت یہاں سے وہاں تک دھوپ کا غسل لیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور آنے جانے والوں کو ان پر سے چھلانگیں لگا کر گزرنا پڑتا ہے۔شہر کے ایک بہت ہی گنجان علاقہ میں ایک روز میں نے ایک لڑکی کو زاروقطار روتے ہوئے دیکھا۔کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔تھوڑی دیر میں اندر سے ایک لڑکی آئی اور اس کو تسلی تشفی دیتے ہوئے ایک طرف کو لے گئی، اسی طرح ایک روز آکسفورڈ سٹریٹ میں ایک ہندوستانی لڑکی تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک دکان سے نکلی اس کے پیچھے ایک بڑی عمر کی میم، جو غالباً سیلز وومن تھی۔چلاتی ہوئی دوڑی ''چور۔چور۔پکڑو'' لوگ دونوں کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے گذر گئے کسی نے رک کر انھیں دیکھنے تک کی تکلیف نہیں کی۔ایک لڑکی کو سخت زکام تھا وہ بار بار ٹشو پیپر

سے اپنی ناک پونچھتی اور ٹشو اپنے بیگ میں جمع کرتی جاتی۔صفائی کا یہ احساس ہمارے ہاں ناپید ہے۔

یہاں بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور ہیں۔ان میں دنیا بھر کی ہر چیز مل جاتی ہے اور کھلی الماریاں ہوتی ہیں۔گاہک خود اپنی پسند کی چیزیں چن لیتے ہیں اور کاؤنٹر پر قیمت ادا کر دیتے ہیں۔ویسے سیلز گرلز اور سیلز مین بھی ان کی مدد کے لیے وہاں موجود رہتے ہیں۔یہاں چوریاں بھی بہت ہوتی ہیں۔اسی لیے ان میں بہت سے نگہدار ہوتے ہیں اور خفیہ کیمرے بھی لگے ہوتے ہیں۔پھر بھی چوریاں ہو جاتی ہیں۔خاص طور پر کرسمس کے دنوں میں۔ٹی وی پر ایک روز لندن کے بہت بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور کے منیجر کا انٹرویو آیا۔اس سے پوچھا گیا اگر اتنی چوریاں ہوتی ہیں تو پھر آپ الماریاں بند کیوں نہیں رکھتے تاکہ گاہک ان تک پہنچ ہی نہ سکیں۔اس نے جواب دیا کہ اکثر گاہکوں میں اتنی جھجک ہوتی ہے کہ وہ سیلز گرل یا سیلز مین سے بات ہی نہیں کریں گے۔پھر لوگوں کی ضروریات بھی ایسی ہوتی ہیں کہ وہ دوسروں کو سمجھانی مشکل ہوتی ہیں۔میرے ایک دوست کی بیوی جو جرمن نژاد تھی اس کا ایک پاؤں بڑا اور ایک چھوٹا تھا۔چنانچہ وہ دو مختلف سائز کے جوڑوں میں سے جوتے لے کر اپنے جوتوں کا جوڑا بناتی تھی۔کھلی ہوئی شیلفوں سے چیزوں کے انتخاب میں بڑی مدد ملتی ہے اور یوں گاہک کچھ نہ کچھ خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس زمانے میں لندن میں ایک افواہ خاصی گرم تھی۔ایک پاکستانی سیلز مین نے ہزاروں پاؤنڈ کی ہیرا پھیری کی تھی۔وہ رسیدوں میں گڑبڑ کرتا تھا۔جب سٹور والوں نے محسوس کیا کہ ایک ڈیپارٹمنٹ کی بکری (سیل) ایک دم سے بہت کم ہو گئی ہے تو انھیں شک ہوا۔فرضی گاہک بنا کر بھیجے گئے اور یوں فراڈ پکڑا گیا۔سٹور والوں نے اس کے خلاف کوئی قانونی کاروائی نہیں کی۔صرف اس ڈر سے کہ اس طرح سٹور کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا۔صرف اسے ملازمت سے نکال دیا گیا۔جتنی چوریاں ہوتی ہیں انھیں بھی خرچہ کی مد میں ڈال دیا

جاتا ہے۔اس سے پتہ لگتا ہے کہ ان کا طریق کار کتنا کاروباری ہے۔

لندن میں تھیٹر بہت مقبول ہے۔سینما اتنے مقبول نہیں۔کبھی کبھی کوئی اچھی فلم آجاتی ہے تو سینما پر بھی لمبی لمبی لائنیں لگ جاتی ہیں ورنہ سینما ہال اکثر خالی ہی پڑے رہتے ہیں۔اس کے برعکس تھیٹر میں سیٹ ریزرو کرانے کے لیے کئی کئی مہینہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔چنانچہ لندن میں میں نے شیکسپیر سے لے کر بیکٹ اور پنٹر Pinter تک کے نئے پرانے بہت سے ڈرامے دیکھے۔موسیقی کے بھی کئی کنسرٹ دیکھے۔خصوصاً Choral Hymns یا مذہبی گیتوں کی محفل سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔

میں غالباً ۲۰ اگست کو لندن پہنچ گیا تھا۔لیکن کیمبرج میں ٹرم چوں کہ ۱۸ اکتوبر سے شروع ہوتی تھی اس لیے میں ۷ اکتوبر تک لندن میں ہی رہا۔

لندن میں رہنے والے پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی حالت خاصی قابلِ رحم ہے۔یہی حال دوسرے ملکوں اور خصوصاً امریکہ میں پاکستانیوں کا ہے۔وہ گھر کے لیے تڑپتے ہیں لیکن واپس نہیں جاسکتے۔ایک محفل میں ایک ہندوستانی نوجوان ملے جو زاروقطار رو رہے تھے ہندوستان میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا اور وہ جا نہیں سکتے تھے۔شاید غیر قانونی طور پر انگلستان آئے ہوئے تھے۔جنھوں نے قانونی ذرائع سے نقل مکانی کی تھی ان کی صورت حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔وہ وطن آتے جاتے تو رہتے تھے لیکن مستقلاً واپس نہیں جاسکتے تھے۔ان میں دو قسم کے لوگ تھے۔ایک وہ جو مالی خوش حالی کے خواب دیکھتے ہوئے آئے تھے لیکن ان کے یہ خواب پورے نہیں ہوئے تھے۔وہ خود اپنے آپ سے خوش نہیں تھے۔ان میں میرے بھی ایک بہت قریبی دوست تھے جو بڑے طمطراق سے لندن آئے تھے۔اس وقت ابھی ہم F.A. کے طالب علم تھے یہاں آکر وہ بالکل ہی گم ہوگئے۔ان کے گھر سے ان کا پتہ لے کر میں نے کئی خط لکھے مگر ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔لندن پہنچ کر میں ان کے گھر کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔وہ ویمبلے کے قریب (وہی ویمبلے جہاں فٹ بال کے میچ ہوتے

ہیں) ایک چھوٹی سی گلی میں رہتے تھے جس میں تقریباً سارے پاکستانی یا ہندوستانی تھے۔گرمیوں کے دن تھے۔جس وقت میں وہاں پہنچا تو وہ کچھا اور بنیان پہنے ہوئے بیرونی دیوار پر سفیدی کر رہے تھے۔مجھے دیکھ کر وہ بہت پریشان ہوئے۔تھوڑی دیر میں انھوں نے اپنے حواس درست کیے اور بولے کہ یہاں تو ایسے ہی کام کرنے پڑتے ہیں۔یہاں پاکستان کی سی شاہانہ زندگی ممکن نہیں۔لاہور میں تو وہ کبھی سوٹ کے بغیر گھر سے نہیں نکلتے تھے اور اس پر ایک شکن نہیں پڑنے دیتے تھے۔پھر وہ مجھ پر برس پڑے۔انھیں اس بات کا غصہ تھا کہ میں انگریزی ادب کیوں پڑھ رہا ہوں سائنس کیوں نہیں پڑھ رہا، پاکستان کو سائنس دانوں کی بہت ضرورت ہے۔مجھے احساس تھا کہ وہ اپنی ندامت مٹانے کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔بعد میں بھی میں نے کئی مرتبہ ان سے رابطے کی کوشش کی لیکن پھر مجھے احساس ہوگیا کہ وہ مجھ سے کتراتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ تھے جو مالی حیثیت سے خاصے اچھے تھے لیکن گھر کے ماحول کو عزیزوں دوستوں کی محبتوں کو ترستے تھے۔ایک وجہ تو یہ تھی کہ اپنی جس شان و شوکت کا انھوں نے گھر والوں پر سکہ بٹھایا ہوا تھا وہ پاکستان میں ممکن نہیں تھی۔دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ بچوں کی تربیت کی طرف سے بہت پریشان تھے۔خاص طور سے بیٹیوں کی طرف سے جن پر وہاں کے ماحول میں ان کا کوئی زور نہیں تھا۔میں نے سنا کہ ایک پاکستانی لڑکی نے ایک سکھ سے شادی کر لی۔والدین نے سختی کی تو اس نے پولیس میں رپورٹ کر دی۔مختصر یہ کہ سب واپس آنا چاہتے ہیں لیکن آ نہیں سکتے۔دوسرا ردعمل یہ بھی ہوا کہ وہاں جا کر لوگ کچھ زیادہ ہی مذہبی ہوگئے۔یہ ایک اجنبی معاشرے میں ایک مدافعتی ہتھیار بھی ہے اور ذہنی پریشانیوں میں سکونِ دل کے حصول کا ایک ذریعہ بھی۔

ٹرم کے شروع ہونے سے پہلے ایک روز میں بدر اور والٹر وڈ کے ساتھ کیمبرج گیا۔اپنی تاریخی حیثیت میں اور ایک "عظیم" ہوارہ علم ہونے کے علاوہ کیمبرج انگلستان کا

خوبصورت ترین شہر ہے۔ ویسے تو باتھ، لیک ڈسٹرکٹ اور ونچسٹر وغیرہ بھی اپنے اپنے مقام پر بہت خوبصورت ہیں لیکن کیمبرج کا لطف کچھ اور ہی ہے۔ یہاں بڑے خوبصورت کالج اور گرجا گھر ہیں اور خوبصورت پریڈز ہیں۔ خاص طور سے یہاں کی Backs یعنی دریا پار کے علاقے بہت ہی سرسبز اور وسیع ہیں۔ ان کی خوبیاں گنوانے کے لیے ایک علیحدہ باب چاہیے۔ بہر حال ہم ریل سے کیمبرج گئے اور فٹز ولیم کالج پہنچے۔ کالج کی عمارت نئی ہے لیکن اس کا نقشہ اور در و دیوار اس طرح بنائے گئے ہیں کہ یہ پرانے کالجوں کی عمارتوں میں بالکل گھل مل گئی ہے۔ یہ تقریباً ۷۰۰ سال پرانی ایک درس گاہ ہے۔ انیسویں صدی تک یہ درس گاہ صرف مردوں کے لیے تھی۔ پھر پہلا زنانہ کالج بنا۔ وہ شہر سے کوئی تین میل باہر تھا۔ گرٹن کے بعد دوسرا زنانہ کالج Newnham بنا جو باقی کالجوں سے کچھ علیحدہ تھا۔ آخر میں New Hall بنا جو مردوں کے کالجوں کے عین بیچ میں تھا اور اب تو تمام کالجوں میں مخلوط رہائش ہے۔ اس طرح وقت کے گزرنے کے ساتھ ثقافتی تبدیلیوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک قدامت پسند معاشرہ آہستہ آہستہ ایک ترقی پسند معاشرہ میں تبدیل ہوا۔

غرض ہم فٹز ولز ولیم کالج پہنچے۔ وہاں ہال میں ایک بجن ہول میں طلباء کی ڈاک رکھی ہوئی تھی۔ ایک خانہ کے اوپر میرا نام بھی لکھا ہوا تھا اور اس میں میری ڈاک تھی۔ ایک دو خط پاکستان سے آئے ہوئے تھے۔ ٹائم ٹیبل تھا۔ مختلف کورسز کی تفصیل تھی۔ پورے سال کا پروگرام تھا، حتیٰ کہ آئندہ برس ہونے والے امتحان کی ڈیٹ شیٹ اور نتائج کی تاریخ کا اعلان بھی تھا۔ کتنا زبردست انتظام تھا۔ پورے سال کی علمی غیر نصابی اور کھیلوں کی سرگرمیوں کی پوری تفصیل تھی جس سے کبھی سرمو انحراف نہیں ہوتا تھا ہر چیز اعلان کے مطابق ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ کالج میں سرگرم عمل متعدد سیاسی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی انجمنوں کی طرف پمفلٹوں کے علاوہ دعوت نامے بھی تھے۔ ڈنرز کی دعوتیں بھی تھیں ساتھ ہی رہنے کے فلیٹ کے الاٹمنٹ کی اطلاع بھی تھی۔ طلباء کی رہائش کے کمرے یہاں DIGS کہلاتے تھے۔ میرا کمرہ دریائے

کیم کے بالکل اوپر دوسری منزل پر تھا اور اس کی کھڑکی دریا کی طرف کھلتی تھی۔ بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔

لندن واپس آ کر ایک ہفتہ دوستوں اور عزیزوں سے ملنے ملانے میں گذرا۔ ان کی خاصی تعداد لندن میں مقیم تھی۔ پھر نئی دوستیاں بھی قائم ہوئیں۔ لندن کے عجائب گھر، اہم عمارات مادام تسو کا موم گھر اور ایک دو تھیٹر کے کھیل بھی دیکھے غالباً ایک بیکٹ کا ویٹنگ فار گوڈو تھا یا شاید کوئی اور ایبرڈ پلے تھا۔ یوں ۷ اکتوبر کو میں کیمبرج پہنچا ۸ اکتوبر کو رجسٹریشن ہوئی اور Freshmen کی تصویر کھنچی اور اگلے ہی روز سے باقاعدہ ٹرم کا آغاز ہو گیا۔

کیمبرج جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ایک بہت ہی سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ اس کا مقابلہ آکسفورڈ سے ہوتا ہے۔ اس کی اور آکسفورڈ کی عمارات ایک دوسرے سے کافی حد تک ملتی جلتی ہیں۔ کیمبرج فطری حسن سے مالا مال ہے۔ یہاں کوئی انڈسٹری نہیں ہے۔ یہاں کے شہریوں کے لیے یہ تکلیف دہ بات ہے کیوں کہ ان کے لیے سوائے یونیورسٹی سے متعلق خدمات کے اور کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ گرد و نواح کی تمام زمین یونیورسٹی کی ملکیت ہے جو یہاں کسی صنعت کو قائم نہیں ہونے دیتی اسی لیے یہاں طلباء اور شہریوں کے درمیان کبھی کبھی ہنگامہ آرائی بھی ہو جاتی ہے۔ ٹاؤن اور گاؤن کے یہ جھگڑے کبھی کبھی بہت شدت اختیار کر جاتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں فسادات تک بھی ہو جاتے ہیں۔

کیمبرج کے قدیم کالج دریائے کیم کے مشرقی کنارے پر بنے ہوئے ہیں۔ جب کہ دریا پار کا علاقہ Backs بیکس کہلاتا ہے۔ یہ بڑے بڑے سرسبز میدانوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کچھ سٹڈ فارم بھی ہیں اور کیمبرج کے طلباء و طالبات یہاں گھوڑے سواری کے لیے آتے ہیں۔ ہم نے بھی کچھ انگریز دوستوں کے ساتھ شہ سواری کا سلسلہ شروع کیا۔ مجھے یاد ہے کہ بہت بچپن میں دو چار دفعہ گھوڑے پر سواری کا موقع ملا تھا۔ لیکن اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ کوئی سات آٹھ برس کا اب برسوں بعد میں نے گھوڑے پر سواری کی کوشش کی تو عجب مضحکہ

خیز صورت حال پیدا ہوئی۔ گھوڑے پر ٹھیک سے بیٹھا ہی نہیں جاتا تھا اور میں اِدھر اُدھر جھونکے کھا رہا تھا۔ بڑی ہی شرمندگی اس وقت ہوئی جب گھوڑے کی مالک ایک چودہ، پندرہ سال کی لڑکی نے مجھے جم کر گھوڑے پر بیٹھنے کا طریقہ سکھایا۔

کیمرج کا نام دریائے کیم پر رکھا گیا ہے جو شہر کے درمیان سے گذرتا ہے۔ اس کی چوڑائی پاکستان کی کسی چھوٹی سی نہر سے زیادہ نہیں اور یہ اتنا دھیرے بہتا ہے کہ چلتا ہوا محسوس ہی نہیں ہوتا دریائے کیم پر سب سے مقبول تفریح پنٹنگ Punting ہے۔ پنٹ ایک چوڑی سے ہموار فرش کی کشتی ہوتی ہے جس کے دونوں سرے چوکور ہوتے ہیں اور جسے ایک لمبے سے بانس کی مدد سے دھکیل کر چلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کشتی رانی کے مقابلے بھی ہوتے ہیں جن کا نکتۂ عروج لندن میں آکسفورڈ اور کیمرج کے درمیان کشتیوں کی دوڑ ہوتی ہے۔ اس میں سارا لندن دو حصوں میں بٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک ہلکے نیلے رنگ کے لباس اور بلیزرز پہنے ہوئے کیمرج کے مداح ہوتے ہیں اور دوسری طرف گہرے نیلے رنگ والے آکسفورڈ کے حمایتی۔ لندن میں یہ دن تقریباً ایک قومی تہوار کی سی اہمیت رکھتا ہے کیمرج لندن کے مشرق میں کوئی ساٹھ میل کے فاصلہ پر ہے اور اتنے ہی فاصلہ پر مغرب میں آکسفورڈ ہے۔ کیمرج اور آکسفورڈ کا درمیانہ فاصلہ بھی تقریباً ۶۰ میل ہی ہے۔

کیمرج بلاشبہ انگلستان کا خوبصورت ترین شہر ہے۔ یہ کالجوں کا شہر ہے جس میں قدیم ترین کالج کوئی سات سو سال پرانا ہے۔ انگریزوں کو اپنی روایات سے بڑی عقیدت ہے اور وہ انھیں بڑے شوق اور بڑی محنت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹرینٹی کالج یہاں کا سب سے ممتاز کالج ہے۔ اکثر شاہی خاندان کے افراد اسی کالج میں آتے ہیں۔ میرے کیمرج میں قیام کے دوران شہزادہ چارلس اسی کالج میں تھے۔ ایک پاکستانی کو اس کالج کا ایک کمرہ الاٹ ہوا تو کالج کے ماسٹر نے اسے مبارک باد دی کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے کہ اسے وہ کمرہ دیا گیا ہے جس میں شاعر بائرن رہا کرتا تھا۔ لیکن اس نوجوان کو قدیمی روایات سے کوئی خاص

دلچسپی نہیں تھی۔ اس کمرے کی ایک پرانی دیوار جو بائرن کے زمانہ کی تھی ابھی تک قائم تھی اور اسے خاص طور سے محفوظ کیا گیا تھا جس نوجوان کو یہ کمرہ الاٹ کیا گیا تھا اس نے درخواست دی کہ اس کا کمرہ تبدیل کر دیا جائے اس لیے کہ اس کی پرانی دیوار میں اتنی نمی تھی کہ اسے زکام ہو گیا تھا۔

کیمرج کا نظام کچھ اس طرح ہے کہ وہاں کوئی ۲۵ سے زیادہ کالج ہیں۔ یہ کالج انتظامی حد تک کالج ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہوسٹل بھی ہوتے ہیں۔ لیکچرز اور کلاسز وغیرہ یونیورسٹی کے تحت ہوتے ہیں۔ ان کے لیے ایک مرکزی جگہ ہے جو کہ ایونیو کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ دو تین اور مقامات پر بھی کلاسیں لگتی ہیں۔ زیادہ تر پروفیسروں کا تعلق کالجوں سے ہوتا ہے جو سب یونیورسٹی میں لیکچر دیتے ہیں۔ کچھ یونیورسٹی پروفیسر بھی ہوتے ہیں سب طالب علم کسی نہ کسی کالج سے متعلق ہوتے ہیں۔ کالج ہی ان کی تدریس و رہائش اور نظم و ضبط کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر کالج میں جگہ نہ ہو تو کالج ہی طلبا کے لیے DIGS کا بندوبست کرتے ہیں۔ طالب علموں پر لازم ہے کہ وہ فل ٹرم کالج میں یا کالج کی طرف سے مہیا کی ہوئی DIGS میں گذاریں یہ راتیں اپنے کمروں میں گذارنی ضروری ہیں۔ شہر سے باہر جانے کی صورت میں ٹیوٹر سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ ایک ٹرم ۱۲ ہفتے کی ہوتی ہے جس میں سے ۸ ہفتے فل ٹرم کہلاتی ہے۔ اگر فل ٹرم کی راتیں وہاں نہ گذاری ہوں تو پھر ایک پوری ٹرم وہاں رہنا پڑتا ہے اور امتحان پاس کرنے کے باوجود ڈگری نہیں ملتی۔ اس کے برعکس امتحان پاس بھی نہ کیا ہو اور پوری ٹرمز گذاری ہوں تو پھر بھی ڈگری مل جاتی ہے۔ لیکن طالب علم کہیں بھی ہوں اتنی ڈسپلن برداشت نہیں کر سکتے۔ عام طور پر کالج میں Bed-makers (وہ لڑکیاں جو کمروں کی صفائی کرنے آتی ہیں) اور DIGS میں لینڈ لیڈیز ٹیوٹرز کو غیر حاضر طالب علموں کے نام مہیا کرتی ہیں۔ طالبِ علم اس رپورٹ سے بچنے کے لیے عجیب عجیب طریقے ڈھونڈتے ہیں۔ مثلاً وہ دن میں ہی بستر میں کچھ دیر کے لیے سو لیتے ہیں اور پھر رات باہر گذارتے

ہیں۔اس طرح یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ رات کو کمرے میں ہی سوئے تھے۔ہمارے ایک دوست ایک پوری رات شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہے اور بار بار سپاہیوں سے پکڑے جانے کے خطرے سے بھی دو چار ہوئے اس لیے کہ رات کو کمرے میں واپس آنے میں دیر ہوگئی تھی۔انھوں نے برابر کے کمرے پر کئی پتھر بھی مارے کہ شاید پڑوسی لڑکا اٹھ کر دروازہ کھول دے۔لینڈ لیڈی سے وہ اپنی غیر حاضری چھپانا چاہتے تھے۔

کیمرج میں کسی زمانے میں ایک دلچسپ Proctorial سسٹم ہوتا تھا۔اب صرف اس کی علامتی حیثیت ہے اور کبھی کبھی پراکٹر نظر بھی آ جاتے ہیں۔یہ پراکٹر Bull Dog کہلاتے ہیں۔ایک بل ڈوگ کے ساتھ دو شخص ہوتے ہیں۔ایک کے پاس بہت بڑا سا ایک رجسٹر ہوتا ہے اور دوسرے کے پاس بڑی بڑی زنجیریں ہوتی ہیں۔اگر کہیں کوئی طالب علم کوئی غلط حرکت کرتا ہوا مل جائے تو یہ اسے پکڑ لیتے ہیں۔رجسٹر سے اس کے جرم و سزا کا تعین کرتے ہیں اور زنجیریں اس کی گرفتاری کے لیے ہوتی ہیں۔مگر یہ ساری باتیں اب محض روایت ہی رہ گئی ہیں۔کیمرج میں ایک لطیفہ یہ بھی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ Bull Dog رات کے وقت ایک کمرے میں پہنچے تو وہاں ایک اور لڑکا بغیر اجازت کے آیا ہوا تھا۔اس زمانے میں سب طالب علم گاؤن پہنے ہوتے تھے۔اب یہ روایت بھی ختم ہوگئی ہے۔اس لڑکے نے ایک دم کھڑکی سے چھلانگ لگادی۔لیکن اس کا گاؤن دروازے میں پھنس گیا اور وہ گلی میں لٹک گیا۔بل ڈوگ نے پوچھا کیا کر رہے ہو تو وہ بولا "Just hanging around"۔

کیمرج کے نظام تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں لیکچر سسٹم ہے۔یونیورسٹی کو قومی ادارہ سمجھا جاتا ہے جو عوام کے پیسے سے چلتا ہے۔اس لیے ہر شہری کو اس سے استفادہ کرنے کا حق ہے۔چنانچہ لیکچر میں عام پبلک کو داخلے کی اجازت ہے۔اسی وجہ سے اکثر لیکچروں کے لیے بڑے بڑے ہال ہوتے ہیں جہاں لاؤڈ سپیکر کا استعمال بھی ہوتا ہے۔میرے

زمانے میں دو استاد بہت مقبول تھے۔ایک دائیں بازو کے،ایک بائیں بازو کے،ایک جارج سٹائز اور دوسرے ریمنڈ ولیمز۔ان کے لیکچرز میں ہال کھچا کھچ بھرے ہوئے ہوتے تھے۔دونوں کے عقیدت مند بڑی تعداد میں اور بڑے جوش اور جذبہ سے ان کی کلاسوں میں آتے تھے۔کچھ دوسرے مشہور اساتذہ مثلاً این رائٹر،ٹونی ٹینر،ائین جیک،بریڈ بروک اور بروڈبینٹ وغیرہ بھی تھے لیکن ان کی کلاسوں میں اتنی بھیڑ نہیں ہوتی تھی۔گو اچھی خاصی معقول حاضری ہوتی تھی۔پرانے لوگوں میں ایل سی نایٹ اور گراہم ہف تھے۔پھر ایف آر لیوس تھے اور ان کی بیگم بھی۔ان سب سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ریمنڈ ولیمز میرے سپروائزر تھے۔اس کے علاوہ وہ وہاں کنگز کالج میں کبھی کبھی لائبریری میں ای ایم فورسٹر بھی نظر آ جاتے تھے۔ان سے صرف ہیلو ہیلو ہی ہوسکی۔وہ بہت ضعیف ہوگئے تھے۔

کیمرج کے تعلیمی نظام کی اہم خصوصیت وہاں کا سپروائزری سسٹم ہے ہر طالب علم کو ایک سپروائزر کے سپرد کیا جاتا ہے۔یہ کام ٹیوٹر کرتے ہیں ہر ٹیوٹر کے زیر نگرانی طلباء کی ایک تعداد ہوتی ہے۔ٹیوٹر طالب علموں کی ہر طرح سے رہنمائی کرتے ہیں۔نصابی اور غیر نصابی دونوں معاملات میں،یہ ٹیوٹر صاحبان اپنے زیر نگرانی طالب علموں کے لیے سپروائزر مقرر کرتے ہیں۔سپروائزر حضرات ٹیوٹر کو طالبِ علم کے متعلق باقاعدہ ہفتہ وار رپورٹ بھیجتے ہیں۔کہیں بھی کوئی کمزوری یا اور کوئی اہم بات ہو تو ٹیوٹر طالب علم کو بلا لیتے ہیں اور مناسب ہدایات دیتے ہیں۔مثلاً ایک مرتبہ میرے ٹیوٹر نے مجھے مشورہ دیا کہ بایولوجی کے کچھ لیکچر لوں تا کہ ڈارون کے متعلق بہتر معلومات مل سکیں۔میرے کہنے پر انھوں نے ایک لیکچرار کی کلاسوں میں جانے کا مشورہ دیا۔سپروائزروں کو علیحدہ سے فی گھنٹہ کے حساب سے فیس دینی ہوتی ہے جو طالب علم دیتا ہے وہ بھی کالج کے اکاؤنٹ میں ہی جاتی ہے۔ایک وقت میں ایک سپروائز کے پاس ایک ہی طالب علم ہوتا ہے۔مختلف موضوعات کے لیے مختلف سپروائزروں کے پاس بھی جانا پڑتا ہے۔میرے ایک سپروائزر ایک نوجوان پوسٹ گریجویٹ طالب علم تھے جو

ڈاکٹریٹ کر رہے تھے ایک روز میں ان کے کمرے میں گیا تو باہر زبردست برف باری ہو رہی تھی۔ ان کی منگیتر وہاں آئی ہوئی تھی۔ میرا پہلے سے ہی اس سے تعارف تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ خاتون بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی اور میرے سپروائزر اس کی ٹانگوں میں سر دیے زمین پر بیٹھے تھے۔ میں ہیلو کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ یہی منظر رہا۔ پھر وہ خاتون اٹھی اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کافی پئیں گے میں نے خالص مشرقی تکلف کو برتتے ہوئے کہا۔ جی نہیں۔ وہ کچن میں گئی اور دو مگ کافی بنا کر لائی۔ ایک اپنے منگیتر کو دی اور دوسری خود پینے لگی، چند لمحوں کے بعد مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے کہا کہ یہ بڑی زیادتی ہے کہ میں برف باری میں چل کر آیا ہوں اور وہ مجھے کافی نہیں پلا رہی ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ نے تو انکار کر دیا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کو اصرار کرنا چاہیے تھا۔ کسی دعوت کو فوراً ہی قبول کرنا ہمارے ہاں بدتمیزی سمجھا جاتا ہے۔ وہ کچھ بھی کچھ نہیں سمجھی، لیکن اٹھ کر گئی اور میرے لیے بھی کافی بنا لائی۔

کچھ روز کے بعد میں ایک لیکچر کے لیے بج وک ایونیو جا رہا تھا کہ میرے نوجوان سپروائزر دوڑے ہوئے ''راضی، راضی'' چلاتے ہوئے میرے پیچھے آئے۔ میں حیران تھا کہ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ ہانپتے ہوئے بولے۔ ''راضی ایک بات بتاؤ کہ اگر کوئی دعوت سے انکار کر دے تو کتنا اصرار کرنا چاہیے'' میں نے کہا کہ زبردستی منہ میں ٹھوس دو۔ ''واقعی'' اس نے تعجب سے کہا۔ میں نے پوچھا کہ کیا کوئی ہندوستانی لڑکی مل گئی ہے؟ وہ جواب دیے بغیر لیکن بظاہر مطمئن ہو کر چلے گئے۔

سپروائزری سسٹم کیمبرج کے طریقۂ تعلیم کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ کلاسوں میں تو حاضری نہیں ہوتی لیکن سپرویژن سے غیر حاضری قطعی قابل معافی نہیں اور یہاں حاضری کا مطلب صرف ذاتی حیثیت سے حاضری نہیں بلکہ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو جو مضمون لکھنے کے لیے دیا گیا ہے اسے لکھ کر لائیں اور اس سلسلے میں سپروائزر حضرات کتنے سنجیدہ ہوتے ہیں

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میں نے اپنے سپروائزر کو لائبریری میں میرے اپنے مضمون کو جانچتے ہوئے دیکھا۔ وہ اصل کتابیں شیلفوں سے نکال نکال کر مضمون میں میرے دیے ہوئے حوالوں کی تصدیق کر رہے تھے۔

جہاں حصول علم کے متعلق اتنا سنجیدہ رویہ ہو وہاں یقیناً لائبریریوں کا انتظام بہت اچھا ہونا چاہیے۔ کیمبرج میں تین قسم کی لائبریریاں ہیں۔ سب سے اوپر یونیورسٹی لائبریری ہے جس کا شمار دنیا کی عظیم لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ پھر ہر ڈیپارٹمنٹ کی علیحدہ علیحدہ لائبریری ہے اور اس کے بعد ہر کالج کی اپنی ایک لائبریری ہے یہ لائبریری دن رات ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ رات کے تین بجے بھی میں گیا ہوں تو لائبریری کو کھلا ہی پایا اور دو تین طالب علم وہاں ضرور موجود ہوتے۔ یہاں تمام کتابیں کھلی الماریوں میں ہوتی ہیں۔ کتابوں کی چوریاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن چند غیر ذمہ دار لوگوں کی وجہ سے عام طالب علم کے لیے مشکلات پیدا نہیں کی جاتیں اور نقصانات اٹھانے کے باوجود لائبریری کو کھلا رکھا جاتا ہے۔

لائبریری کا سٹاف بھی طالب علموں کی ہر طرح سے مدد کرتا ہے۔ مجھے ایک تحقیقی مقالہ کے لیے کچھ حقائق درکار تھے۔ مثلاً میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ انیسویں صدی میں پیرس میں ''ہیملٹ'' کے کتنے شو ہوئے۔ لائبریرین نے چند کتابیں دیکھنے کے بعد مجھے اگلے روز آنے کے لیے کہا۔ میں اگلے روز گیا تو خاتون نے کہا کہ یہاں تو مجھے یہ کوائف نہیں مل سکے میں دوسری لائبریریوں سے پتہ کرتی ہوں آپ دو روز بعد آئیں۔ جب میں دو روز بعد لائبریری گیا تو مجھے مطلوبہ کوائف مل گئے۔ لائبریرین نے بتایا کہ یہ پیرس سے براہ راست حاصل کیے گئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا انٹر لائبریری سسٹم کتنا مستعد ہے۔ ان تینوں قسم کی سرکاری لائبریریوں کے علاوہ یہاں ذاتی لائبریریاں بھی ہیں۔ پھر آڈیو اور وڈیو کیسٹ لائبریریاں بھی ہیں۔

لائبریریوں کے بعد یہاں کی دوسری اہم خصوصیت بہت سی ڈرامیٹک سوسائٹیوں کا

قیام ہے۔ ہر کالج کی اپنی ڈرامیٹک سوسائٹی ہے پھر پرائیویٹ سوسائٹیاں بھی ہیں۔اس کے علاوہ لندن اور دوسرے شہروں سے ڈرامہ کمپنیاں آتی رہتی ہیں۔ چنانچہ بے انتہا ڈرامے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔قدیم یونانی ڈراموں اور ایلزبتھین ڈراموں کے ساتھ ساتھ یہاں جدید ترین ڈرامے بھی سٹیج کیے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ کنسرٹ وغیرہ بھی ہوتے رہتے ہیں جن میں کبھی کبھی ہندوستان اور پاکستان کے فن کار بھی اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔سینما بہت زیادہ مقبول نہیں سوائے اس کے کہ کبھی کوئی بہت ہی اچھی فلم آجائے تو ذرا رش ہوجاتا ہے۔البتہ یہاں کی ہندوستانی پاکستانی کمیونٹی کا ایک ہی شغل ہے۔ہر اتوار کو اردو یا پنجابی کی کوئی فلم ضرور لگتی ہے اور وہاں تقریباً سارے ہی مہاجروں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔پاکستان کی پنجابی فلمیں خاص طور سے مقبول ہیں۔

کھیلوں کے میدان میں بھی بہت سے مقامی اور بین الجامعاتی مقابلے ہوتے ہیں۔کیمرج صرف آکسفورڈ سے ہی مقابلہ کرتا ہے۔آکسفورڈ کیمرج کی دنیا ہی علیحدہ ہے۔دوسری یونیورسٹیوں کی یہاں کوئی اہمیت نہیں یہ دو یونیورسٹیاں Old Bricks اولڈ برکس کہلاتی ہیں جب کہ ان کے علاوہ اور یونیورسٹیوں کو ذرا کچھ حقارت سے ریڈ برکس کہا جاتا ہے اور جو یونیورسٹیاں بہت ہی جدید ہیں وہ گلاس ہاؤسز کہلاتی ہیں۔

کیمرج کے متعلق ایک بڑا دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ کیمرج کے ایک ڈان ایک امریکی سیاح کو کیمرج دکھا رہے تھے۔وہ کہتے یہ ٹرینٹی ہال ہے سات سو سال سے زیادہ پرانا امریکی بولے ہاں اچھا ہے۔پھر انھوں نے کہا یہ کنگز پیریڈ ہے۔وہ بولے یہ بھی ٹھیک، ہمارے ہاں اس سے بہت بہتر کالج اور یونیورسٹیاں ہیں۔غرض وہ کسی بات سے متاثر ہی نہیں ہوتے تھے کیمرج کے میزبان پروفیسر سخت دل برداشتہ تھے۔آخر ایک پرانے کالج کے پاس سے گذرتے ہوئے امریکی مہمان نے پوچھا کہ یہ دیواروں پر گھاس کیسے اگتی ہے۔کیمرج کے ڈان صاحب نے بڑی تمکنت سے فرمایا کہ یہ آپ کے امریکہ میں نہیں مل

سکتی۔ایک بلڈنگ جب سینکڑوں سال پرانی ہو جائے تب کہیں جا کر اس کی دیواروں پر سبزہ اگتا ہے۔

کھیل کے سیزن میں بھی یہ یونیورسٹیاں اپنی قدامت کو ملحوظ رکھتی ہیں کیمرج اور آکسفورڈ آپس میں ہی میچ کھیلتے ہیں۔رگبی، فٹ بال، ہاکی، کرکٹ، باکسنگ اور شہ سواری وغیرہ کے مقابلے ہوتے ہیں میرے ایک دوست روبک Roebuck نے آکسفورڈ کی ٹیم کو شہہ سواری میں شکست دے کر چیمپین شپ حاصل کی جب کہ دوسرے اور میرے قریب ترین دوست DavidCox باکسنگ کے چیمپین بنے۔آکسفورڈ کی ٹیم کیمرج آئی تھی اور وہاں بڑا زبردست مقابلہ ہوا۔بڑے زور وشور سے نعرے لگے۔ڈیوڈ کی بہن بھی آئی بہت خوبصورت لڑکی تھی کوئی ۲۲،۲۳ برس کی ہوگی۔میرے ہی کمرے میں چیمپین شپ کا جشن بھی منایا گیا۔راستہ بھر میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور بس میں بیٹھتے ہوئے کہا کہ بھائی اور ماں کو میرا اسلام کہنا مغرب کی دنیا ہماری دنیا سے بہت مختلف ہے میرے ایک دوست جیف ڈ تھے ان کی بیوی فران ڈوڈ تھی۔دونوں میں بہت محبت تھی۔جیف کیمرج میں پڑھ رہے تھے۔فران ایک سکول میں پڑھاتی تھی۔ایک روز جیف نے بڑے شرماتے اور جھجکتے ہوئے مجھ سے کہا کہ شاید یہ جان کر میں ان کے متعلق اچھی رائے قائم نہ کر سکوں کہ شادی سے پہلے بھی وہ میاں بیوی کی طرح رہتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے میاں اور بیوی میں روحانی اور جذباتی ہم آہنگی کے ساتھ جسمانی ہم آہنگی کا ہونا بھی ضروری ہے اس لیے بہتر ہے شادی سے پہلے ان تمام باتوں کے متعلق تسلی کر لی جائے۔میں نے کہا کہ میں آپ کے رسم ورواج اور طور طریقوں سے واقف ہوں اور مجھے یہ بات سن کر قطعی کوئی تعجب نہیں ہوا۔ستم ظریفی دیکھیے کہ چند برس بعد ہی جیف نے دوسری شادی کر لی جس کا دعوت نامہ اس نے مجھے بھی بھیجا۔

اکثر ہم Pubs میں اور کبھی کبھی کھانے پر بھی اکٹھے ہی ہوتے تھے۔ایک روز ہم

کیمرج کے بازار سے گذر رہے تھے کہ جیف نے فران کو بغل گیر کر کے ایک لمبا سا بوسہ دیا اور اسی طرح تقریباً ہم آغوشی میں وہ کوئی بیس بائیس قدم چلتے رہے۔ میرے لیے ایسے مناظر کوئی نئی بات نہیں تھے۔ خود ہی اس نے مجھے بعد میں بتایا کہ ایک دکان پر جس شوکیس کے آگے سے وہ گذر رہے تھے وہاں جوتوں کا ایک جوڑا رکھا ہوا تھا۔ میں نے فران سے وعدہ کیا تھا کہ سیل لگنے پر وہ جوتا اسے دلوادوں گا۔ اب سیل لگی ہوئی ہے۔ وہ جوتا ابھی تک اس شوکیس میں ہے اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے میں نے اس طرف اس کی نظر ہی نہیں جانے دی۔

پاکستانی اور ہندوستانی دوست تو تھے ہی لیکن انگریز دوستوں کے ساتھ زیادہ وقت گذرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ ہندوستانی اور پاکستانی نوجوانوں کا اکثر وقت اپنے جوتوں کپڑوں کی نمائش یا پھر فلمیں دیکھنے اور ان پر تبصروں میں گذرتا تھا۔ میرے شوق ذرا مختلف تھے۔ ویسے بھی میں انگلستان میں رہ کر وہاں کے کلچر کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔

یہاں میزبانی کا دستور بھی نرالا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کی ضیافت کا اہتمام کرتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو مہمان اپنے اپنے کھانے اور مشروبات ساتھ لاتے ہیں اور میزبان صرف برتن وغیرہ اور سروس مہیا کر دیتا ہے۔ یا پھر ضیافت کے بعد دعوت کا تمام خرچ میزبان اور مہمان آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ مجھے بھی ایسی بہت سی دعوتوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ لیکن میزبان مجھ سے خرچہ نہیں لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بھی ان کو دعوتوں پر بلاتا رہتا تھا لیکن اپنے مشرقی آداب کے مطابق میں نے کبھی ان سے اخراجات میں شرکت کو روا نہیں رکھا تھا۔ ایک مرتبہ فران کی ایک سہیلی نے جو لندن میں رہتی تھی اسے اطلاع دی کہ اس کی لینڈ لیڈی دو روز کے لیے باہر جا رہی ہے۔ میدان خالی ہے۔ تم آ جاؤ۔ فران، اس کا شوہر جیف، فران کی دو اور سہیلیاں اور میں لندن پہنچ گئے۔ وہاں اِدھر اُدھر گھومتے پھرے اور رات کو بڑا اچھا ڈنر کیا جو فران اور اس کی سہیلی نے مل کر تیار کیا تھا۔ پھر سب ہی ڈرائنگ روم میں سو گئے۔ صبح کے ناشتہ کے بعد رخصت ہونے سے پہلے سب نے اپنے اپنے حصہ کے پیسے دے

دیے۔ میرے بے حد اصرار کے باوجود انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں لیا۔

ایک روز کسی اور ڈیپارٹمنٹ کے ایک انگریز طالبِ علم سے ملاقات ہوئی جو کافی طویل اور دلچسپ رہی۔ اس نے مجھے شام کی چائے کی دعوت دی۔ میں چائے کے وقت اس کے ہاں پہنچا۔ وہ اس وقت چائے پی رہا تھا اور ساتھ کچھ بسکٹ بھی تھے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور خود چائے پیتا رہا۔ مجھے یہ عجیب سا لگا کہ مجھے چائے کی دعوت دی ہے اور خود چائے پی رہا ہے۔ چائے سے فارغ ہو کر وہ اٹھا۔ اوور کوٹ اٹھایا اور مجھے چلنے کو کہا۔ راستہ میں اس نے بتایا کہ کہیں باہر بیٹھ کر چائے پییں گے۔ اس کی لینڈ لیڈی بڑی سخت ہے اور پیشگی اطلاع کے بغیر وہ ایک پیالی بھی نہیں دیتی ہے۔ اس نے شکایت کی ہے کہ میرے ہاں مہمان بہت آتے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے کرایہ میں اضافہ کا مطالبہ بھی کیا اس لیے کہ مہمانوں کے آنے جانے سے اس کے زینہ کی سیڑھیاں تیزی سے گھس رہی ہیں۔ ایک اور دوست نے بتایا کہ آج اس کی لینڈ لیڈی بہت روئی اس کی بیٹی جو اب بالغ ہو گئی ہے وہ اسے چھوڑ گئی ہے۔ صبح صبح وہ اپنا بیگ تیار کر کے آئی اور اس نے ماں کو خدا حافظ کہہ دیا۔ وہ اب خود اپنی زندگی اپنے طریقہ سے گذارنا چاہتی تھی۔ غرض یہ تھے وہاں کے شب و روز۔

کرسمس کی چھٹیاں لندن میں گذریں۔ کرسمس سے پہلے میرے سینئر ٹیوٹر مسٹر ریول نے مجھے کرسمس کی چھٹیاں اپنے گھر گذارنے کی دعوت دی۔ بات یہ ہے کہ کرسمس کے دن اور اس سے اگلے روز جسے باکسنگ ڈے کہتے ہیں اور کسی حد تک تیسرے روز بھی پورے انگلستان کا سارا کاروبار بند ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی ہوٹل، ریسٹورنٹ یا بیکری بھی کھلی نہیں ہوتی پھر یہ دن سخت برف باری کے بھی ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک پاکستانی طالبِ علم تین روز بالکل بھوکے رہے ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں سارا کاروبار بھی بند ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایک روز تو وہ کوئی دس بارہ میل دور تک پیدل بھی گھومے کہ شاید کہیں کچھ کھانے کو ملے۔ مگر کچھ نہ ملا۔ میں نے پروفیسر صاحب سے معذرت کر لی۔ بعد میں مجھے کچھ ندامت بھی ہوئی۔ مجھے بھی

بھی بات بنانی نہیں آئی پہلے ہی میں ایک مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کو اور پھر خواجہ صلاح الدین صاحب کو اسی طرح جواب دے چکا تھا۔ پروفیسر ریول نے بھی مجھے بدتمیز ہی سمجھا ہوگا۔ انھوں نے تو اپنی طرف سے ہمدردی کی تھی اور یہ میرے لیے عزت افزائی بھی تھی۔ مگر میں نے صاف جواب دے دیا۔ بہرحال کرسمس وہاں صرف گھریلو تہوار ہے۔ سب اپنے اپنے گھر میں ہی رہتے ہیں۔ سڑکیں سنسان پڑی رہتی ہیں۔ ہم جب گاڑی میں کرسمس کے دن نکلے تو بڑی بڑی کشادہ سڑکوں پر صرف ہماری ہی گاڑی تھی۔ بس مرکزی لندن میں ایک اور گاڑی نظر آئی جسے ایک نوجوان جرمن چلا رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ بتی کے سرخ ہونے پر وہ رک گیا۔ ہم بھی رکے رہے اور جب تک بتی سبز نہیں ہوئی اس نے چوراہا عبور نہیں کیا۔ البتہ سال نو کا جشن بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ ٹرافلگر سکوئر پر زبردست ہنگامہ ہوتا ہے اور برف باری کے باوجود لوگ فواروں کے نیچے ناچ ناچ کر نہاتے رہتے ہیں۔ جیسے ہی بارہ کا گھنٹہ بگ بن Big Ben سے بجتا ہے اس علاقہ میں موجود ساری گاڑیاں اور ریل کے انجن زور زور سے ہارن بجانے لگتے ہیں۔ یہ جشن صبح تک جاری رہتا ہے اور لڑکے لڑکیاں فوارے کے ٹھنڈے پانی میں رقص کرتے رہتے ہیں۔

کیمرج واپس پہنچ کر پھر پڑھائی میں جٹ گئے جو موسم بہار تک چلتی رہی۔ بہار کی آمد کے ساتھ ہی کیمرج میں کھیلوں کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں لوگ جس انہماک سے پڑھتے ہیں اسی سنجیدگی سے کھیلوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ صرف کھیل ہی کھیلتے ہیں پڑھتے وڑھتے نہیں ہیں۔ میں نے بہار کی چھٹیاں پیرس میں گذارنے کا پروگرام بنایا۔

پیرس کی ٹکٹ میں لندن سے ڈوور Dover تک بس کا سفر اور پھر چینل کو عبور کرنے کے لیے جہاز کا سفر اور اس کے بعد ہوائی اڈے سے پیرس تک بس کا سفر شامل تھا، پیرس کم از کم لندن کے بعد بہت خوبصورت لگا۔ یہاں بڑی پرانی عمارتیں ہیں جیسے نوٹرڈیم،

شانزے لیزے، سکرے کور وغیرہ۔ پھر یہاں آئفل ٹاور ہے۔ یہاں کی اہم خصوصیات شہر کی لاتعداد آرٹ گیلریاں ہیں۔ پرانے روایتی آرٹ کی گیلریاں بھی ہیں اور جدید آرٹ کی بھی۔ اس کے علاوہ یہاں دنیا کا عظیم ترین عجائب گھر لوور Louvre ہے۔ اس میں مصری ممیاں وغیرہ ہیں اور لیونارڈو ڈی ونچی کی مشہور عالم مونالیزا بھی ہے۔ میں نے بہت غور سے اور کئی بار اس کو دیکھا لیکن مجھے اپنی بدذوقی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس میں مجھے کوئی خوبصورتی نظر نہیں آئی، شاید میں اس خاتون کے چہرہ کو ہی دیکھتا رہا تھا فن کار کے کمال کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ جس کی غالباً مجھ میں اہلیت ہی نہیں تھی۔ مجھے یہاں اپنی ایک اور بد ذوقی کا خیال آیا۔ اسرار صاحب جو کہ فن موسیقی میں بڑی دسترس رکھتے تھے اور لاہور کے فن کاروں کے حلقہ میں ایک مانوس اور معتبر حیثیت رکھتے تھے اور میرے بہت قریبی دوست تھے۔ ان کے ساتھ اکثر میں موسیقی کی محفلوں میں جاتا رہا اور رات رات تک کلاسیکی موسیقی کی محفلوں میں شریک ہوتا رہا جو کہ لاہور انٹر کانٹینینٹل سے لے کر بیڈن روڈ، بھاٹی گیٹ اور موہنی روڈ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ کئی مرتبہ لاہور کی مشہور سالانہ میوزک کانفرنس میں بھی شرکت کی اور موسیقی کی نجی محفلوں میں جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ ایک روز میں نے ان سے کہا کہ اب اتنے عرصہ موسیقی سنتے سنتے میں نے اس کا کچھ ذوق حاصل کر لیا ہے اور نزاکت علی سلامت علی تک مجھے بہت اچھے لگنے لگے ہیں۔ مگر روشن آرا مجھے (معاف کیجیے) کچھ سادہ سی اور بے سری لگتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ روشن آرا کو سمجھنے کے لیے ابھی اور بہت ریاض کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مونالیزا کا حسن بھی مجھے متاثر نہ کر سکا۔ شاید میرے کیمرج کے پروفیسر ایل سی نائٹ کو بھی نہیں جنھوں نے شیکسپیر کے ہملٹ کو ادب کی مونالیزا کہا اس لیے کہ مونالیزا کی طرح ہملٹ بھی سب کو بہت خوبصورت لگتا ہے مگر اس کی خوبصورتی نظر نہیں آتی یا نقاد اس کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔

عام لوگوں کے لیے پیرس کی خوبصورتی وہاں کی نائٹ کلبوں میں ہے جن میں

دلچسپ کھیل تماشے اور عریانی کے نظارے ہوتے ہیں۔ ان میں مولیس روژ سب سے زیادہ مشہور ہے اور کئی کئی ہفتہ اس کے ٹکٹ نہیں ملتے۔ یہاں جوئے خانے اور مے کدے بھی بہت ہیں اور شانزے لیزے۔ جو یہاں کی مشہور سیرگاہ ہے۔ اس میں تو ہوٹل بھی تھیٹروں کی طرح بنے ہوئے ہیں اس طرح کہ کرسیاں اور میزیں قطاروں میں لگی ہوتی ہیں جو سیڑھیوں پر رکھی ہوتی ہیں اور سب کا رخ سڑک کی طرف ہوتا ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ آنے جانے والوں کی سیر کرتے ہیں اور آنے جانے والے ان کی۔ لگتا ہے لوگوں کی نمائش لگی ہوئی ہے جو چڑیا گھر کے جانوروں کی طرح شیشوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں اور لوگ انھیں دیکھ رہے ہیں۔

پیرس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے لوگ لاہور والوں کی طرح بڑے کھلے ڈلے ہیں۔ انگریزوں کی طرح سمٹے سمٹائے نہیں۔ پھر سارا پیرس بہار کے دنوں میں سیاحوں سے بھرا ہوتا ہے جن میں زیادہ تعداد امریکیوں کی ہوتی ہے۔ وہ بھی زیادہ تکلف اور تصنع کے قائل نہیں ہیں۔ دریائے سین پر چلتی ہوئی سجی سجائی کشتیاں اور سڑکوں پر گھومتی ہوئی سیاحوں کی بسیں بالکل پریوں کی ڈولیاں لگتی ہیں۔ یہاں پٹڑیوں پر، بالکل بھاٹی گیٹ کی طرح ریسٹورنٹ ہوتے ہیں اور کرسیاں، میزیں سڑک کنارے لگی ہوتی ہیں۔ خاصی بے تکلفی کا ماحول ہوتا ہے۔ البتہ پیرس کے لوگ انگریزی سے سخت نفرت کرتے ہیں اور انگریزی بولنا بلکہ سننا بھی پسند نہیں کرتے حالانکہ سب کو انگریزی آتی ہے۔

پیرس سے کچھ فاصلے پر ورسائی کے محلات ہیں۔ یہ جگہ پیرس سے جنوب مغرب کی سمت چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس کا شیش محل اور گیلریاں بہت خوبصورت ہیں۔ یہ فرانس کے بادشاہوں کی رہائش گاہ رہا ہے۔ مشہور ملکہ میری انتوانئٹ بھی یہیں رہتی تھی۔ انقلاب فرانس کے بعد نپولین نے بھی یہیں رہائش اختیار کی تھی۔ یہاں دو مشہور امن معاہدے ہوئے۔ پہلا ۱۷۸۳ء میں جس کے ذریعہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی آزادی کو تسلیم کیا گیا اور دوسرا ۱۹۱۹ء میں جب پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر جرمنی کے خلاف ایک نہایت ہی غیر

منصفانہ معاہدہ کیا گیا جس کے نتیجہ میں دوسری جنگ عظیم رونما ہوئی۔ برٹرینڈ رسل نے اس معاہدہ کے متعلق لکھا کہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایسی خوبصورت جگہ میں ایسا بدنما معاہدہ کیا گیا۔ ورسائی کی خوبصورتی یہاں کے دل فریب محلات ہیں۔ یہ دنیا میں ان چند ایک خوبصورت تعمیرات میں سے ہے جن کے حسن کے سامنے تخیل بھی مات کھا جاتا ہے۔ ان محلات سے بھی زیادہ خوبصورت ان کے اردگرد پھیلے ہوئے باغات ہیں جو خوشنما قطعات پر مشتمل ہیں اور جہاں سبزہ و گل کے علاوہ خوبصورت دیومالائی مجسمے اور نفیس فوارے بھی سجائے گئے ہیں۔

پیرس کے سفر کے دوران ایک بنگالی ہندولڑکے سے ملاقات ہوئی۔ وہ کافی عرصہ سے لندن میں مقیم تھا۔ یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ پیرس میں اس سے اچھی خاصی واقفیت ہوگئی۔ پیرس کے پاکستانی سفارت خانہ کے ایک اعلیٰ بنگالی افسر کے نام وہ ایک تعارفی خط بھی لایا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں ایک رات اس افسر کے ساتھ ٹھہرے۔ مجھے عجیب سا لگا کہ ایک پاکستانی سفارت کار کے ہاں میں ایک ہندولڑکے کا مہمان بن کے رہا۔

پیرس سے پھر میں سوئزرلینڈ کے لیے روانہ ہوگیا۔ سوئزرلینڈ خوبصورت وادیوں اور سرسبز پہاڑیوں کا ملک ہے۔ یہاں کی خاص تفریح سکی انگ ہے۔ ایک بہت اونچے مقام سے کیبل کار کے ذریعہ دوسری پہاڑی تک پہنچے۔ اس کیبل کار میں کوئی ۲۵ آدمیوں کی گنجائش تھی۔ لیکن مسافر زیادہ نہیں تھے۔ بہت سوں نے سکیئنگ کا سامان اٹھایا ہوا تھا۔ یہاں کالج کی ایک طالبہ سے ملاقات ہوئی۔ جس سے میرا ساتھ سوئزرلینڈ کے دارالخلافہ برن تک رہا۔ اس نے بتایا کہ وہاں کے لوگ غیرملکی باشندوں سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن میں نے کہا کہ آپ تو اتنی دیر سے میرے ساتھ ہیں لیکن کسی نے ناراضگی یا برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ تو اس نے جواب دیا کہ یہ سب سمجھتے ہیں کہ آپ سیاح ہیں۔ اگر انھیں اندازہ ہو جائے کہ آپ یہاں رہنے کے لیے آئے ہیں تو یہ آپ کو بالکل برداشت نہیں کریں گے۔ دو تین روز ان علاقوں میں گھومنے کے بعد میں زیورخ گیا اور پھر وہاں سے ہوتا ہوا جرمنی پہنچا اور پھر بیلجیم کے راستے واپس

انگلستان آ گیا۔ بیلجیم اور جرمنی کا ذکر آگے آئے گا۔

کیمرج میں واپسی پر پھر پڑھائی بڑے زور وشور سے شروع ہوگئی۔ اسی دوران ٹرائی پاس کا پہلا سال مکمل ہوا اور میں امتحان میں پاس بھی ہوگیا۔ ساتھ ہی ایک زبردست مشکل بھی پیش آئی کہ میرے پاس پونڈ ختم ہو گئے تھے۔ میں ۱۶۰ پونڈ لے کر گیا تھا جب کہ دو برس میں چھ ٹرم کے لیے ۴۸۰ پونڈ درکا تھے۔ میں جب کیمرج گیا تھا تو وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ میری کوئی نہ کوئی امداد ضرور کردیں گے۔ مجبوری کی حالت میں میں نے اپنے ٹیوٹر سے بات کی اور کسی وظیفہ وغیرہ کے متعلق کہا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ صرف انگریز طالب علموں کی امداد کا اختیار رکھتے ہیں۔ غیر ملکی طلبہ کے لیے ان کے پاس کوئی فنڈ نہیں۔ لیکن چوں کہ میری تعلیمی رپورٹ اچھی تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس چلا جاؤں۔ اس لیے ٹیوٹر نے وائس چانسلر سے میری سفارش کی۔ میں نے ان سے ملاقات کی اور ساری تفصیل بتائی تو انھوں نے کہا کہ پہلے ہم پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے پوچھتے ہیں کہ وہ آپ کی کیا مدد کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے خط کے جواب میں حمید احمد خاں صاحب نے لکھا کہ ہم مالی امداد کی کوئی صورت نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی بات وہ کوئی چھ ماہ پیشتر میرے خط کے جواب میں بھی لکھ چکے تھے۔ اس لیے صورتِ حال کچھ بہت امید افزا نہیں تھی اور مجھے تقریباً یقین ہوگیا تھا کہ اب واپس ہی جانا پڑے گا۔

ابھی میں اسی تذبذب میں تھا کہ کالج کے نوٹس بورڈ پر ایک اشتہار پر نظر پڑی۔ یہ BUNAC برٹش یونیورسٹیز نارتھ اٹلانٹک کلب کی طرف سے تھا۔ یہ امریکہ میں تین ماہ کے قیام کا ایک پروگرام تھا۔ اس کا کل خرچہ ۵۰ پونڈ تھا۔ لیکن سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس قیام کے دوران طلباء کو امریکہ میں کام کرنے کی اجازت بھی تھی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب پڑھائی تو ختم ہی سمجھو۔ چلو امریکہ چلتے ہیں اور وہاں کچھ پیسے کمانے کا موقع بھی مل جائے گا۔ چنانچہ میں نے ۵۰ پونڈ کرائے کے اور غالباً ۵ پونڈ ممبرشپ فیس دے کر اس

پروگرام میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس کے بعد میرا تقریباً تمام اثاثہ ختم ہوگیا۔ البتہ دو باتیں بہت ہمت افزا تھیں۔ ایک تو یہ کہ میرے ایک کزن نیو یارک کے کوئنز ہسپتال میں انٹرنی تھے۔ اُن کے پاس قیام کی سہولت تھی۔ دوسرے میرے ایک امریکی دوست جارج موریسن میرے ساتھ کیمرج میں پڑھتے تھے۔ ان کے والد ایک بہت بڑی انشورنس کمپنی کے ایگزیکٹو ڈائرکٹر تھے جس کا دفتر نیو یارک کے اہم ترین علاقہ ففتھ ایونیو میں تھا۔ انھوں نے مجھے وہاں سے ملازمت کا ایک خط بھیج دیا۔ اب نیو یارک میں میرے پاس رہائش بھی تھی اور ملازمت بھی۔ چنانچہ میں نے امریکی ویزے کے لیے درخواست دے دی۔ میرے دوسرے ساتھیوں کو تو ویزے مل گئے مگر مجھے دوبارہ آنے کو کہا گیا۔ دوسری مرتبہ بھی جو امریکی افسر تھیں انھوں نے مجھے ویزا دینے میں تامل کیا۔ پہلے تو انھوں نے کہا کہ مجھے پاکستان سے ہی ویزا لے کر آنا چاہیے تھا۔ لیکن جب میں نے اپنے کزن اور مسٹر موریسن کے خطوط دکھائے اور بہت اصرار کیا تو وہ کچھ نرم پڑ گئیں اور مجھ سے پوچھا کہ میرا طارق علی سے کیا رشتہ ہے انھیں یہ شک اس لیے ہوا کہ اس وقت میں نے بڑی بڑی موچھیں رکھی ہوئی تھیں اور ان کو میری شکل طارق علی سے ملتی ہوئی لگی۔ طارق علی اس وقت آکسفورڈ میں تھے اور بہت سرگرمی سے سیاست میں ملوث تھے۔ میں نے بتایا کہ میری طارق علی سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ صرف ایک پروگرام میں بی بی سی کی اردو سروس میں میرے خیالات نشر ہوئے تھے جس میں میں نے طلباء کی سیاست میں شرکت کی مخالفت کی تھی جب کہ آکسفورڈ سے طارق علی نے اس کی حمایت کی تھی۔ دونوں پروگرام الگ الگ ریکارڈ ہوئے تھے لیکن نشر ایک ہی ساتھ ہوئے تھے۔ غالباً امریکی ویزا افسر کو اس کا علم تھا۔ آخر اس کی تسلی ہوئی تو اس نے مجھے ویزا دے ہی دیا۔

میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ میرے کام کبھی رکے نہیں مگر آسانی سے بھی کبھی نہیں ہوئے جب ویزا اور ٹکٹ وغیرہ سب کچھ مل گئے تو ہیتھرو کے ہوائی اڈے پر بڑی مشکل پیش آئی۔ وہاں کے عملہ کو شک تھا کہ میرے پاس یقیناً ہیروئن ہے جو میں امریکہ سمگل

کر رہا ہوں۔ چنانچہ ایک بوڑھے سے انگریز نے میری مکمل تلاشی لی سارے کپڑے بھی اتروالیے۔ مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے کہا کہ آپ لوگ اسی طرح ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو تنگ کرتے ہیں۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ بات یہ نہیں ہے بلکہ ان کو شک اس وجہ سے ہوا کہ میں امریکہ جا رہا تھا اور میرے پاس صرف تیس پونڈ تھے جو اس کے مطابق دو دن کے لیے بھی کافی نہیں تھے۔ اس نے کہا امریکہ انگلستان سے کہیں زیادہ مہنگا ہے۔ میں نے پھر اس کو بتایا کہ میرے پاس رہنے اور ملازمت کرنے کے انتظامات ہیں۔ بہر حال چوں کہ میرے پاس سے کوئی ناجائز چیز برآمد نہیں ہوئی تھی اس لیے مجھے جہاز پر سوار ہونے کی اجازت مل گئی۔

لندن سے نیویارک کی پرواز براہ راست تھی۔ جہاز بحر اوقیانوس پر سے اڑتا ہوا کینیڈا کے راستے نیویارک پہنچا۔ نیویارک پہنچ کر ہمارے جہاز نے ہوا میں کئی چکر لگائے۔ پائلٹ نے بتایا کہ ہم اترنے کے لیے لائن میں لگے ہوئے ہیں۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ایک جہاز ہم سے نیچے اور دو ایک ہم سے اوپر فضا میں اسی طرح چکر لگا رہے تھے۔ بحر اوقیانوس سے گذرتے ہوئے مجھے ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ میں لاہور میں الائنس فرانسز کا ممبر تھا۔ وہاں ایک فرانسیسی لڑکی کو ہاتھ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میں نے بھی اسے ہاتھ دکھایا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کیا جاننا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بتائیں کہ میری قسمت میں سمندر پار جانا ہے کہ نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ بالکل نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے کیمرج میں داخلہ مل گیا ہے اور میرا ویزا بلکہ ٹکٹ تک آ گیا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ انگلستان کو سمندر پار کہتے ہیں۔ وہ تو صرف چینل کے پار ہے۔ بحر اوقیانوس سے گذرتے ہوئے وہ منجم لڑکی مجھے بہت یاد آئی۔

....

مہمانوں کو ایک ایک کمرہ دیا گیا۔ میں نے تو ایسے کمرے کبھی فلموں میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ میں کمرہ میں اکیلا ہی تھا اس لیے کہ دوسرے ساتھی بس سے اترتے ہی کہیں چلے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ کوئی ۵۰۰ ڈالر روزانہ کے کرایہ کا کمرہ تھا۔ ویسے بھی یہ ہوٹل ایمپائر سٹیٹ کی عمارت کے بغل میں تھا۔ نہا دھو کر ٹہلنے نکل گئے۔ باہر ہی کہیں کچھ سنیک کھا لیے۔ ہوٹل میں کھانے کے متعلق پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی حالانکہ بعد میں معلوم ہوا کہ کم از کم ناشتہ وہاں مفت ہی تھا۔ وہیں سے میں نے اپنے کزن کو ٹیلیفون کیا۔ بڑی مشکل سے Paging کے ذریعہ ان سے رابطہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ وہ بہت مصروف ہیں اور مجھے لینے نہیں آ سکتے اس لیے میں خود ہی ان کے ہسپتال پہنچ جاؤں وہ کوینز کے ایک بڑے ہسپتال میں انٹرن شپ کر رہے تھے۔ انھوں کے کہا کہ میں وہیں سے Sub-way ریل لے لوں اور پارسنز Parsons ایونیو پر اتر جاؤں۔ وہاں سے ہسپتال قریب ہی ہے چنانچہ میں اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر ہسپتال پہنچ گیا جہاں تھوڑی دیر کے بعد ان کو بھی کہیں سے بلوا بھیجا گیا۔ وہ ہسپتال میں ہی رہتے تھے۔ ڈاکٹروں کا ہوسٹل بہت بڑا تھا۔ اس میں کمرے بھی کشادہ تھے اور ہر کمرے میں دو پلنگ تھے چنانچہ میں نے وہیں پڑاؤ کر لیا۔ کھانے کے وقت وہ مجھے کینٹین لے گئے۔ وہاں کھانا بھی مفت تھا۔ چنانچہ ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور شام کا کھانا وہیں ہونے لگا۔ اس کے علاوہ چائے کا دور ہر وقت چلتا رہتا۔ پھر وہاں ہال میں دو بڑے بڑے فرج تھے جو ہر وقت مکھن، پنیر، جام اور جیلی وغیرہ سے بھرے رہتے۔ دودھ کے پیکٹ بھی ہوتے۔ اس کے علاوہ چائے اور کافی کی مشینیں تھیں اور کوک وغیرہ کے ڈبے پڑے رہتے تھے۔ ڈاکٹر اور نرسیں ہر وقت آتے جاتے بڑی فراغت سے کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے۔ پھر میں کچھ عرصہ کے لیے کینیڈا گیا تو واپسی پر سب پوچھتے تھے ''ڈاک (یعنی ڈاکٹر) آپ کا تبادلہ ہو گیا تھا''۔ میں نے کہا کہ ابھی میں تو صرف ایک سیاح ہوں کوئی ڈاکٹر نہیں۔ لیکن وہ اسے مذاق سمجھتے تھے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ میں بھی اس ہسپتال کا ایک ڈاکٹر ہوں۔ غرض نیویارک میں تقریباً چار ماہ کے دوران

طعام وقیام کا بالکل کوئی خرچ نہیں تھا۔شکر خورے کو شکر۔

میرے وہاں پہنچنے کے دوسرے ہی روز ہسپتال میں ایک دلچسپ ہنگامہ ہوا۔ جو ایک پورٹو ریکن ڈاکٹر کے ساتھ ہوا۔ یہ پورٹو ریکن انگریزی بس واجبی ہی سی سمجھتے ہیں۔ وارڈ میں ایک مریض کی موت ہوگئی۔ بڑے ڈاکٹر صاحب اس ماتحت پورٹوریکن ڈاکٹر کو یہ ہدایت دے کر چلے گئے کہ اس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنا دے۔ وہ غالباً چائے پینے چلا گیا۔ واپس آ کر اس نے اس بیڈ کے مریض کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنا دیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ اس ڈاکٹر کی غیر حاضری کے دوران ایک نیا مریض آ گیا۔ وارڈ کے سٹاف نے مردے کو وہاں سے ہٹا کر برآمدے میں ڈال دیا اور وہ بستر نئے مریض کو دے دیا۔ ڈاکٹر نے اس نئے مریض کا چارٹ لے کر اس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنا دیا تھوڑی دیر میں اس کے عزیز روتے دھوتے وہاں پہنچے کہ ابھی تو ٹھیک ٹھاک اسے داخل کرا کے گئے تھے یہ مر کیسے گیا۔ پھر یہ راز کھلا اور غلطی کا پتہ چلا۔ سنا ہے کچھ عرصے پہلے وہاں ڈاکٹروں نے کسی مریض کی غلط ٹانگ بھی کاٹ دی تھی امریکہ میں اور وہ بھی نیویارک میں۔ ایسی غلطیاں کچھ عجیب سی لگیں۔

اگلے روز میں موریسن صاحب کے دفتر پہنچا۔ یہ دفتر مین ہیٹن میں ففتھ ایونیو کے ساتھ ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کے بالکل قریب تھا۔ موریسن صاحب بڑے اخلاق بلکہ شفقت سے پیش آئے۔ انھوں نے معذرت کی کہ میرے لائق کوئی آسامی تو ان کے پاس نہیں ہے لیکن انھوں نے مجھے ۱۳ ڈالر روز پر ریکارڈ روم میں جگہ دے دی۔ میں نے پوچھا کام کیا ہے تو کہا کہ کچھ نہیں۔ یہ ریکارڈ روم سب سے اوپر کی منزل میں تھا اور یہاں چائے بنانے کا انتظام بھی تھا۔ لڑکے لڑکیاں آتے، چائے بناتے، پیتے، مجھے بھی پیش کرتے۔ کچھ دیر گپیں بھی لگاتے، جب کسی فائل وغیرہ کی ضرورت ہوتی خود ہی نکال لیتے اور رکھ دیتے۔ مجھے کبھی کسی نے کوئی کام کرنے کو نہیں دیا، یہ کمرہ غالباً بیسویں منزل پر تھا۔ کبھی کبھی میں باہر آ کر چھت پر ٹہلنے لگتا۔ بالکل ساتھ ہی ایمپائر سٹیٹ کی ۱۰۲ منزلہ عمارت تھی اور دوسری بھی عمارتیں بہت ہی بلند

تھیں۔ ایک روز میں ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ پر بھی گیا۔ میں نے اوپر جانے کا ٹکٹ لیا۔ تین لفٹیں بدل کر چھت تک پہنچا جاتا ہے اس کے اوپر ایک چوتھی لفٹ بھی ہے جو اوپر کی برجی اور ٹیلیویژن انٹینا تک جاتی ہے۔ اوپر سے جھک کر نیچے سڑک کو دیکھتے ہوئے بہت ڈر لگتا ہے ۱۴۰۰ فٹ بلند اس جگہ سے نیچے چلتی ہوئی گاڑیاں کھلونوں کی طرح لگتی تھیں اور لوگ تو بمشکل ہی نظر آتے تھے۔ یہ عمارت ہوا کے زور سے کسی حد تک جھولتی بھی ہے اور غالباً ایک ڈیڑھ فٹ تک لہراتی رہتی ہے۔ غرض خوب سیر تھی۔

نیویارک کی اپنی ہی ایک الگ دنیا ہے۔ چوں کہ پہلے روز ہی سنجیدہ قسم کی ہدایات نے شوقِ تجسس پر اکسایا اس لیے پہلی فرصت میں سنٹرل پارک کا رخ کیا۔ یہ ایک بہت وسیع پارک ہے جس میں اوپن ایر تھیٹرز اور دوسرے تفریحی مقامات ہیں۔ یہاں دن دیہاڑے ڈاکے اور اغوا کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے کئی بار اس پارک کی سیر کی لیکن کہیں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ دوسری خطرناک جگہ ہارلم کا علاقہ تھا جو مین ہٹن کے درمیان واقع ہے۔ یہ خالصتاً کالوں کی بستی ہے۔ یہاں کا ماحول بہت مانوس سا لگا۔ بالکل اپنے وطن جیسا، آوارہ لڑکے کھیلتے اور خوش گپیاں کرتے ہوئے۔ کچھ گھروں کی دہلیز پر تاش کھیلتے ہوئے۔ ہر طرف ایک ایسی بے فکری کا سماں تھا جو نیویارک میں اور کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ میں نے سب ہی کو بہت خوش اخلاق اور ملنسار پایا کوئی غرور نہیں۔ کوئی جھجک نہیں۔ کوئی کمپلکس نہیں۔ یہاں انسانی رشتے ابھی اتنے میکانکی اور مشینی نہیں ہوئے تھے جتنے باقی امریکہ میں۔ کچھ فاصلے پر چائنہ ٹاؤن ہے اور لٹین کوارٹرز ہیں۔ یہاں بھی زندگی میں کافی بے تکلفی اور اپنائیت کا احساس ملتا ہے۔

ڈاؤن ٹاؤن میں واشنگٹن سکوئر کے قریب نیویارک یونیورسٹی کے علاقے میں گوروں کی بھی ایک ایسی بستی ہے جہاں زندگی تہذیبی پابندیوں سے کسی حد تک آزاد نظر آتی ہے۔ یہ باغیانہ قسم کے نوجوانوں کی دنیا ہے۔ یہاں چائے خانے ہیں، شراب خانے ہیں، جوا

خانے ہیں، ریسٹورنٹ ہیں جن میں نشہ میں لڑکے لڑکیاں بے سدھ ناچتے گاتے رہتے ہیں۔اس کو Village کہتے ہیں۔دوسری طرف کولمبیا یونیورسٹی ہے جو مغربی تہذیب کے نظم و ضبط کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔غرض نیویارک اس سرے سے اس سرے تک دنیا بھر کی تہذیبوں کا ایک ماڈل ہے۔ایک Miniature world ہے۔

ہسپتال میں ایک نرس تھی۔خاصی قبول صورت اور کسی حد تک نوعمر مجھے لگا کہ وہ میرے کزن پر فریفتہ ہے۔میں نے ایک روز شرارتاً اس سے پوچھا کہ اگر تمھیں وہ اتنا ہی پسند ہے تو اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتیں وہ بولی کہ اس نے ابھی پروپوز ہی نہیں کیا۔میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کے ہاں تو شرم اور حیا جیسی کوئی دقیانوسی بات نہیں ہوتی پھر یہ جھجک کیسی۔اس نے جواب دیا کہ پروپوز تو لڑکا ہی کرتا ہے۔کوئی لڑکی اپنے منہ سے تو نہیں کہے گی کہ مجھ سے شادی کرلو۔میں نے اسے بتایا کہ ہم لوگ بہت پس ماندہ اور ''غیر مہذب'' ہیں لیکن ہمارے ہاں پہل عموماً لڑکی کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔اشاروں کنایوں، چلمنوں، جھروکوں اور سینکڑوں اداؤں کے ذریعہ وہ اپنے محبوب کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔میں نے اسے بتایا کہ ہماری لوک کہانیوں کی ہیروئنیں ہیر اور سوہنی سماج کے خلاف بغاوت کا علم لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں جب کہ ان کے محبوب خاموشی سے ظلم سہتے چلے جاتے ہیں۔ہمارے معاشرے میں محبت محض ایک رومانوی جذبہ نہیں ہے بلکہ ظلم و استحصال کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہوجانے کی ایک علامت ہے۔انا کے تحفظ کا ہتھیار ہے۔معلوم نہیں ان باتوں سے اس نے کیا مطلب لیا ہوگا۔وہ تو یہی جانتی تھی کہ لڑکی کو ایسے معاملات میں پہل نہیں کرنی چاہیے۔اسے ہمیشہ مطلوب ہی ہونا چاہیے۔طالب نہیں۔اس کے خیال میں اظہارِ محبت کا باوقار طریقہ یہی ہے کہ اپنے محبوب کے آس پاس ہی رہو۔ہر وقت اس کی نظروں میں رہو۔اس کی ہر ممکنہ مدد اور خدمت کرو اور اشاروں کنایوں سے اسے اپنی محبت کا احساس دلاتی رہو۔میں سوچتا تھا کہ مشرق اور مغرب کی لڑکی میں آخر فرق

کیا ہے دونوں کی کمزوریاں تو ایک ہی جیسی ہیں اور شاید مغرب کی لڑکی کچھ زیادہ ہی بے بس ہے مردوں کے بنائے ہوئے اس معاشرے میں تمام تر ترقی کے باوجود عورت ہمیشہ کی طرح مظلوم اور لاچار ہی ہے۔دنیا بھر کی نسوانی تحریکوں کا بنیادی مطالبہ یہی ہے کہ عورت کو مرد کے برابر حقوق ملنے چاہیے۔لیکن عورت کا مسئلہ یہ ہے کہ اسے مرد کی برابری بھی چاہیے اور مرد کی سرپرستی بھی۔گھر بار اور بچے خالصتاً عورت کا مسئلہ ہیں۔لیکن اس کے لیے مرد کی مدد بلکہ سرپرستی کی ضرورت ہے۔سیکنڈے نیویا کے کچھ ملکوں میں شوہروں کو میٹرنٹی لیو ملتی ہے تاکہ وہ اپنی بیوی کی ذمہ داریاں بانٹ سکیں۔اصل میں عورت کو Independence نہیں Interdependence چاہیے۔آزادی نہیں بلکہ آزادی میں حصہ داری چاہیے۔آج مغرب میں عورت کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ گھر کی دیکھ بھال اور بال بچوں کی پرورش کی ذمہ داریوں سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتی بلکہ مرد کو ان میں شریک کرنا چاہتی ہے۔یہ احساس اب مغرب میں زور پکڑتا جا رہا ہے۔

دفتر کی صورتِ حال یہ تھی کہ میں صبح وہاں چلا جاتا۔کچھ دیر لوگوں سے ہیلو ہائے کرتا۔اوپر کی منزل میں اپنے کمرے کا ایک چکر لگاتا اور چائے تیار ہوتی تو پی لیتا۔پھر اس کے بعد ففتھ ایونیو پر گھومتا یا برامدے میں آکر کھڑا ہو جاتا۔ایک روز تیز بارش ہو رہی تھی بہت ہی غیر معمولی کڑک اور گرج تھی۔میں نے اوپر سے دیکھا کہ چوڑی سی سڑک کے بیچوں بیچ ایک نوعمر پتلی دبلی سی لڑکی ڈاک کے ایک بڑے سے تھیلے کو جو بوری جیسا تھا۔پورا زور لگا کر گھسیٹ رہی تھی اور اسے بارش سے بچانا چاہ رہی تھی۔درجنوں لوگ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے اس کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی اور وہ اکیلی ہی اس بوری سے الجھتی رہی جو اصل میں ڈاک کا تھیلا تھا یہ یہاں کی معاشرت ہے۔اگر اسے چوٹ لگ جاتی یا وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتی تو فوراً کوئی ایمبولینس اس کی مدد کو پہنچ جاتی۔پولیس اور دوسری سرکاری مشینری بھی حرکت میں آجاتی۔لیکن اب اس معاشرہ میں ذاتی ہمدردی کا تصور بالکل ختم ہوگیا

ہے۔ ہمدردیاں بھی Institutionlised ہوگئی ہیں۔ انفرادی شخصی آزادی کی یہ انتہا ہے۔ زندگی اس قدر میکانکی اور غیر جذباتی ہوگئی ہے۔

دفتر کی صورتِ حال یہ تھی کہ یہاں اچھا خاصہ عملہ تھا جس کے دفاتر کئی منزلوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایگزیکٹو ڈائریکٹر برانچوں میں گھومتے رہتے۔ اگر انھیں کسی فائل وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو خود ہی متعلقہ میز پر جا کر کلرک سے رجسٹر مانگتے اسے کبھی اپنے دفتر میں نہیں بلاتے تھے۔ چپڑاسیوں کا یہاں کوئی تصور نہیں۔ ہر شخص چاہے کسی حیثیت کا ہو اپنا کام خود کرتا ہے۔ یہاں ایک نابینا ٹائپسٹ بھی تھے جنھیں Dictophone یا Dictograph پر ڈکٹیشن دے دی جاتی اور وہ کانوں میں ریسیور لگائے مستقل ٹائپ کرتے رہتے۔ اپنے کام میں بڑے ماہر تھے۔ کبھی کوئی غلطی نہیں کرتے تھے۔ ویسے بڑے نفیس اور ملنسار انسان تھے اور وقفوں کے دوران خاصی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ یہاں چائے کے دو وقفے ہوتے تھے۔ ایک گیارہ بجے اور دوسرا تین بجے۔ اس کے علاوہ کوئی کبھی کام سے نظریں نہ اٹھاتا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود مجھے معلوم ہوا کہ یہاں عورتوں کو مردوں سے کم تنخواہ ملتی ہے۔ میں نے ایک روز مینجر سے پوچھا کہ دنیا کی اس عظیم ترین جمہوریت میں اتنی غیر جمہوری بات کیوں ہوتی ہے تو اس نے مجھ سے کہا کہ آپ ذرا کچھ دیر ان کے قریب جا کر دیکھیے کہ یہ عورتیں کام کتنا کرتی ہیں اور باتیں کتنی۔ آزادیٔ نسواں اور مساوات کے نعرے کتنے کھوکھلے ہیں۔

یہاں کے لوگ پاکستان کے متعلق کافی کچھ جاننا چاہتے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک عام امریکی کو امریکہ سے باہر کی دنیا کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ان کی تمام تر دلچسپیاں محض مقامی مسائل تک محدود ہیں۔ مجھے یہ جان کر تعجب ہوا کہ انھیں پاکستان کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس میں کچھ قصور ہمارے سفارت خانوں کا بھی ہے۔ میں نیو یارک میں ایک روز پاکستان کونسلیٹ کے دفتر گیا۔ وہاں کونسل صاحب بھی موجود تھے۔ دو ایک اور لوگ بھی

تھے۔ بظاہر وہاں کوئی مصروفیت نظر نہیں آ رہی تھی الماریوں میں پاکستان سے متعلق کچھ معلوماتی لٹریچر رکھا ہوا تھا۔ میں نے کونسل صاحب سے پوچھا۔ جو ہمارے ایک بہت ہی مشہور سفارت کار رہے ہیں کہ ان میں سے ایک میگزین لے لوں۔ یہ بہت ہی اعلیٰ کاغذ پر چھپی ہوئی مصور میگزین تھی اور اس وقت بھی کوئی چار یا پانچ سو روپے تو اس پر لگے ہوں گے۔ انھوں نے بڑی بے نیازی سے فرمایا۔ جتنے چاہیں اٹھالیں۔ ایسا ہی ایک تجربہ مجھے لندن میں بھی ہوا تھا۔ ایک صاحب نے کراچی کے ہوائی اڈے پر مجھے سوہن حلوے کے دو ڈبے دیے کہ میں انھیں پاکستان ہائی مشن کے ایک افسر کو پہنچا دوں۔ میں نائٹس برج گیا تو وہاں کا منظر دیکھ کر مجھے کچھ دھچکا سا لگا۔ میزوں پر فائلوں کے ڈھیر لگے تھے۔ دو کرسیاں خالی پڑی تھیں دو آدمی ٹانگیں میز پر رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ خالی پیالیاں فائلوں کے پاس رکھی تھیں۔ کسی پاکستانی دفتر کا بالکل صحیح نقشہ تھا۔ بغل میں ان افسر صاحب کا کمرہ تھا جنھیں حلوے کے ڈبے دینے تھے۔ انھوں نے ڈبے لے لیے۔ شکریہ وغیرہ کا کوئی تکلف نہیں کیا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں انگلستان میں مستقل رہائش چاہتا ہوں۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں کیمرج میں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں اور انگلستان میں قیام کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ تاہم وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ وہ مجھے وہاں مستقل رہائش دلا سکتے ہیں انھوں نے بتایا کہ وہ بہت سے لوگوں کو وہاں کی شہریت دلوا چکے ہیں۔ پھر کوئی دو سال بعد مجھے ایک مرتبہ پھر پاکستان ہائی کمیشن جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشگوار حیرانی ہوئی کہ دفتر میں کوئی افراتفری نہیں تھی اور کچھ لوگ بڑے انہماک سے مصروف تھے۔ میں نے ایجوکیشن افسر Mr.Conquest سے اس حیرت کا ذکر کیا تو وہ بہت برہم ہوئے اور بولے کہ کہیں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ صرف عملہ کی تعداد آدھی کر دی گئی ہے میں نے کہا کہ انگلستان کے اس سنجیدہ اور ذمہ دار معاشرے نے بھی ان پر کوئی صحت مند اثر نہیں ڈالا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ دنیا بھر میں ہمارے مشن کیا کام کرتے ہیں اور پاکستان کا نام کتنا روشن کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے میں امریکہ، یورپ اور مشرق وسطیٰ کے جن ممالک میں بھی گیا وہاں پاکستانی سفارت خانوں سے دور دور ہی رہا۔ بلکہ پاکستانیوں سے بھی بچتا رہا۔ مجھے کچھ لوگوں نے بتایا تھا کہ یہ لوگ مسافروں کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ ان کے پاسپورٹ ہتھیا لیتے ہیں اور کچھ لے دے کر ہی ان سے چھٹکارا ملتا ہے۔ بہر حال ذکر ہو رہا تھا امریکیوں کی دنیا کے متعلق معلومات عامہ کا۔ میری جن لوگوں سے ملاقات ہوئی انھیں تو پاکستان کے متعلق کوئی اچھا یا برا تصور تھا ہی نہیں۔ البتہ میرے ایک نوجوان پاکستانی دوست نے ایک مرتبہ کیلیفورنیا سے بڑے غصہ میں لکھا تھا کہ امریکی تو اپنے علاوہ کسی اور کو جانتے ہی نہیں۔ انھوں نے بڑی ہی جھلاہٹ میں کچھ معترضین سے کہا تھا کہ وہ پاکستان میں درختوں پر رہتے ہیں۔ جڑی بوٹیاں وغیرہ کھاتے ہیں اور صرف کچھے یا لنگوٹیاں پہنتے ہیں۔ دفتر کی کچھ لڑکیوں کو بڑی حیرت تھی کہ You never had a woman میں نے انھیں اپنے کلچر اور اپنی تہذیب وغیرہ اور سماجی تعلقات کے بارے میں تفصیلات بتانے کی کوشش کی جو غالباً ان کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ ایک لڑکی جو ذرا دوسری لڑکیوں سے شکل و صورت میں کچھ بہتر تھی مجھ سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہوگئی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دو امریکی نوجوانوں کی طرف سے مجھے زبردست دھمکیاں ملیں کہ اگر میں نے اس لڑکی سے ملنا نہ چھوڑا تو میری خیر نہیں۔ میں نے ان کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ میری نیت خراب نہیں ہے۔ بہر حال، یہ امریکی معاشرہ ہے جہاں مرد اور عورت کو برابر کے حقوق حاصل ہیں اور دونوں اپنی اپنی زندگیوں میں آزاد ہیں اور ہمارے نوجوانوں اور دوشیزاؤں کی طرح مجبور اور مظلوم نہیں ہیں۔

ایک روز میں نے مسٹر موریسن اور ان کی بیوی کو ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں کھانے کی دعوت دی۔ انھوں نے کہا کہ میں ان کے گھر پہنچ جاؤں اور وہاں سے وہ اور ان کی بیوی میرے ساتھ چلیں گے۔ میں ان کے ہاں پہنچا تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ میں ابھی دروازے پر ہی کھڑا تھا کہ ان کی بیگم آ گئیں۔ وہ کوئی پچاس سے اوپر ہوں گی بہت سمارٹ اور ڈائٹنگ کر کر

کے صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ موسم کچھ گرم تھا۔ انھوں نے ایک ڈھیلا سا بنیان اور ایک نیکر پہنی ہوئی تھی پیروں میں چپل تھے اور کندھے سے ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ وہاں کے فیشن کے مطابق ان کی نیکر کے پائنچے بے سلے تھے اور ان میں سے پھوسڑے لٹکے ہوئے تھے، ان پھوسڑوں کو لٹکانے کے لیے کپڑے کو بڑی احتیاط کے ساتھ بڑے بے ڈھنگے طریقہ سے ایسے پھاڑا جاتا ہے کہ دھاگے لٹکے رہیں۔ ان کا فلیٹ درمیانہ قسم کا تھا لیکن کار بہت ہی زبردست تھی۔ ہم غالباً شالیمار ریسٹورنٹ گئے۔ کھانے کے دوران انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہم امریکی آپ لوگوں کی اتنی مدد کرتے ہیں پھر بھی آپ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ امداد (ایڈ) تو دیتے ہیں۔ پاکستان کو خود کفیل نہیں ہونے دیتے۔ وہاں انڈسٹری نہیں لگنے دیتے۔ وہ بولے کہ آپ چاہتے ہیں میں اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارلوں۔ آپ کو انڈسٹری لگا کر دوں تا کہ آپ میرے مقابلے پر آ جائیں۔

میں نے واشنگٹن جانے کا ذکر کیا تو مسز موریسن نے بتایا کہ ان کا چھوٹا بیٹا وہاں رہتا ہے میں اس کا پتہ لے کر بس کے ذریعہ واشنگٹن کے لیے روانہ ہوگیا۔ غالباً ویک اینڈ تھا اس لیے ہائی وے پر دونوں جانب زبردست رش تھا اور قدم قدم پر ٹریفک جام ہو رہے تھے۔ راستہ میں ہم ایک ہوٹل پر ٹھہرے۔ امریکہ میں عمارتیں واقعی بہت خوبصورت اور انوکھے ڈیزائنوں میں بنائی جاتی ہیں۔ اب تو پاکستان میں موٹر وے پر اس طرح کے ہوٹل بن گئے ہیں ان کی عمارت بہت ہی خوبصورت ہوتی ہیں اور ان کا ماحول بھی بڑا دلکش ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جن دوسری عمارتوں نے مجھے متاثر کیا وہ وہاں کے فیونرل ہوم یا مردہ خانے تھے اتنے خوبصورت کہ ایک مرتبہ تو مرجانے کو ہی جی چاہتا ہے۔ ہوٹل پر تھوڑی دیر قیام کرنے اور کچھ مشروبات لینے کے بعد ہم پھر واشنگٹن کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں جان موریسن کے ہاں پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، غالباً تین روز میں ان کے ہاں مہمان رہا۔ یہ نوعمر شادی شدہ جوان تھے اور ان کی ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ ہم چاروں فرصت کے اوقات میں سیر و تفریح کے

لیے نکل جاتے ، وہاں کے عجائب گھر، لائبریریاں ، وہائٹ ہاؤس اور کیپٹال کے علاوہ ہم پینٹاگون بھی گئے اور CIA کے ہیڈ کواٹر بھی۔ یہاں مختلف قسم کے آلات (Gadgets) دیکھنے کو ملے۔ مثلاً ایک کمرہ میں ایک بلب تھا جو مسلسل جلتا بجھتا رہتا تھا ہمیں بتایا گیا کہ جب امریکہ میں کسی جگہ ایک قتل ہوتا ہے تو یہ بلب جلتا ہے اور یہ بلب برابر ٹمٹا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ تقریباً ایک فٹ قطر کی ایک چار فٹ لمبی ٹیوب کی تصویر تھی جس پر لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ بتایا گیا کہ یہ ایک انسانی بال کی تصویر ہے جسے کئی ہزار بلکہ لاکھ گنا بڑا کر کے دکھایا گیا ہے۔ ہر انسان کے بال کی ساخت مختلف ہوتی ہے۔ اس سے کسی انسان کی عمر ہی نہیں بلکہ اس کے خاندان اور علاقہ کا پتہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ملزموں کو شناخت کرنے کی اور بہت سی مشینیں تھیں۔ وہائٹ ہاؤس میں بھی گئے۔ کیپٹال میں بھی کیپٹال کے بڑے سے گنبد کے نیچے اگر ایک خاص مقام پر کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ بھی گفتگو کریں تو اس کے بالکل مقابل دوسرے کنارے کے قریب ایک خاص جگہ کھڑے ہوئے لوگ آسانی سے اسے سن سکتے ہیں۔ یہاں مجھے شیراز کا مینار جنباں یاد آیا جسے تہران میں ہماری پاکستانی میزبان مینار جن بن کہتی تھیں۔ یہ ایک مسجد کے دروازے پر بنے ہوئے دو مینار ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ زور لگانے سے ان کو ہلایا جا سکتا ہے اور جب ایک مینار کو ہلایا جاتا ہے تو دوسرا خود بخود اس کے ساتھ ہلنے لگتا ہے۔ یہ قدیم فن تعمیر کا کمال ہے اور کیپٹال کا گنبد جدید فن تعمیر کا۔ غرض واشنگٹن میں سیر بھی ہوئی اور اچھی صحبتیں بھی ملیں۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا کیمرہ تھا جو میں نے نیویارک میں ٹائم سکوئر کے قریب ایک دکان سے خریدا تھا، شام کا وقت تھا۔ میں نے کیمرے کی قیمت پوچھی تو دکاندار نے ۲۰ ڈالر بتائی، میں نے ۱۵ ڈالر لگائے۔ آخر اس نے کہا کہ دکان بند کرنے کا وقت ہے آپ ۱۷ ڈالر دے دیں۔ میں نے ۱۷ ڈالر میں وہ کیمرہ خرید لیا۔ امریکہ اور کینیڈا میں یہی میرے پاس رہا۔ میں نے واشنگٹن میں بھی اس سے بہت سی تصویریں کھینچیں۔ میں نے جان کے گھر کی تصویریں بھی لیں۔ اس کی بیٹی کی بھی اور پھر میاں

بیوی کی۔ وہ دونوں صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی میں نے انھیں فوکس کیا۔ جان کی بیوی اچھل کر اس کی گود میں آ بیٹھی اور اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ ویسے بھی وہ بکنی میں ملبوس تھی۔ بہر حال منظر برا نہیں تھا۔ گو میرے لیے ذرا غیر معمولی تھا۔

ٹائم سکوئر نیویارک میں مین ہاٹن کا سب سے خوبصورت علاقہ ہے۔ یہ ہر قسم کی تفریح کا مرکز ہے۔ یہاں تھیٹر ہیں، سینما ہیں، نائٹ کلبز ہیں جن میں ٹاپ لس اور باٹم لس ڈانس ہوتے ہیں۔ شراب خانے ہیں، جوا خانے ہیں۔ یہاں ننگی تصویروں اور فحش لٹریچر کا بھی بڑا کاروبار ہے۔ سلوٹ مشینیں Slot Machines بھی ہیں جن پر بلیو فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ایک ڈالر ڈالیں تو ایک منٹ تصویر چلتی ہے۔ یہاں اکثر بوڑھے امریکی فلمیں دیکھتے نظر آتے ہیں جو کھٹا کھٹ ڈالر پر ڈالر ڈالے جاتے ہیں۔ فلمیں ہی اس طرح ترتیب دی جاتی ہیں کہ دیکھنے والا ایک حصہ کے ختم ہونے کے بعد دوسرے حصہ کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ غرض ہر قسم کی فحاشی کی انتہا اس بازار میں مل جاتی جو ہر وقت طرح طرح کی روشنیوں سے جھلملاتا رہتا ہے۔ یہاں ریڈیو سٹی سینما ہال بھی ہے جس میں دنیا کی سب سے بڑی فلم سکرین ہے۔ اس میں فلمیں بھی ہوتی ہیں اور سٹیج شو بھی۔ اس کے پروگرام مسلسل چلتے رہتے اور لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہاں میں نے مشہور مزاحیہ فلم اوڈ کپل Odd couple اور کچھ سٹیج شو دیکھے۔ اسی علاقہ میں ٹائم میگزین اور ریڈرز ڈائجسٹ کی بڑی بڑی عمارتیں بھی ہیں۔ یہاں ہمیشہ زبردست ہجوم رہتا ہے۔ ایک روز ایک ڈاکٹر صاحب نے مجھے سیر اور فلم کی دعوت دی۔ ہم ان کی گاڑی میں مین ہٹین گئے۔ وہاں اتر کر کچھ کھانے پینے اور پھر فلم دیکھنے کا پروگرام تھا۔ کوئی ایک گھنٹے تک اس جدید ترین جزیرے پر پھرتے رہے۔ لیکن کہیں پارکنگ کی جگہ نہیں ملی اور آخر واپس آ گئے۔ یہاں پارکنگ کی جگہ پارکنگ میٹر لگے ہوتے ہیں، آپ ایک ڈالر ڈالیں اور ایک گھنٹے تک گاڑی وہاں کھڑی رہ سکتی ہے۔ میٹر پر وقت کی سوئی چلتی رہتی ہے وہاں انسپکٹر گشت کرتے رہتے ہیں۔ جس گاڑی کا پارکنگ کا وقت ختم ہو جاتا ہے اس کا چالان

کر کے پرچی گاڑی کی ونڈ سکرین پر لگا دیتے ہیں۔

ہمارے ہندوستانی اور پاکستانی بھائی یہاں بھی ہاتھ کی صفائی دکھانے سے باز نہیں رہتے۔ایک مرتبہ ہم ایک سردار جی کے ساتھ بازار گئے۔کافی دیر تک ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔ سردار جی نے گاڑی پارک کی لیکن میٹر نہیں چلایا اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔قریب ہی کھڑی ہوئی گاڑی پر چالان کی پرچی لگی ہوئی تھی۔سردار جی نے وہ پرچی اٹھائی اور اپنی گاڑی پر لگا دی اس طرح انسپکٹر سمجھیں گے کہ اس گاڑی کا تو چالان ہو چکا ہے اور پہلی والی گاڑی کے دو چالان ہو جائیں گے۔

نیو یارک کی سڑکوں پر ایشیائی لوگوں کے گھروں کی پہچان بہت آسان تھی۔ جہاں سے بھی مصالحہ بھننے یا بھنگارنے کی خوشبو آئی بس جان گئے کہ یہ کسی پاکستانی یا ہندوستانی بھائی گھر ہوگا۔گھنٹی بجائی اور مہمان ہو گئے۔

نیو یارک میں سڑکوں کے جس طرح جال بچھے ہوئے ہیں یہ پہلے بھی تصویروں میں دیکھے تھے اور اس کا کچھ اندازہ تھا کہ کس طرح سڑکوں پر سڑکیں کئی کئی منزلوں میں بنی ہوتی ہیں اور ان میں داخل ہونے اور ان سے نکلنے کے راستے کس قدر خوبصورت ہوتے ہیں لیکن یہاں کے سب وے کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔مین ہیٹن میں ریلوں کا سارا انظام زیر زمین ہے لیکن دوسرے علاقوں میں یہ ریلوے لائنیں سڑکوں کے اوپر آ جاتی ہیں۔مثلاً کوئنز میں سڑک کے اوپر کوئی ۲۰ فٹ کی اونچائی پر دونوں طرف ریل کی پٹڑیاں ہیں اور جب ریل ان پر سے گذرتی ہے تو اس قدر شور ہوتا ہے کہ بازار میں بات کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔پھر کوئینز سے باہر نکل کر تو اوپر تلے ریل کی تین چار پٹڑیاں بنی ہوتی ہیں اور ایک جگہ تو ریل اوپر کی پٹڑی سے نیچے کی پٹڑی پر بھی اترتی ہے۔پھر یہ صرف ننگی پٹڑیاں ہیں۔نہ ان کے گرد کوئی جنگلہ ہے اور نہ نیچے کوئی پلیٹ فارم پوری گاڑی یوں لگتی ہے جیسے ہوا میں چل رہی ہو۔اس سے گڑگڑاہٹ بھی بہت ہوتی ہے اور اِدھر اُدھر نظر کرنے سے ڈر بھی لگتا ہے یہ ریلوے سسٹم بھی کسی عجوبے سے کم نہیں ہے۔

کینیڈا

میں نے کوئی آٹھ دس روز تک کینیڈا کی سیر کی۔وہاں اوٹاوا میں میرے ایک نوجوان دوست میرین بایولوجی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔یہ مشہور محقق اور نقاد پروفیسر عبادت بریلوی کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔میں نے خط لکھ کر انھیں اپنے آنے کی اطلاع دی اور روانہ ہو گیا۔وہاں وہ دو اور طالب علموں کے ساتھ ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ان کے ساتھ یونیورسٹی بھی گئے وہاں اور ہندوستانی، پاکستانی اور کینیڈین نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔کافی تفریح رہی۔کلب، بار، ریسٹورنٹ سب جگہ گئے۔نائٹ کلبز میں بھی گئے۔یونیورسٹی کے فنکشنز Functions میں بھی گئے۔کیبرے سائکے ڈیلک ڈانسز اور بیٹ ڈانسز وغیرہ میں بھی گئے۔ہمارے دوست بھی ہماری طرح کافی مشرقی تھے اور وہ اس معاشرے میں ایک حد سے آگے نہیں جاتے تھے۔

ایک روز وہ ہمیں مانٹریال لے گئے۔وہاں ابھی ابھی Expo۶۸ ختم ہوا تھا۔نمائش اب بھی جاری تھی۔وہاں ہم نے خوب سیر کی اس کے بعد بازاروں میں گھومے۔میک گل یونیورسٹی بھی گئے۔ایک بات یہاں بڑی عجیب محسوس ہوئی۔اوٹاوہ کینیڈا کی اونٹا ریو سٹیٹ میں ہے اس کی زبان انگریزی ہے۔مانٹریال کیوبک میں ہے جس کی زبان فرانسیسی ہے۔انگریز نژاد اور فرانس نژاد لوگوں میں زبردست رقابت بلکہ مناقشت ہے۔نسلی تعاصب کا جیسا مظاہرہ یہاں کی اس ترقی یافتہ دنیا میں دیکھا ویسا تو ہمارے پسماندہ ممالک میں بھی نہیں۔اونٹاریو میں فرانسیسی سے اور کیوبک میں انگریزی زبان سے سخت نفرت ہے اس کا اندازہ ہمیں یوں ہوا کہ کیمرے کی فلم ختم ہو گئی تھی۔ہم مانٹریال میں ایک فوٹو گرافر کی دکان پر فلم کی ریل خریدنے گئے تو دکان دار سے فلم مانگی۔اس نے فرانسیسی میں ''لے پالا نگلے'' یعنی

میں انگریزی نہیں جانتا کہا۔ہم خاموشی سے وہاں شوکیس میں رکھے ہوئے کیمرے دیکھنے لگے اور دکان دار کاؤنٹر کے پیچھے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔میرے دوست نے ایک کیمرے کو دیکھ کر کہا کہ یار یہ کیمرہ بڑا اچھا ہے۔مگر دکان دار کو انگریزی نہیں آتی۔یہ بات انھوں نے انگریزی میں کی اور انگریزی میں ایک آدھ گالی بھی اسے دے ڈالی۔دکان دار فوراً کاؤنٹر سے باہر آگیا اور بڑے اخلاق سے اس نے ہم سے پوچھا جنٹلمین۔''وچ کیمرہ ڈو یو لائک''۔ہمیں تعجب ہوا کہ وہ نہ صرف انگریزی سمجھتا ہے بلکہ بولتا بھی ہے۔تب اندازہ ہوا کہ یہ کیمرے کی ایک ریل کے لیے اپنی قومی غیرت کا سودا نہیں کرتے۔ہاں اگر سودا بڑا ہو تو پھر کوئی تعصب نہیں رہتا۔بہرحال، کافی دیر اس سے باتیں ہوتی رہیں۔سودا تو نہیں بنا لیکن یہ دیکھ کر بڑی تسلی بلکہ کچھ فخر بھی ہوا کہ ہمارے لوگ''وحشی اور ان پڑھ''ہونے کے باوجود اتنے تنگ نظر نہیں۔سندھ میں اردو اور سندھی کا بڑا جھگڑا ہے۔لیکن ایسا تعصب وہاں بھی کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔پنجابیوں اور بنگالوں میں بھی ایک وقت بہت کشیدگی بلکہ نفرت تک رہی۔لیکن یہ زہر عام کاروباری زندگی تک نہیں پھیلا۔اسی طرح کا تجربہ اوٹاوہ میں بھی ہوا۔اوٹاوہ کے ساتھ ساتھ ایک دریا بہتا ہے جس کے دوسری طرف ہل کا شہر ہے۔بالکل اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا لاہور اور شاہدرہ کا۔لیکن اوٹاوہ میں کوئی فرانسیسی نہیں سمجھتا اور ہل میں کوئی انگریزی نہیں سمجھتا۔ان دو قومیتوں کے درمیان اتنا تعصب ہے جتنا منقسم ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بھی نہیں تھا۔

اوٹاوہ سے چل کر میں ٹورنٹو پہنچا۔یہ بھی ایک خوبصورت شہر ہے اور یہاں بھی کافی پاکستانی رہتے ہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں میں صرف ان ہی پاکستانیوں اور ہندوستانیوں سے ملتا تھا جن کو اچھی طرح جانتا تھا۔ورنہ میں ان سے بچنے کی ہی کوشش کرتا تھا۔ایک رات قیام کے بعد میں نیاگرا کی آبشار کے لیے روانہ ہوگیا۔Paying Guest کے طور پر وہاں ایک کمرہ مل گیا۔وہاں میں دو رات ٹھہرا۔یہاں کوئی تین روز خوب

سیر کی۔زیادہ وقت امریکی اور کینیڈین سیاحوں کے ساتھ گذرا۔نیاگرا کی آبشار کینیڈا میں ہے۔جب کہ اس سے ایک چھوٹی آبشار امریکی علاقے میں بھی ہے۔نیاگرہ بہت مانوس جگہ لگی اس لیے کہ فلموں میں کئی بار اس کو دیکھا تھا۔یہاں بھی کلب ہیں، ہوٹل ہیں اور ریسٹورنٹ ہیں اور تفریح کے اور بھی مشاغل ہیں۔نیاگرا کی سیر کے لیے ٹکٹ کے ساتھ برساتیاں بھی ملتی ہیں اس لیے کہ آبشار کی بوچھاڑیں بہت دور دور تک جاتی ہیں۔اس کے علاوہ وہاں شور بھی اتنا ہوتا ہے کہ باتیں کرنا ممکن نہیں ہوتا۔یہاں اوپر نیچے کئی چبوترے بنائے گئے ہیں جن پر سیڑھیوں کے ذریعہ چڑھا جاتا ہے۔یہ بھی خاصہ تماشہ ہے۔اس طرح اس آبشار کا نظارہ مختلف اونچائیوں سے کیا جاسکتا ہے۔

امریکہ اور کینیڈا کے درمیان ویزا کا مسئلہ نہیں ہے۔صرف پاسپورٹ ہی کافی ہے۔چنانچہ میں نیاگرا سے پھر امریکہ میں داخل ہوا اور بوفالو سے ہوتا ہوا نیویارک واپس پہنچ گیا اور پھر ہسپتال کے اسی ہوسٹل میں پھر ان ہی مانوس چہروں کے درمیان۔

مین ہٹن سے کچھ فاصلہ پر امریکہ کا ایک اور علاقہ ہے۔یہ ایک جزیرہ ہے۔کوئنز اور بروکلین کے علاقے مین لینڈ پر واقع ہیں جب کہ ایک دریا۔ایسٹ ریور۔کو پار کرکے مین ہٹن اور برونکس کے علاقوں میں پہنچا جاتا ہے۔اس کے علاوہ ان چاروں کاؤنٹیز سے علیحدہ ایک اور بھی کاؤنٹی ہے، رچمنڈ کاؤنٹی۔جو ایک جزیرے پر واقع ہے۔اس کا نام سٹیٹن آئی لینڈ ہے۔سٹیٹن کو اس زمانہ میں آباد کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں اور دیگر مراعتوں اور سہولتوں کے ساتھ ساتھ ایک فیری سروس بھی تھی۔تقریباً ۱۵ کلومیٹر کے اس فاصلہ کے لیے کرایہ صرف ۵ سینٹ تھا۔یعنی اس وقت کے حساب سے ۲۵ پیسے۔یہ بہت خوبصورت آبی راستہ تھا اور فیری لبرٹی کے مجسمہ کے قریب سے گذرتی۔بہت خوبصورت منظر تھا۔ویسے سٹیٹن آئی لینڈ میں اور کوئی دلچسپی کی چیز نہیں تھی۔ایک چھوٹی سی صاف ستھری پہاڑی آبادی تھی۔یہاں لوگ بھی خال خال ہی نظر آئے۔

امریکہ میں قیام کے دوران میرے ویزے کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے خدشہ تھا کہ انگلینڈ پہنچتے ہی مجھے واپس پاکستان جانا پڑے گا اس لیے کہ ٹیوشن فیس وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ ڈر تھا کہ لندن پہنچ کر کہیں پاسپورٹ کی تاریخ کی توسیع میں کوئی مشکل پیدا نہ ہو۔ چنانچہ میں ڈرتے ڈرتے نیویارک میں انگلستان کے کونسلیٹ میں گیا۔ وہاں انھوں نے میری توقع کے خلاف بغیر کسی پوچھ گچھ کے میرے ویزے کی تاریخ بڑھا دی۔

....

(۶)

کیمبرج میں واپسی

تین ماہ گذار کر امریکہ سے لندن کے لیے روانہ ہوا۔ جہاز میں تمام وہی لوگ تھے جو تین ماہ پہلے BUNAC کی انجمن کے حوالے سے یہاں پہنچے تھے۔ تقریباً آدھی رات کے وقت کوئی بارہ بجے ہم نیویارک سے روانہ ہوئے۔ ابھی ایک گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ سورج نمودار ہونا شروع ہو گیا۔ سوچا تو بات سمجھ میں آ گئی کہ ہم اب مشرق کی طرف سفر کر رہے تھے اور ہم نے راستہ میں ہی سورج کو پکڑ لیا تھا یا واپسی بھی شاید کوئی نفسیاتی عمل ہے کہ واپسی کا راستہ ہمیشہ چھوٹا ہی لگتا ہے۔ ہم جلد ہی بحر اوقیانوس کو عبور کر کے یورپ میں داخل ہو گئے اور کچھ ہی دیر میں انگلستان پہنچ گئے۔ لیکن اس مرتبہ ہمارا جہاز ہیتھ رو کے ہوائی اڈے پر نہیں اترا بلکہ لندن کے دوسرے ہوائی اڈے Gatwig پر اترا۔

میں نے شاید پہلے بھی لکھا ہے کہ انگریز سفر بہت کم کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ پڑھنے والے کئی انگریز طالب علموں نے بتایا کہ انھوں نے کیمرج آتے ہوئے زندگی میں پہلی مرتبہ ریل میں سفر کیا تھا۔ ہوائی جہاز میں بیٹھنا تو بہت ہی دور کی بات تھی۔ جب جہاز ہوائی اڈے پر اترنے لگا تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ نیچے اترتے ہوئے جہاز لرزنے لگا۔ میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا انگریز لڑکا خوف سے کانپنے لگا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ میں نے ہلکے سے اس کا ہاتھ دبایا اور اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو ایک دم وہ باقاعدہ رونے لگا۔ اس نے روتے روتے کہا کہ مجھے کچھ ہو گیا تو میری ماں تو رو رو کر مر جائے گی۔ میں نے اس کو بتایا کہ اس طرح کی جھنجھناہٹ سے جہاز کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اسی دوران جہاز آرام سے زمین پر اتر گیا۔

ہوائی اڈے سے میں سید ھا بدر صاحب کے گھر ہیسٹن ولیج پہنچا۔ پتہ لگا کہ پیسوں کا بندوبست نہیں ہوسکا اور کہیں سے کوئی امید افزا خبر بھی نہیں آئی۔ چنانچہ میں نے کیمرج پہنچ کر سب دوستوں کو اطلاع دی کہ میں واپس پاکستان جا رہا ہوں۔ میرے انگریز دوست خاص طور سے بہت غمگین ہوئے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ میں ٹیوٹر سے ملوں۔ میں نے بتایا کہ میں تمام ممکن کوششیں کر چکا ہوں اور اب واپسی ناگزیر ہے۔ اگلے روز میں نے سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ ابھی میں چیزیں سمیٹ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکے نے اطلاع دی کہ میرا ٹیلیفون ہے۔ میں کامن روم میں پہنچا۔ لندن سے بدر صاحب بول رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو۔ میں نے جواب دیا سامان باندھ رہا ہوں۔ جواب آیا کہ رہنے دو اور فوراً لندن پہنچو۔ تمھارے لیے ایک خبر ہے۔ چنانچہ میں لندن پہنچا۔ بدر صاحب نے مجھے ایک تار پکڑایا جو پاکستان سے آیا تھا۔ تار پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی طرف سے تھا کہ پنجاب یونیورسٹی سے میرا وظیفہ منظور ہو گیا ہے۔ میرے کام اسی طرح بس آخری وقت پر ہوتے ہیں اگر یہ تار دو دن دیر سے آتا تو میں شاید انگلستان چھوڑ چکا ہوتا کیوں کہ اب میرے پاس صرف ٹکٹ کے پیسے رہ گئے تھے اور دو دن کا بھی اثاثہ نہیں تھا۔ کیمرج پہنچنے پر کالج کے ماسٹر اور وائس چانسلر کا پیغام ملا کہ انھیں بھی پاکستان سے تار مل چکا ہے۔

پڑھائی پھر سے شروع ہو گئی۔ ساتھ ہی ساتھ غیر نصابی سرگرمیاں بھی تیزی سے جاری ہو گئیں۔ پہلے ریمنڈ ولیمز صاحب میرے سپروائزر مقرر ہوئے۔ لیکن ان سے ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی تھی تو اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت گذر جاتا۔ تھیسس کا کوئی ذکر ہی نہ آتا۔ کچھ سینئر لوگوں نے مشورہ دیا کہ مجھے ریمنڈ ولیمز صاحب سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ عمومی استفادے کی حد تک ان سے تعلقات رکھنا ٹھیک ہے لیکن باقاعدہ کسی سنجیدہ موضوع پر کام کرنے کے لیے ان سے کوئی خاص مدد نہیں ملے گی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ خود اپنے تحقیقی کاموں میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ کسی اور کو وقت دے ہی نہیں سکتے۔

دوسرے سینئر اساتذہ کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ انھیں اپنا نام تو پیدا کرنا ہوتا نہیں۔ پہلے ہی وہ ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہوتے ہیں اور پھر یہ کہ وہ اب اتنی محنت اور عرق فشانی بھی نہیں کر سکتے جتنی کوئی نوجوان کر سکتا ہے۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ میں کوئی نسبتاً کم عمر سپروائزر تلاش کروں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ میرے بہت اصرار پر ایمنڈ ولیمز صاحب نے مجھے اپنے ایک اور سینئر محقق طالب علم کے سپرد کر دیا کہ میں اپنے مقالے اسے دکھا کر اس سے مشورہ کر لیا کروں۔ بعد میں وہ خود بھی انھیں دیکھ لیں گے۔ میں اس انتظام سے کچھ مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اپنے ٹیوٹر سے یہ تمام حالات بیان کیے تو انھوں نے مجھے ایک اور سپروائزر کے حوالے کر دیا۔ یہ تازہ تازہ جنوبی افریقہ سے نکالے گئے تھے اور غالباً اپنی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے وہاں سے ملک بدر کیے گئے تھے۔ یہ تقریباً میری ہی عمر کے تھے۔ ان کا نام مائیکل ایگن تھا۔ ان سے بہت اچھے مراسم پیدا ہو گئے اور وہ میرے کام سے بہت خوش بھی تھے بلکہ اتنے متاثر تھے کہ جب وہ امریکہ گئے تو میرا تحقیقی مقالہ بھی ساتھ لے گئے تاکہ وہاں اسے چھپوا سکیں۔ اس کے بعد ان کا پتہ نہیں چلا شاید پھر کسی انقلابی تحریک میں شامل ہو گئے ہوں۔

کچھ عرصہ ایک اور نوجوان استاد نے بھی ہمیں پڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن انھیں علم و ادب سے کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ لیکن یہ ہمارے ڈائرکٹر آف سٹڈیز بھی تھے۔ ان کا نام بیکر سمتھ تھا۔ سیمینار میں زیادہ تر اپنی بیوی کی تعریفیں کرتے رہتے۔ ایک روز سرِ راہ ملاقات ہوئی تو کوئی دو ڈھائی سال کے اپنے بچے کو اٹھائے ہوئے تھے اور بظاہر بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ میں نے بچے کی تعریف کی۔ کہنے لگے بڑا ذہین بچہ ہے۔ چاند کو کیلا کہتا ہے اور یہ کہہ کر بہت ہنسے۔ معلوم ہوا کہ کیمرج میں بھی ہمیشہ ہی میرٹ یا صلاحیت وغیرہ نہیں چلتے۔ اقربا پروری بھی چلتی ہے۔ یہ صاحب ایل سی نایٹ کے بہت چہیتے تھے۔

پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیاں اور سپورٹس بھی شروع ہو گئے۔ میں سکواش ٹیم میں شامل ہو گیا۔ فٹ بال اور کرکٹ میں لوگوں کی دلچسپی زیادہ

تھی۔اسی طرح کشتی رانی کا شوق بھی کم نہیں تھا۔پنٹنگ یہاں بہت مقبول تھی پنٹ Punt بڑی بڑی کشتیاں ہوتی ہیں جنھیں لمبے لمبے بانسوں سے دھکیل کر چلایا جاتا ہے۔پھر کشتیوں کی دوڑیں بھی ہوتی ہیں۔لندن میں آکسفورڈ سے مقابلہ کے لیے کیمرج کی کشتی رانی کی ٹیم نے زبردست تیاریاں شروع کردیں۔کرکٹ،شہ سواری اور باکسنگ کے آکسفورڈ اور کیمرج کے درمیان مقابلے کیمرج میں ہی ہوئے۔فٹ بال کا مقابلہ بھی دونوں یونیورسٹیوں کے درمیان کیمرج میں ہی ہوا۔ان تمام مقابلوں میں دونوں ٹیموں کے حامی گلے پھاڑ پھاڑ کر اپنی اپنی ٹیموں کے حوصلے بڑھاتے رہے۔ہر مقابلے کے بعد اچھا خاصہ جشن ہوتا تھا اور ضیافتیں بھی ہوتی تھیں۔شہ سواری اور باکسنگ میں میرے بہت ہی عزیز دوستوں کو یونیورسٹی کلر ملے۔کرکٹ میں بھی اس وقت ماجد خان کھیل رہے تھے اور پاکستانی بڑے شوق سے یہ میچ دیکھنے آتے تھے۔

ساتھ ہی ساتھ ادبی سرگرمیاں بھی زوروں پر تھیں۔ہیلن گارڈنر اور ڈیوڈ ڈئشیز باہر سے لیکچر دینے آئے۔لیوئس ایڈورڈ بانڈ اور دوسرے شعرا نے اپنی نظمیں سنائیں۔مقامی لوگوں میں سے ایف آر لیوس اور ایل سی نایٹ وغیرہ نے مقالے پڑھے۔غرض خوب گہما گہمی رہی۔ساتھ ہی ڈراموں کا سیزن بھی شروع ہوا۔کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی نے پنٹر کے دو ڈرامے پیش کیے۔دوسری سوسائٹیوں نے ایڈیپس ریکس اور دوسرے ڈرامے سٹیج کیے۔ایک سوسائٹی میں ایکٹروں کے لیے ٹریننگ کی کلاسیں ہوتیں۔پہلے سال کے امتحانات کے نتائج اچھے رہے اور دوسرا سال اس کے ساتھ ہی شروع ہوگیا۔اسی دوران لندن میں آنا جانا بھی ہوتا رہا۔

موسم سرما کی چھٹیوں تک پڑھائی بڑے زور شور سے جاری رہی۔پھر دسمبر کی چھٹیاں شروع ہوتے ہی سٹرٹیفرڈ اپان ایون کا پروگرام بنا وہاں اس زمانہ میں شیکسپیر کا مشہور کھیل کنگ لیئر لگا ہوا تھا۔کچھ دوستوں نے کوشش کی اور بڑی مشکل سے وہاں کے ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ایک جرمن،جو کرمنالوجی میں ٹرائپوس کر رہا تھا۔ایک ہم

جماعت انگریز اور ایک غالباً ہنگریئن پوسٹ گریجویٹ سٹوڈنٹ کے ساتھ ایک صبح کیمرج سے کار میں روانہ ہوئے۔راستہ میں ریڈیو لگایا تو بی بی سی سے خبریں ہو رہی تھیں۔
ہنگیریئن دوست نے ایک لطیفہ سنایا۔جو ہے تو واقعہ ہی لیکن لطیفہ بن گیا۔اس نے کہا کہ یہ انگریز بڑے خود پسند ہوتے ہیں اور اپنی باتیں بڑی بڑھ چڑھ کر بیان کرتے ہیں ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہتے ہیں اور اسے گریٹ برٹن کہتے ہیں۔اس نے کہا کہ ایک روز بی بی سی پر خبریں ہو رہی تھیں۔موسم کا حال بتایا جا رہا تھا۔خبریں پڑھنے والا کہہ رہا تھا کہ برٹش چینل پر زبردست دھند ہے(اس نے یہاں لقمہ دیا کہ صرف انگریز ہی اسے برٹش چینل کہتے ہیں)اس دھند کی وجہ سے Continent یعنی یورپ کٹ کے رہ گیا ہے۔گویا یہ چھوٹا سا جزیرہ کانٹینٹ سے نہیں کٹا بلکہ کانٹینٹ اس سے کٹ گیا ہے۔بہر حال ہم مختلف مانوس ناموں کے شہروں سے گذرتے ہوئے سٹیرٹیفرڈ پہنچے راستہ میں وارک کا تاریخی شہر اور کوونٹری کا گرجا گھر دیکھا جو ایک اچھا خاصا شیش محل تھا اور جسے غالباً جنگ عظیم میں تباہ ہونے کے بعد نئے سرے سے تعمیر کیا گیا تھا۔

یہاں ایک بڑا دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ سٹرینفرڈ میں KING LEAR دیکھنے کے بعد جت ہم کیمرج کے لیے چلے تو راستہ میں نارتھ ایمپٹن کا شہر آیا ایک گول چکر سے گھوم کر ہم کیمرج کی طرف بڑھے۔لیکن آدھے گھنٹہ کے بعد ہم پھر اسی جگہ پر تھے۔اس مرتبہ اس کے بعد راستہ پوچھ کر مڑے۔ڈرائیور صاحب غالباً نشہ میں دھت تھے۔بہر حال تھیٹر بہت بڑا تھا۔لیکن سادہ سا ہی بنا ہوا تھا۔ہمیں سب سے آخر میں تقریباً چھت کے قریب سیٹیں ملیں۔شیکسپیر کے ڈرامے اس قدر کثرت سے ہوتے ہیں اور اتنی عقیدت سے پیش کیے جاتے ہیں کہ وہ کم وبیش Stereotype ہو کر رہ گئے ہیں اور چاہے کوئی چھوٹی سی کلب ہو یا سٹریفرڈ کا شیکسپیر تھیٹر ڈراموں کے پیش کرنے کا انداز ایک ہی جیسا ہے۔فنی مہارت کا فرق البتہ ہوتا ہے۔

ڈرامہ سے زیادہ دلچسپ سٹرٹیفرڈ کے چھوٹے سے شہر کی سیر تھی۔ یہاں ایک چرچ میں شیکسپیر کا مجسمہ جو ایک Bust ہے رکھا ہوا ہے یعنی دھڑ سے اوپر کا حصہ۔ حسبِ دستور تھیٹر میں بھی اور شہر میں بھی امریکیوں کی اکثریت تھی۔ انگریز لوگ امریکیوں کو پوری طرح بے وقوف بناتے ہیں اور نئے نئے طریقوں سے ان سے پیسے اینٹھنے کی کوشش کرتے ہیں ایک بہت ہی دلچسپ طریقہ یہ ہے کہ ایک ایک پونڈ میں چند انچ زمین سیاحوں کو بیچی جاتی ہے۔ خریدنے والے کو باقاعدہ ایک مستند قبالہ (Title Deed) بھی دیا جاتا ہے۔ قانونی حیثیت سے البتہ اس قطعہ زمن کے خریدار کو انگلستان میں صاحبِ جائیداد تصور نہیں کیا جاسکتا یہ بھی اسی طرح کا ایک فراڈ ہے جیسا کہ شیکسپیر کا مجسمہ۔ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک اتنا بڑا ڈرامہ نویس جو خود اپنے زمانے میں زبردست خراج تحسین وصول کر چکا تھا اور آج بھی انگریزوں کے لیے باعثِ فخر ہے اس کی زندگی کے حالات آج بھی ایک معمہ ہیں۔ مغربی تحقیق تو اس مقام تک پہنچ گئی ہے کہ اب کوئی راز راز ہی نہیں ہے۔ اس کے باوجود شیکسپیر کی ذات اور اس کی زندگی کے حالات ابھی تک ایک بھید ہیں اس کا مجسمہ بھی ہے، گھر بھی ہے، سکول ریکارڈ بھی ہے شاید ایک عدالتی سزا کا ذکر بھی ہے۔ لیکن وہ ہے کون؟ معلوم نہیں۔ لیکن محقق حضرات بھی خاموش نہیں بیٹھے ہیں۔ شیکسپیر کے ڈراموں کے مکالمات میں بیکن کے انشائیوں کی جھلک دیکھ کر کچھ محققین یہ دور کی کوڑی لائے کہ شیکسپیر کے ڈرامے اصل میں فرانسیس بیکن نے لکھے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ڈرامے عام طور پر بھانڈ، میراثی اور بہروپیوں کا فن ہے اور اس کو معاشرہ میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا تعلق اعلیٰ طبقوں سے تھا وہ ڈرامے لکھتے تھے۔ مگر اس بات کو چھپاتے تھے اور قلمی ناموں سے ڈرامے لکھتے تھے۔ اسی طرح فرانسیس بیکن بھی ڈرامے لکھتا تھا لیکن وہ مملکت کا وزیر تھا اور ریاست میں سب سے زیادہ معزز مقام رکھتا تھا شیکسپیر کے قلمی نام سے ڈرامے رکھتا تھا۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اس زمانے میں اس نام کا ایک اداکار بھی تھا۔ جس کو ایک مرتبہ بکریاں چرانے پر

سزائے موت بھی سنائی گئی تھی۔ گو بعد میں وہ چھوٹ گیا تھا۔ دوسرے محققین بھی پیچھے رہنے والے نہیں تھے۔ فوراً ہی شیکسپیر کی اصلیت پر بحثیں ہونے لگیں اور ۲۰ سے زیادہ معتبر افراد کو شیکسپیر کے ڈراموں کے مصنف کے طور پر پیش کیا گیا۔ ان میں امراء دربار کے علاوہ خود ملکۂ الزبتھ اول کا نام بھی آتا ہے۔ بلکہ ایک خیال تو یہ بھی ہے کہ ایلزبتھ عورت نہیں تھی۔ مرد تھا۔ اسی لیے اس نے شادی نہیں کی حالاں کہ تقریباً ہر نواب زادہ اس سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔ بہرحال یہ تحقیق کی، ستم ظریفیاں ہیں۔ ہمارے ایک نابغۂ روزگار نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ دراصل شیکسپیر انگریز تھا ہی نہیں۔ وہ تو ایک مصری شاعر تھا۔ جو انگلستان ہجرت کر گیا تھا اور اس کا اصلی نام شیخ پیر تھا جو بگڑ کر شیکسپیر ہو گیا۔

اس سے یاد آیا کہ ایک مرتبہ گورڈن کالج راولپنڈی کی مجلس فارسی میں ایک صاحب نے عمر خیام پر ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ عمر خیام تو ایک ریاضی دان تھا جسے شعر جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس کے شعروں کے اس ذخیرہ کو غلطی سے اس کا دیوان سمجھ لیا گیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ عمر خیام کے بہت سے اشعار دو دوسرے شعرا کے دیوانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ قدرت اللہ فاطمی صاحب جو اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے اس تحقیق سے خاصے برہم ہوئے اور انھوں نے فاضل مقالہ نگار سے گذارش کی کہ عمر خیام ایک بہت اچھا شاعر ہے اور ہمیں اس سے محروم نہ کریں اور اپنی تحقیقی صلاحیتوں کا کہیں اور استعمال کریں۔ انگریزوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا اور آخرکار طے کر لیا کہ شیکسپیر کوئی بھی ہو اور اس کی شخصیت کچھ بھی ہو۔ اس کے ڈرامے ہمیں بہت عزیز ہیں اور اسے شیکسپیر کے ڈرامے ہی رہنے دیا جائے اس کے باوجود تحقیقات جاری ہیں۔ ایک صاحب نے لکھا کہ شیکسپیر کے حالاتِ زندگی کتنے ہی پراسرار کیوں نہ ہوں اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں چند باتیں بہت واضح ہیں۔ اس کے ڈراموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک زبردست جہاں گرد تھا اور ملک ملک کے حالات سے واقف تھا۔ اس کے ڈرامے روم، وینس، ڈنمارک اور دوسرے یورپی

شہروں سے متعلق ہیں۔اس کے علاوہ ان ڈراموں سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ شیکسپیر قدیم وجدید یورپ کے علوم وفنون سے بھی بخوبی واقف تھا۔اس کے علاوہ اس کے سانیٹ بھی اس کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں ان سے پتہ لگتا ہے کہ وہ لنگڑا تھا اور اس کی دو محبوبائیں تھیں ایک صبیح Blonde اور دوسری ملیح Brunette اور یہ تمام حقائق ثابت کرتے ہیں کہ غالباً شیکسپیر فرانسس بیکن کا بھائی انتھونی بیکن تھا۔اسے بیکونین تھیوری کہا جاتا ہے۔

کچھ روز لندن میں گھومے پھرے، سالسبری اور ایسٹ اینگلیا اور نارچ میں ایک کزن کے ساتھ کچھ دن گذارے۔اس کے بعد ایڈنبرا جانے کا پروگرام بنا۔ایک پاکستانی دوست انوار رسول اور ایک ہندوستانی طالب علم میسکرے ہینس ساتھ تھے۔کیمرج سے ایک کار کرائے پر لی۔ابھی کیمپس سے نکلے ہی تھے کہ پہلے ہی راؤنڈ اباؤٹ پر ٹریفک انسپکٹر نے روک لیا۔گاڑی انوار رسول چلا رہے تھے۔ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ غلطی کیا ہوئی اور ہمیں کیوں روکا گیا۔اس نے انوار رسول سے غالباً ڈرائیونگ لائسنس مانگا۔وہ کچھ گھبرا گئے اور میسکر ہینس بھی بوکھلا گیا۔اس نے تمام کاغذات کا پلندہ جس میں گاڑی کے کاغذات اور کرایہ نامہ وغیرہ بھی شامل تھے اٹھا کر انسپکٹر کے آگے رکھ دیا۔میں نے کہا کہ ہم کیمرج میں پڑھتے ہیں اور سکاٹ لینڈ جا رہے ہیں اس نے پوچھا کہ آپ کو پتہ ہے آپ کو کیوں روکا گیا۔ہم نے کہا کہ ہمیں نہیں معلوم۔تب اس نے بتایا کہ ہم لوگ راؤنڈ اباؤٹ میں غلط داخل ہوئے تھے۔ایک گاڑی پہلے ہی راؤنڈ اباؤٹ میں موجود تھی اور جب تک وہ باہر نکل نہ جائے کوئی اور گاڑی دائرے کے اندر داخل نہیں ہوسکتی۔بہر حال اس تنبیہہ کے بعد ہم اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔اس ایک واقعہ کے علاوہ انگلستان میں کبھی کسی پولیس والے سے کوئی سابقہ نہیں پڑا۔

یہ برف باری کا موسم تھا اور پورے راستہ پر دونوں طرف میدان برف سے سفید ہو رہے تھے۔درختوں، جھاڑیوں اور گھروں پر بھی برف پڑی ہوئی تھی۔بہت ہی خوشگوار منظر تھا،سڑک پر آمدورفت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔شام تک ہم ایڈنبرا پہنچ گئے کافی گھروں

پر Paying Guest کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ہم نے ایک گھر پر گھنٹی بجائی اور رات کے بسیرے کے لیے تیار ہوگئے۔یہاں ایک رات کا کرایہ ایک پاؤنڈ فی کس تھا۔ناشتہ اس میں شامل تھا۔اچھی صاف ستھری جگہ تھی۔ناشتہ بھی مناسب تھا۔

ایڈنبرا ایک پرسکون خوبصورت شہر ہے جس میں قدیم و جدید کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔یہاں ایک پرانا پرشکوہ قلعہ ہے۔اس کے سامنے وسیع سرسبز باغات ہیں۔میرے ساتھیوں کو یہاں کچھ زیادہ مزہ نہیں آیا۔اس لیے صرف دو رات وہاں قیام کرنے کے بعد کچھ بازاروں کا چکر لگا کر ہم واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔

کیمرج واپس پہنچے اور ٹرائی پاس کے فائنل امتحان کی تیاری میں جٹ گئے ساتھ ہی Dissertation بھی تیار کرنا تھا جو میں نے کسی دوسری یورپین زبان کی جگہ لے لیا تھا۔یہ رعایت غیر ملکی طلباء کے لیے تھی۔اس ٹرم میں سارا زور پڑھنے اور لکھنے پر رہا۔سارا کیمرج پڑھائی میں جتا ہوا تھا اور کسی کو لحہ بھر کی فرصت بھی نہیں تھی کہ مل بیٹھیں یا کھیل کود کی باتیں کریں۔بہت گھر گھر کے گھٹائیں آتی تھیں۔دن بھی راتوں کی طرح سیاہ ہونے لگے۔برف باری بھی زوروں پر تھی۔کمرے میں بہت بڑی کھڑکی تھی جس پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے باہر ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔البتہ باہر برف پڑ رہی ہوتی لیکن کمرہ گرم رہتا۔خالی قمیض میں ہی گذارا ہو جاتا۔ایسے میں کافی کا بڑا لطف آتا۔گرم پانی لینے کے لیے کچن میں جاتے تو کسی سے ہیلو ہیلو ہو جاتی۔کہیں آنے جانے کا سلسلہ بالکل ہی ختم ہوگیا تھا۔البتہ کھانوں کے اوقات میں میس میں یا کامن روم میں لوگوں سے ملاقات ہو جاتی یا ایک آدھ بازی سنوکر کی لگ جاتی اور پھر کمرے میں آکر پڑھائی میں جٹ جاتے۔البتہ لائبریریوں میں رونق کچھ بڑھ گئی تھی۔وہاں بھی سب خاموشی سے اپنے اپنے کام میں لگے رہتے اور کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔لیکچر بھی جاری تھے۔لیکن اب ان میں دلچسپی اتنی نہیں تھی جتنی پہلے سال محسوس ہوتی تھی۔البتہ سپروائزر کے پاس باقاعدہ ہر ہفتہ حاضری دی

جاتی۔مضامین دکھائے جاتے ان پر بحث ہوتی اور اگلی Assignment کی ہدایات لی جاتیں۔اس دوران ایک دلچسپ ملاقات کیمرج کی ایک بزرگ اور قابل احترام شخصیت سے ہوئی۔انھوں نے شیکسپیر پر بھی کچھ کام کیا تھا اور لوگ ان کی علمیت کے قائل تھے۔یہ تھیں مسز کیمبل میرے ہم جماعت ان سے خاصے مرعوب نظر آتے تھے۔مگر مجھے وہ کچھ Abnormal سی لگیں۔باتیں بڑے وثوق کے ساتھ کرتی تھیں اور بڑی جدت پسند تھیں۔مثلاً گولڈنگ کے لارڈ آف دی فلائز، جسے نوبل پرائز ملا تھا (اور جو کہ بہت متنازعہ انعام تھا) اس کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ جس جزیرے پر بچوں کا جہاز گرا تھا اور جہاں وہ کافی عرصہ رہے تھے اگر اس کے نقشہ کو غور سے دیکھا جائے تو وہ ایک دانت کی طرح لگے گا۔ان کے مطابق یہ حضرت عیسیٰ کا دانت ہے اور اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا سبزہ اور جھاڑیاں وغیرہ اس دانت کے مسوڑے ہیں۔بہر حال وہ مستند عالم تھیں مسٹر بیکر سمتھ۔جن کے ذکر پہلے آچکا ہے۔اس کے متعلق تو مجھے یقین تھا کہ وہ سفارشی ہیں لیکن مسز کیمبل کے متعلق میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ کیا چیز ہیں۔یوں تو کیمرج میں بڑے بڑے استاد موجود تھے جن میں ٹونی ٹینز، این رایٹر، والسن، ریڈ پاتھ، مسٹر بیئر، شامل تھے۔(بڑے بڑے نام پچھلے صفوں میں آچکے ہیں)۔لیکن مجھے پروفیسر ایکسٹن سب سے اچھے لگتے تھے۔وہ بڑے خاموش طبع اور کچھ شرمیلے سے تھے۔وہ تنقید کا پرچہ پڑھاتے تھے اور اس وقت سڈنی پر لیکچر دے رہے تھے۔ان کی کلاس میں بہت ہی کم لوگ آتے تھے۔یہی کوئی چار پانچ۔لیکن ان کی علمیت بہت ٹھوس تھی صرف خطابت میں مار کھاتے تھے۔خطابت میں یوں تو ایمنڈ ولیمز بھی کمزور تھے اور جارج سٹائنز کا پورا تضاد تھے اس لیے کہ سٹائز تو پورے پورے خطیب تھے لیکن ریمنڈ ولیمز نظریاتی گروہ ہونے کی وجہ سے بہت مقبول استاد تھے ایکسٹن کے پاس نہ خطابت تھی اور نہ نظریاتی وابستگی۔اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ عالم ہونا ایک الگ بات ہے اور ایک اچھا استاد ہونا الگ۔

یہ ٹرم نسبتاً کچھ زیادہ تیزی کے ساتھ گذرتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کے بعد بہار کی

چھٹیاں آگئیں۔پھر تو پڑھائی کو ایسا چھوڑا کہ جیسے کبھی پڑھتے ہی نہیں تھے۔ان چھٹیوں میں لیک ڈسٹرکٹ اور ویلز وغیرہ دیکھنے کا پروگرام بنا۔

ڈیوڈ کاکس نے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جو باکسنگ میں یونیورسٹی کلر لے چکے تھے۔مجھے اپنے گھر پر کچھ دن گذارنے کی دعوت دی۔چنانچہ ایک روز وہ کار لے کر کیمرج آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے جو ریڈنگ کے قریب ایک چھوٹے سے خوبصورت گاؤں میں واقع تھا۔انگلستان کی اگر خوبصورتی دیکھنی ہو تو شہروں سے دور دیہاتی ماحول میں رہ کر دیکھیں۔ورڈز ورتھ انگلستان کے دیہات اور Rustics کی ایسے ہی تعریف نہیں کرتا تھا۔وہاں کے شہروں کو صنعت وتجارت نے بالکل تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ہر طرف گندگی دھواں اور شور وغل نہ صرف صحت کے لیے مضر ہیں بلکہ ذہنی سکون کے بھی دشمن ہیں۔پھر دولت کی اس ریل پیل میں جو چند لوگوں تک محدود ہے۔وسیع غربت اور بھی تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔یہی وجہ تھی کہ روسو اور ورڈز ورتھ نے دیہات کی سادہ اور فطری زندگی کی طرف لوٹنے کا نعرہ لگایا تھا۔ایک تو فطری مناظر ہی بہت خوبصورت ہیں پھر ورڈز ورتھ کی شاعری نے انھیں اور بھی حسین بنا دیا تھا۔اس رومانویت کا اثر اتنا گہرا تھا کہ ہمارے شاعر اور نقاد بھی دیہات کی خوبصورتی کے گیت گانے لگے۔حالاں کہ ہمارے دیہات شہروں سے بھی زیادہ گندے ہیں۔نہ وہاں بجلی ہے نہ پانی نہ گیس۔جہالت اور غلاظت ہر جگہ عام ہیں۔ہمارے شہروں میں کم از کم بنیادی سہولتیں تو موجود ہیں۔وہاں کے دیہات میں وہ سب کچھ ہے جو وہاں کے شہروں میں ہے۔صرف شور وغل، بھاگ دوڑ، افراتفری اور دھواں اور گندگی نہیں ہیں۔

ڈیوڈ اعصابی طور پر کچھ اکھڑا اکھڑا سا لگتا تھا، حالاں کہ پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔وجیہہ تھا، سمارٹ تھا، کھیلوں میں نمایاں کامیابی حاصل کر چکا تھا۔بہت مہذب اور خوش گفتار تھا۔اس کے باوجود کبھی کبھی بہت پریشان سا نظر آتا تھا۔اس کا گھر بھی بہت خوبصورت تھا۔درختوں، کیاریوں اور سرسبز قطعوں کے درمیان ایک پرانی سی بڑی رومانوی قسم کی عمارت

تھی۔ بالکل الف لیلوی ماحول تھا۔ ان کی رہائش اوپر کی منزل پر تھی۔ زینہ چڑھ کر ایک کشادہ بیڈ روم۔ ساتھ ہی بیڈ روم سے تقریباً دوگنا بڑا ایک باتھ روم جس میں قالین بچھے ہوئے تھے، اس کے آگے ایک اور بیڈ روم اور درمیان میں ایک چھوٹا سا ہال۔ آخر میں بہت وسیع ڈرائنگ روم تھا۔ گھر کو نہایت سادگی سے سجایا گیا تھا۔ کوئی شان وشوکت والی بات نہیں تھی البتہ ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے تو گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ڈیوڈ نے کافی بنائی اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔ اس نے بتایا کہ وہ کیمرج کے بجائے آکسفورڈ میں جانا چاہتا تھا۔ بچپن سے ہی اسے آکسفورڈ اچھا لگتا تھا۔ پھر وہ کیمرج کے مقابلہ میں اس کے گھر سے قریب بھی تھا۔ لیکن داخلہ کے امتحان میں اس کا نمبر کیمرج میں آیا جس کا اسے کچھ افسوس بھی تھا۔ کوئی انگریز اپنے پیسے سے تعلیم حاصل نہیں کرتا۔ تعلیم کے تمام اخراجات کاؤنٹی اٹھاتی ہے البتہ اعلیٰ تعلیم کے لیے مقابلہ کے امتحان سے گذرنا ہوتا ہے جو کہ کافی سخت ہوتا ہے۔

تعلیم لوگوں کی مجبوری نہیں ہے، جیسے کہ یہاں پاکستان میں ہے۔ ایک تو یہ کہ وہاں روزگار کی سہولت خاصی عام ہے۔ بلکہ آسامیاں اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں باہر سے کارندے درآمد کرنے پڑتے ہیں۔ سکول کی تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ اس کے علاوہ صرف وہی لوگ مزید تعلیم کا رخ کرتے ہیں جنھیں پڑھنے لکھنے کا شوق ہو۔ ورنہ جب بھی چاہیں آسانی سے ملازمت کر سکتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ جہاں لڑکے اس لیے پڑھتے رہتے ہیں کہ انھیں کوئی کام نہیں ملتا اور لڑکیاں اس لیے پڑھتی رہتی ہیں کہ ان کے مناسب رشتے نہیں آتے۔ وہاں پر دونوں یہ مسائل نہیں ہیں۔ بلوغت کی عمر کو پہنچ کر لڑکیاں لڑکے والدین کی ذمہ داری نہیں رہتے اور اپنی زندگی کے خود مالک ہوتے ہیں۔ ویسے بھی یہاں پڑھے لکھے اور بے پڑھے لکھے لوگوں کی تنخواہوں میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں ہوتا اور بیروزگاری کی صورت میں گذارا الاؤنس بھی ملتا ہے۔ چنانچہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنی اہلیت ثابت کرنی پڑتی ہے جس کا ذریعہ داخلے

کے امتحانات ہیں چنانچہ ڈیوڈ کو بھی کیمرج میں ہی آنا پڑا۔

ہم ابھی کافی پی رہے تھے کہ قریب کے کسی سکول میں چھٹی ہوئی اور نوعمر لڑکیوں کی ٹولیاں ہماری کھڑکی کے قریب سے گذر رہی تھیں۔ کوئی بارہ سے چودہ سال کی عمر تک کی لڑکیاں ہوں گی۔ ڈیوڈ نے کہا کہ اسی عمر میں یہ لڑکیاں مردوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں اور زیادہ تر بڑی عمر کے لوگ انھیں خراب کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ تمتمانے لگا اور اس کے اعصاب میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میں نے اس کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے بات کا رخ بدل دیا۔ کیمرج میں بھی وہ لڑکیوں سے دور دور ہی رہتا جب کہ وہ اس کے پیچھے لگی رہتیں۔ ایک روز بہت ہی دو اچھی خاصی خوش شکل۔ بلکہ انھیں حسین کہا جا سکتا تھا۔ لڑکیوں نے اس سے دوستی بڑھانے کی کوشش کی تو وہ جھلا گیا اور انھیں اچھا خاصا ڈانٹ دیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ یہ لڑکیاں بڑی عیار ہوتی ہیں۔ جانے کس کا گناہ میرے گلے ڈالنا چاہتی ہیں۔ مجھے یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں لگی۔ وہاں کا ماحول ہی ایسا تھا۔ نہ جانے وہ اس کو کیوں قبول نہیں کرتا تھا۔ اسی زمانے میں کیمرج میں ایک سروے ہوا تھا جس کے مطابق صرف ۳۰ فی صد لڑکیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ بالکل کنواری تھیں اور یہ بھی محض دعویٰ ہی تھا۔ یونیورسٹی میں لڑکے لڑکیوں کو ہر طرح کی آزادی تھی۔ وہ رات کے بارہ بجے تک ایک دوسرے کے ہوسٹلوں میں ٹھہر سکتے تھے اور اجازت لے کر رات کے دو بجے تک بھی مخلوط پارٹیاں عام ہوتی تھیں۔ اس تمام تر آزادی کے باوجود لڑکے اب بھی وفادار لڑکیوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک لڑکا جو نئی نئی لڑکیوں کو اپنے کمرے میں لاتا رہتا ایک دن بڑا اداس سا بیٹھا ہوا ملا۔ میں نے پوچھا تو بولا زندگی سے بے زار ہو گیا ہوں۔ میں نے کہا کہ تمھاری نئی دوست تو بہت خوبصورت اور خوش اخلاق ہے تو وہ بولا کہ اس کی بات نہ کریں۔ وہ بڑی بدکردار ہے۔ کل ایک اور لڑکے کے ساتھ گل چھرّے اڑا رہی تھی۔ میں نے کہا کہ بھائی تم بھی تو روز روز نئی دوستیاں کرتے رہتے ہو تو بولا۔ لڑکیوں کی بات اور ہے۔ تمام تر آزادی کے باوجود وہاں بھی

مرد مرد ہی ہے اور عورت وہاں بھی مظلوم ہے۔ میرے فلیٹ کے برابر ایک عورت رہتی تھی۔ کوئی ۲۵/۲۴ برس کی عمر تھی اور اچھی خاصی خوش شکل تھی۔ اس کے دو بچے تھے اور وہ ان کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ میں نے پوچھا کہ ان کا باپ کہاں ہے تو اس نے بتایا کہ لندن میں کہیں رہتا ہے۔ میرے پوچھنے پر کہ کیا وہ بچوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اس نے بتایا کہ وہ اس کا شوہر نہیں ہے۔ صرف ان بچوں کا باپ ہے اور بچے ماں کی ذمہ داری ہوتے ہیں۔ ہمارے کچھ پاکستانی دوستوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کہ انھوں نے یورپی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ اکثر یہ شادیاں دیرپا نہیں ہوتیں اور علیحدگی کی صورت میں مائیں بچوں کو لے جاتی ہیں۔

ابھی ہم کافی پی کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ ڈیوڈ کی والدہ آ گئیں اور بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ آتے ہی انھوں نے کھانا پینا شروع کر دیا اور اپنے دفتر کی باتیں بتانے لگیں، لگتا تھا وہ وہاں کسی سے جھگڑ کر آئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ان میں بھی ڈیوڈ کی طرح کا جھلا پن تھا اور اچھی خوش شکل ہونے کے باوجود کبھی کبھی باتیں کرتے ہوئے ان کا چہرہ تلخی سے بگڑ جاتا تھا۔ ڈیوڈ نے بتایا کہ اس کا باپ ایک پادری تھا اور اس کے ماں باپ کی آپس میں بہت کم بنتی تھی۔ اب مجھے ڈیوڈ کے ذہنی تذبذب کا کچھ اندازہ ہوا جو ذہنی اقدار کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی ماں سخت مزاج ہو گئی تھی اور وہ خود اعصاب زدہ ہو گیا تھا جب کہ اس کی چھوٹی بہن مکمل طور پر باغی ہو گئی تھی۔

شام ہوتے ڈیوڈ کی بہن سوزین بھی آ گئی۔ وہ ریڈنگ کے ہسپتال میں نرس تھی۔ کافی خوش شکل اور جامہ زیب تھی۔ وہ بھی بڑی گرم جوشی سے ملی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے آتے ہی اس کی ماں اور بھائی دونوں کچھ پریشان سے ہو گئے اور گھبرائے گھبرائے سے نظر آنے لگے۔ میں ساری بات کو بھانپ گیا جو کھل کر اس وقت سامنے آئی جب سوزین شب خوابی کے لباس میں ڈرائنگ روم میں آئی۔ لباس بھی کیا تھا بس تکلف ہی تھا، ایک بالکل ہی شفاف قسم کے نائلون کا گاؤن تھا جس میں سے اس کا سارا بدن اور اندر کا مختصر سا لباس صاف

نظر آ رہے تھے۔ ہم نے وہیں فرش پر بیٹھ کر انگیٹھی کے سامنے کھانا کھایا اور کھانے کے بعد کافی کا دور چلا جس میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ڈیوڈ اور اس کی ماں زیادہ تر خاموش ہی رہے اور کچھ دیر بعد جانے کے لیے اٹھے تو سوزین کو بھی سو جانے کو کہا۔ اس نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا کہ وہ بعد میں سو جائے گی اور اسی طرح مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد میں بھی اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ اگلے روز مجھے لندن جانا تھا۔ ڈیوڈ نے کہا کہ وہ مجھے چھوڑ آئے گا۔ لیکن پھر سوزین آ گئی اور اس نے کہا وہ مجھے ریڈنگ سے بس میں سوار کرائے گی۔ چنانچہ ریڈنگ تک جو کہ تقریباً دس میل کا فاصلہ تھا وہ مجھے ڈرائیو کر کے لے گئی۔ راستہ بھر میں نے اس سے مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے خوشگوار ماحول برقرار رکھا اور وہ بھی خندہ پیشانی سے ہاتھ ملا کر مجھ سے رخصت ہوئی۔ ایک دو روز بعد میں واپس آیا اور ڈیوڈ کے ساتھ ویلز کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ لیکن ویلز جانے سے پہلے ہم باتھ اور ونچسٹر بھی گئے۔ راستہ میں ڈیوڈ نے مجھ سے گلہ کیا اور کہا کہ وہ سوزین کے طرزِ عمل سے سخت پریشان تھے اور جس طرح نیم برہنہ میرے ساتھ بیٹھی رہی وہ اس کے لیے بہت شرمندہ تھے اور پھر حد تو یہ ہوئی کہ اس نے مجھے ریڈنگ تک چھوڑنے پر اصرار کیا۔ میں اس کو جس حد تک ہو سکتا تھا تسلی دیتا رہا۔ میں ساری الجھن کو بخوبی سمجھ گیا تھا اور اسے یقین دلایا کہ ہم مشرقی لوگوں کی بھی کچھ اقدار اور روایات ہیں اور اپنے دوستوں کی بہنوں کو اپنی ہی بہنیں سمجھتے ہیں اور یہ کہ سوزین کے رویہ سے مجھے بھی اتنی ہی تکلیف ہوئی تھی جتنی انھیں۔

باتھ انگلستان کے خوبصورت ترین شہروں میں سے ہے۔ یہ یہاں کی ایک مقبول تفریح گاہ ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی وادی ہے جس کے چاروں طرف سرسبز پہاڑ دیکھ کر مجھے ایبٹ آباد کا خیال آیا جو تقریباً ایسا ہی ہے۔ البتہ ایک فرق ہے کہ یہاں وادی کے بیچوں بیچ ایک دریا بہتا ہے۔ ایبٹ آباد میں ایسا کوئی دریا نہیں ہے۔ اس کا نام اور اس کی مقبولیت کا سبب اس کے وہ گرم پانی کے چشمے ہیں جن پر حمام بنائے گئے ہیں۔ رومیوں نے جب صدیوں پہلے انگلستان

کو اپنی کالونی بنایا تھا تو یہ Baths یا حمام تعمیر کیے تھے، انگریزوں کو تو کبھی بھی اس کی توفیق نہیں ہوئی، نہانے سے ان کا فرار انگریزوں کا باقاعدہ لطیفہ بن گیا ہے اور شیریڈن اور برنارڈ شاہ نے اپنے ڈراموں میں انگریزوں کی اس عادت کا بہت مذاق اڑایا ہے۔ اب تو بہر حال گھروں میں حمام بن گئے ہیں جہاں ٹھنڈا اور گرم پانی ہر وقت چلتا رہتا ہے اس لیے ان قدرتی حماموں کی کوئی زیادہ ضرورت نہیں رہی ہے۔ لیکن اس زمانے میں بھی جب یہ جدید سہولتیں نہیں تھیں لوگ ان حماموں میں نہانے کے لیے نہیں آتے تھے بلکہ ان کو آثار قدیمہ کے طور پر دیکھنے آتے تھے۔ ایک مرتبہ زیڈ اے سلہری صاحب کو ہم نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں گفتگو کے لیے دعوت دی۔ اس زمانے میں یہ روایت کافی مستحکم ہو گئی تھی اور باہر سے نامور شخصیات کو شعبۂ انگریزی میں مدعو کیا جاتا تھا۔ میں نے نفسیاتی ماہرین فلسفہ کے استادوں، شاعروں، نقادوں اور موسیقاروں تک کو بلوایا اور طلباء وطالبات نے ان سب سے دلچسپ باتیں کیں۔ اسی طرح دوسرے اداروں کے اساتذہ کو بھی شعبہ میں گفتگو کرنے کی دعوت دی گئی۔ آج کل ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔ بہر حال سلہری صاحب تشریف لائے اور انھوں نے غالباً ۲۵ء یا ۳۰ء کے لندن کے متعلق اپنے تجربات بیان کیے۔ اس وقت تک لندن کی سڑکوں پر پیدل چلنے والوں کے لیے پٹریاں نہیں ہوتی تھیں اور سڑکوں پر پانی کھڑا ہو جاتا تھا۔ میں نے بھی کہیں لارڈ چسٹر فیلڈ کا یہ قصہ پڑھا تھا کہ ایک مرتبہ سڑک پر پانی کھڑا ہوا تھا اور وہ دیوار کے ساتھ چل رہے تھے جہاں ذرا جگہ اونچی تھی اور وہاں پانی نہیں تھا۔ دوسری طرف سے ایک اور شخص دیوار کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ جب دونوں ایک دوسرے کے سامنے آئے تو اس شخص نے غصہ سے کہا ''میں کسی Scoundrel کے لیے دیوار نہیں چھوڑتا''۔ لارڈ چسٹر فیلڈ نہایت اخلاق سے جھکے اور بولے ''میں چھوڑ دیتا ہوں'' اور پانی میں اتر گئے۔ بہر حال سب سے دلچسپ بات سلہری صاحب نے یہ بتائی کہ اس وقت لندن میں چند ایک حمام تھے اور ان میں نہانے کا کرایہ ایک شلنگ سے لگا کر ایک پنس تک ہوتا تھا یعنی

جو شخص سب سے پہلے تازہ پانی کے ٹب میں نہاتا وہ ایک شلنگ دیتا۔ اس کے بعد اسی ٹب میں نہانے والا ۶ پنس دیتا اور اس کے بعد ریٹ بتدریج گرتا رہتا۔ ۶ کے بعد ۴ پنس ہوتے پھر دو اور آخری غوطہ لگانے والا صرف ایک پنس ہی دیتا اور یہ دولت برطانیہ کے عروج کا زمانہ تھا۔

چنانچہ آج بھی لوگ Baths کی وجہ سے اس شہر میں نہیں آتے بلکہ اس لیے آتے ہیں کہ یہ ایک بہت ہی اعلیٰ قسم کی تفریح گاہ بن گیا ہے۔ یہاں کے کریسنٹ بہت مشہور ہیں۔ یعنی شہر کے بڑے چوک میں عمارتیں نیم دائرہ کی شکل میں بنی ہوئی ہیں۔ جیسے لاہور میں دیال سنگھ مینشن۔ ان کے باہر چوڑی چوڑی سڑکیں ہیں جو پریڈز کہلاتی ہیں۔ یہاں کی اہم تفریح یہی ہے کہ لوگ اپنے بہترین لباسوں میں پریڈ کرتے ہیں اور نئے نئے تعلقات بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں خوبصورت ریسٹورنٹ ہیں۔ چائے خانے، قہوہ خانے اور شراب خانے میں جو ہر وقت لوگوں سے کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں۔ دکانوں میں عام طور پر جدید ترین فیشن کے ملبوسات جوتے زیورات اور میک اپ کا سامان نظر آتا ہے۔ شاپنگ بھی خوب ہوتی ہے۔ بہر حال بہت خوبصورت جگہ ہے۔

میرے حساب سے کیمرج اور باتھ کے بعد انگلستان کا خوبصورت ترین شہر ونچسٹر ہے جو کبھی یہاں کا دارالحکومت بھی رہ چکا ہے۔ یہ ایک بہت پرسکون چھوٹا سا شہر ہے اور اس میں دریا سے کاٹ کر چھوٹی چھوٹی نالیاں سی بنائی گئی ہیں اور شاید یہ قدرتی نہریں ہی ہوں۔ زیادہ تر مکانات پرانے طرز کے ہیں اور یہاں ایک پرشکوہ کتھیڈرل بھی ہے۔ یہاں ایک قدیم کالج بھی ہے۔ ونچسٹر کالج، جو ۱۳۸۷ء میں قائم ہوا تھا۔

لیک ڈسٹرکٹ کی کیا تعریف کی جائے۔ ورڈزورتھ کی نظموں نے تو اسے اہل شوق کے لیے ایک زیارت گاہ بنا دیا ہے۔ یہ چھوٹا سا علاقہ ہے جس میں چھوٹی چھوٹی وادیاں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جو لاہور کی شملہ پہاڑی سے بھی چھوٹی ہیں۔ اسی طرح جھیلیں ہیں جو لاہور کے پارکوں کی جھیلوں سے بھی چھوٹی ہیں۔ البتہ ایک دو پہاڑیاں اور ایک دو جھیلیں ذرا

پتھروں کو تراش کر ان سے ایک چھوٹا دائرہ اس بڑے دائرے کے اندر بنایا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ اگلے وقتوں میں پتھروں سے دائرے بنانے کی کوئی روایت تھی جیسے Beak-folk یا پیالے والے لوگ (اس لیے کہ ان کے مقبروں سے پیالہ نما برتن نکلے ہیں) حضرت عیسیٰؑ سے کوئی دو ہزار برس پہلے بڑے پتھروں کے زمانے یا Megalith culture کے طور پر یہاں لائے تھے۔ رومن باتھ اور لندن میں رومن دیوار کے علاوہ انگلستان میں یہی آثار قدیمہ ہیں جنھیں انگریز بڑے فخر سے سیاحوں کو دکھاتے ہیں۔ یوں ڈیوڈ کے ساتھ میں نے آدھا انگلستان اور ویلز اور سکاٹ لینڈ کے کچھ حصے بھی دیکھ لیے جارج موریسن۔ جن کے والد نے نیویارک میں میری میزبانی کی تھی۔ ایک مقام ویلز Wells میں چھٹیاں گذار رہے تھے۔ انھوں نے مجھے ویلز Wells آنے کی دعوت دی۔ میں بس کے ذریعہ ویلز کے لئے روانہ ہوا۔ یہ بڑے تجارتی مرکزوں سے دور ایک قصباتی علاقہ تھا۔ یہاں ایک بہت ہی خوشگوار تجربہ ہوا۔ جب میں لندن کی بس سے اتر کر لوکل بس میں بیٹھا تو یہ دنیا بالکل ہی عجیب سی لگی یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں انگلینڈ میں نہیں پاکستان میں ہوں۔ یہاں کے لوگ لندن کے لوگوں کی طرح سمٹے سمٹا کے اور شرمیلے یا Self-conscious نہیں تھے بلکہ عورتیں اور مرد بڑے کھل کر اور بڑی پرشور آواز میں ایک دوسرے کی خیریت پوچھ رہے تھے ہیلو ہیلو کر رہے تھے گھریلو اور خالص نجی Private قسم کی باتیں بغیر کسی جھجک کے کر رہے تھے۔ اکثر نے مجھ سے بھی ایسی ہی بے تکلفی سے بات کی بلکہ ایک دو بڈھی میموں نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی جب میں نے کہا کہ میں ویلز جا رہا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئیں اور انھوں نے ویلز کے کیتھڈرل کی بہت تعریف کی یہ ایک پہاڑی کے اوپر ایک بہت ہی پرشکوہ عمارت ہے جو لاہور کے سینٹ انتھونی چرچ کی طرح ہے مگر اس سے بہت بڑی ہے۔ یہاں جارج میرے منتظر تھے۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی اور پوری عمارت میں کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کا احوال پوچھا تو نہایت سرگوشی کی آواز میں اس نے مجھ سے کہا کہ یہاں اونچا بولنا منع ہے۔ جو لوگ یہاں

مطالعہ اور عبادت میں مشغول ہیں ان کی توجہ بٹتی ہے۔ میں بھی اسی طرح سرگوشیوں میں اس سے باتیں کرتا رہا۔

جس کمرے میں جارج مجھے لے کر آیا وہ کافی بڑا اور اونچی چھت والا ایک بیڈ روم تھا۔ ہر چیز نہایت سادہ تھی اور بستر سے لگا کر میز کرسیوں اور دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں تک سب سفید رنگ کی تھیں۔ بستر پر چڑھنے کے لیے اس کے ساتھ ایک سٹول رکھا تھا جس پر کوئی ایک فٹ موٹا گدا تھا۔ بستر کا گدہ بھی کوئی دو فٹ موٹا ہوگا۔ میں نیویارک کے شیرٹین اٹلانٹک میں بھی دو راتیں گذار چکا تھا۔ لیکن وہاں بھی اتنے گداز بستر نہیں تھے۔ پتہ لگا کہ یہ انگلستان کے امیر ترین چرچوں میں سے ایک چرچ ہے۔ اس کی بے انتہا جاگیر ہے اور اسے امریکہ سے بڑے عطیات اور نذرانے آتے ہیں۔ کچھ دیر میرے پاس ٹھہر کر اور وہاں کے آداب و اطوار کے متعلق ضروری ہدایات دے کر جارج عبادت کے لیے چلا گیا۔ اس وقت تک رات ہو چکی تھی اور رات کا کھانا میرے کمرے میں ہی بھجوا دیا گیا۔ نہایت نفیس کراکری میں نہایت سلیقے سے رکھی ہوئی روٹی۔ سوپ اور کری وغیرہ اور ساتھ میں کچھ پڈنگ بھی۔ سب کچھ بہت لذیذ تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں باہر نکلا۔ وہاں ایک لق و دق صحن تھا جس کے اطراف پر بہت عمارات تھیں جو خاموشی اور نیم تاریکی میں اور بھی ہیبت ناک ہو گئی تھیں۔ صحن کے ایک کنارے پر فصیل نما جگہ سے بہت نیچے شہر کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ بڑا ہی رومانوی منظر تھا۔

صبح ناشتہ کے لیے جارج مجھے لینے آیا اور میں اس کے ساتھ ڈائننگ ہال میں پہنچا۔ یہ بھی اس ساری عمارت کی نسبت ایک بہت بڑا ہال تھا۔ لمبی لمبی سادہ سی لکڑی کی میزیں تھیں اور ان کے ساتھ اسی لکڑی کے لمبے لمبے بنچ تھے۔ البتہ ہماری میز پر سفید میز پوش بچھا ہوا تھا۔ کراکری ساری چاندی کی تھی۔ یہاں ناشتہ سے پہلے یوکرسٹ Eucharist کی رسم ہوئی اسے ہولی کمیونین، موعظ کا دسترخوان The Lords Supper یا ماس The Mass بھی کہا جاتا ہے۔ پادری ایک پیالہ میں شراب ڈالتا ہے اور روٹی کے ایک سخت ٹکڑے

یا بسکٹ کو اس میں ڈبوتا ہے اور یہ کہہ کہ میں خدا کے خون میں خدا کے گوشت کو ڈبو کر کھا رہا ہوں اسے منہ میں ڈال لیتا ہے۔ غالباً مطلب یہ ہے کہ ہم جو کچھ کھاتے پیتے ہیں وہ حضرت عیسیٰ کی قربانی کے صدقے میں ہے کہ اگر وہ اپنی جان کا نذرانہ نہ دیتے تو دنیا تباہ ہو جاتی۔ بہر حال اس کے بعد چائے ہوئی جس کے ساتھ کچھ بسکٹ، انڈے اور کیک وغیرہ تھے۔ یہ سب بھی ایک منفرد تجربہ تھا۔

یوں دنیا کے ایک بڑے حصہ کی سیاحت بھی ہوئی۔ تعلیم بھی ہوئی۔ ثقافتی اور سماجی سرگرمیاں بھی رہیں، کھیل میلے بھی ہوئے رات کے بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملاقات بھی ہوئی۔ نئے دوست بھی بنے اور عجیب عجیب خوش گوار اور چند نا خوش گوار تجربے بھی ہوئے۔ اب بس ایک مسئلہ تھا۔ یعنی آخری امتحان اور کیمبرج میں جا کر اس میں جت گئے۔ امتحان بھی ختم ہو گیا اور اب بالکل فراغت تھی۔ چنانچہ ایک مہینہ لندن میں گذارنے کا پروگرام بنایا اور کینزنگٹن گارڈن کے خوبصورت علاقہ میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تقریباً سارا لندن پیدل چل کر دیکھا اور ایک ایک گلی کی سیر کی۔ مادام تسود کا موم کا عجائب گھر دیکھا جس میں دنیا کی تاریخ، عقوبت گاہیں، بادشاہ ملکائیں شہزادے اور شہزادیاں موم سے بنی ہوئی دیکھیں۔ وہاں مشاہیر میں جناح اور گاندھی وغیرہ کے علاوہ صدر ایوب کا مجسمہ بھی تھا۔ ماہر مجسمہ سازوں نے موم میں زندگی ڈال دی تھی۔ لندن کا پلینیٹیریم بھی دیکھا جو بہت اچھا لگا اس لیے کہ اس سے پہلے یہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ فلمیں دیکھیں۔ کیو گارڈن کی سیر کی جو بہت وسیع اور متنوع ہے۔ قسم قسم کی کیاریاں اور بہت بڑے بڑے گرین ہاؤس ہیں۔ اسی دوران ٹرائی پاس کا نتیجہ آ گیا لندن کے Times میں اپنا نام دیکھا اور کنووکیشن کی تیاری شروع کر دی۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر آ چکا ہے کنووکیشن کا دعوت نامہ پہلے ہی آ چکا تھا ۔اس کی ایک مخصوص بات یہ تھی کہ یہ ایک دعوتِ عام تھی اور کامیاب طلباء کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ جتنے چاہیں مہمان لا سکتے ہیں۔ کتنا عجیب سا لگا۔ ہمارے اول تو کانووکیشن ہوتے ہی نہیں

اور ہوتے ہیں تو بہت محدود پیمانے پر۔ ابھی میری بیٹی کو کنووکیشن میں بی ایس سی آنرز کی ڈگری ملی لیکن اس کے کسی اور مہمان کو دعوت نہیں دی گئی حتیٰ کہ اس کے شوہر اور والدین تک کو بھی نہیں بلایا گیا۔ حالانکہ میں خود انجینئرنگ یونیورسٹی کی فیکلٹی پر ہوں اور اس کے سلیکشن بورڈ اور بورڈ آف سٹڈیز کا ممبر بھی ہوں۔

کانووکیشن پر بڑی رونق تھی۔ ہر طرف گاؤن ہی گاؤن نظر آتے تھے۔ یہاں ہر چیز کرائے پر مل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عروسی ملبوسات بھی کرائے پر ملتے ہیں۔ اکثر انگریز لڑکوں نے سوٹ ہی نہیں بلکہ قمیض اور ٹائی بھی گاؤن اور کیپ کے ساتھ کرائے پر لیے تھے۔ ہر طالب علم کو وائس چانسلر نے ڈگری خود اپنے ہاتھ سے فرداً فرداً عطا کی۔ اس کے بعد زبردست ضیافت ہوئی۔ انگریز لڑکے لڑکیاں خاص طور سے شراب کی بوتلوں پر ٹوٹ پڑے۔ کھانا بھی وافر تھا اور چائے اور کافی وغیرہ کے دور بھی چل رہے تھے۔ دوستوں سے فرداً فرداً ملے اور سب سے رخصت ہوئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر ایک ایک استاد سے بھی الوداعی ملاقات کی۔ سب ہی بڑی خوش دلی سے ملے۔ البتہ میرے سپروائزر ڈاکٹر مائیکل ایگن اداس بھی تھے اور یونیورسٹی سے برہم بھی۔ انھوں نے غصہ سے کہا کہ یونیورسٹی کے نظام امتحانات سے ان کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مجھے فرسٹ ڈویژن ملنی چاہیے تھی۔ میرا مقالہ ایک نئی تحقیق پر مبنی تھا جو نئی بھی تھی اور اس پر کافی محنت بھی کی گئی تھی لیکن غالباً میرے باقی پرچے اتنے اچھے نہیں ہوئے تھے۔ میں تو اسی بات سے بہت خوش تھا کہ سیکنڈ ڈویژن مل گئی۔ کسی بھی پاکستانی طالب علم کو فرسٹ ڈویژن نہیں ملی تھی اور دو تین کو تھرڈ ڈویژن بھی تھیں۔ انگریزی ٹرائی پاس میں غالباً ایک شخص کو فرسٹ ڈویژن ملی تھی اور یہ ۱۹۲۷ء کی بات تھی۔ اس سال تین فرسٹ ڈویژن دی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک پطرس بخاری کی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے ساتھیوں میں سے کم از کم ایک کو نااہل قرار دے کر پہلے ہی Sent down یا یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس ساری جہاں گردی میں شاید کچھ اور تو حاصل نہ ہوا ہو۔ لیکن کسی حد تک

خوداعتمادی ضرور آ گئی تھی۔

اب واپسی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ کچھ خریداری نیویارک سے کر لی گئی تھی۔ کچھ اب یہاں لندن سے کی اور زیادہ سامان پانی کے جہاز سے بک کروا دیا گیا۔ صرف ایک درمیانہ سے سائز کا اٹیچی کیس ساتھ جانے کے لیے تیار کر لیا۔ اس مرتبہ بذریعہ ریل سفر کرنے کا پروگرام بنایا۔ پتہ چلا کہ لندن سے بغداد تک ریل کے ذریعہ جایا جاسکتا ہے اس کے بعد ریلوے کا نظام نہیں ہے اور بسوں کے ذریعہ سفر کرنا ہوگا۔ میں نے لندن سے بغداد تک کا ریل کا ٹکٹ خرید لیا جو تقریباً ساڑھے چار سو پاؤنڈ میں آ گیا یکم اگست کی اورینٹ ایکپریس کے ذریعہ روانگی طے ہوگئی۔

۳۱ جولائی کی رات کو خاصی گرمی تھی۔ لندن کے فلیٹ وہاں کے موسم کے حساب سے بنائے جاتے ہیں۔ ان میں کم سے کم روشن دان ہوتے ہیں اور تازہ ہوا کے اندر آنے کا امکان بدستور کم ہوتا ہے۔ جو فلیٹ میں نے کرایہ پر لیا تھا وہ دراصل کسی لڑکی کا فلیٹ تھا جو چھٹیاں گذارنے کانٹی نینٹ گئی ہوئی تھی۔ اسٹیٹ مینجر نے وہی کمرہ مجھے کرائے پر دے دیا۔ وہاں بھی بڑے گھپلے چلتے ہیں۔ یہ کمرہ اس لڑکی کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ٹی وی آن کر دیا۔ لیکن گرمی کی گھبراہٹ نے بہت تنگ کیا۔ وہاں ایک چھوٹی سے کھڑکی تھی۔ اتنی چھوٹی کہ اس میں سے صرف میرا سر باہر نکل سکا۔ میں نے سر باہر نکال کے تھوڑی دیر لمبے لمبے سانس لیے اور پھر ٹی وی دیکھنے لگا۔ اس وقت ٹی وی پر آرم سٹرونگ کے چاند پر جانے کا پروگرام دکھایا جارہا تھا۔ اسے چاند پر قدم رکھتے ہوئے دکھایا گیا۔ یہ تاریخی رات لندن میں میری آخری رات تھی۔

اگلی صبح میں اٹیچی کیس لے کر سٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ وکٹوریا ٹرمینل سے گاڑی لینی تھی۔ اتفاق سے راستہ میں کوئی ٹیکسی نہیں ملی۔ ایک ٹیلیفون بوتھ سے ٹیلیفون کر کے میں نے ٹیکسی منگوائی۔ ٹیکسی فوراً ہی آ گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے حیرت سے دیکھا اور اس نے کہا کہ یہ

تو بہت مہنگی ٹیکسی ہے آپ کو دوسری ٹیکسی لے لینی چاہیے تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے سٹیشن جانا ہے اور گاڑی کا وقت ہوگیا ہے۔ اس نے مجھے بٹھالیا۔ وکٹوریہ ٹرمینل پہنچ کر اس نے کہا کہ آپ صرف پانچ پونڈ دے دیں۔ معلوم نہیں اصل کرایہ کتنا لینا ہوگا۔ بہر حال میں سٹیشن پہنچ گیا۔ گاڑی جانے میں ابھی آدھے گھنٹہ سے زیادہ وقت تھا۔ میں نے اٹیچی کیس لاکر میں رکھا اور سٹیشن کے باہر دکانوں کا چکر لگانے چلا گیا۔ وہاں ایک ٹی۔ شرٹ مجھے اچھی لگی جو میں نے خرید لی۔ اس کے بعد میں نے اٹیچی کیس لیا اور گاڑی میں اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ لوگ چھٹیاں گذارنے کونٹیننٹ کے مختلف شہروں کو جا رہے تھے۔ فی الحال ان کی منزل ڈوور کی بندرگاہ تھی جہاں سے کشتی کے ذریعہ بلجیم کی بندرگاہ اوسٹنڈ تک جانا تھا۔ پچھلی مرتبہ میں ڈوور سے فرانس کی بندرگاہ کے لیے Calais گیا تھا اور اس وقت چینل بذریعہ ہوائی جہاز عبور کی تھی اور وہاں سے بسوں کے ذریعہ پیرس پہنچے تھے اسی طرح جیسے لندن سے بسوں کے ذریعہ مسافر ہوائی اڈے تک پہنچے تھے۔

چینل کو عبور کرنے کے لیے ایک بڑی سی فیری بندرگاہ پر کھڑی تھی۔ تقریباً جہاز ہی تھا۔ مسافر اس میں سوار ہوئے کچھ کاروں سمیت ہی فیری پر گئے۔ اوپر درجہ اُول تھا اور نیچے درجہ دُوئم۔ ایک بڑا سا ریسٹورنٹ بھی تھا۔ عام درجہ میں صرف چند ایک بنچ پڑے تھے۔ تمام مسافر فرش پر ہی بیٹھے اور کچھ لیٹے ہوئے تھے یا کٹہروں کے ساتھ کھڑے سمندر کی سیر کر رہے تھے۔ اچھی چہل پہل تھی۔ ایک درمیانی عمر کے امریکی سے ملاقات ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی رسمی گفتگو کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے میں نے کہا کہ حلیے اور جُثے سے تو وہ انگریز لگتا ہے۔ وہ بظاہر اس بات سے خوش ہوا اور اس نے کہا کہ وہ امریکی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا لہجہ اور آپ کا انداز بالکل انگریزوں جیسا ہے۔ پھر وہ امریکہ اور یورپ کے موازنے کرتا رہا۔ اس کے خیال میں یورپ ابھی تک قرونِ وسطیٰ میں رہ رہا ہے اور یہاں کے شہر تو بالکل گاؤں جیسے لگتے ہیں۔ امریکہ کے مقابلے میں یورپ اُسے

بہت پسماندہ لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ مختلف ممالک کے لوگ ایک دوسرے کے متعلق ایسے ہی خیالات رکھتے ہیں۔ ایک جرمن لطیفہ یوں ہے کہ ایک بچے نے اپنے دادا سے پوچھا کہ اگر یورپ میں ایٹمی جنگ چھڑ جائے تو آپ کہاں جائیں گے۔ بوڑھے نے کہا کہ انگلستان چلا جاؤں گا بچے نے حیرت سے پوچھا کہ انگلستان کیوں تو اس نے جواب دیا کہ انگلستان ایک بہت پسماندہ ملک ہے اور وہاں نئی چیزوں کو پہنچتے پہنچتے پچاس برس لگ جاتے ہیں۔ غرض یہ سفر جو چند گھنٹوں کا تھا خوب رہا اور بہت سے مسافروں سے گپ شپ رہی۔ کہنے کو تو یہ چینل ہے لیکن غالباً کم سے کم بیس میل چوڑی ہے۔ چینل کے وسط میں تو یہ بالکل سمندر لگتا ہے جہاں خشکی کا نشان نہیں۔ چینل کو عبور کر کے ہم بلجیم میں اوسٹینڈ کی بندرگاہ پر پہنچے اور قریب ہی کھڑی ہوئی ایک ریل گاڑی میں سوار ہو گئے۔

اب ہم کانٹینٹ پر تھے۔ یہ انگلستان سے ایک بہت ہی مختلف جگہ ہے۔ یہاں بڑے بڑے سرسبز میدان ہیں جب کہ انگلستان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور وادیوں کا ایک جزیرہ ہے جس پر تقریباً ہر وقت دھند چھائی رہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں یورپ کے وسیع میدان سرسبز و شاداب دھوپ میں چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں گاڑی اس قدر بھر گئی تھی کہ سیٹوں کے درمیان راستوں پر بھی لوگ بیٹھے یا کھڑے ہوئے تھے۔ محاورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ صرف دروازوں میں لوگ لٹکے ہوئے نہیں تھے اور اس کی وجہ بھی شاید وہاں کی یخ بستہ ہوائیں تھیں۔ راستہ میں کوئی اہم شہر نہیں پڑا اکثر چھوٹے چھوٹے شہر اور گاؤں ہی آتے رہے۔ ہم شام تک بلجیم پہنچ گئے۔ برسلز پہنچ کر ایک یوتھ ہوسٹل میں قیام کیا۔

برسلز نسبتاً ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ میں فرانسیسی بولی جاتی ہے اور دوسرے میں فلیمش جو ڈچ (ولندیزی) زبان سے ملتی جلتی ہے۔ دونوں قومیتوں میں بڑی تکرار رہتی ہے جو کبھی کبھی خونریز فسادات تک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں میں نے ایک یوتھ ہوسٹل میں قیام کیا۔ یورپ میں اپنا سامان اٹھائے

پھرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے کہ وہاں تمام ریلوے سٹیشنوں اور بس کے اڈوں پر سامان رکھنے کی سہولت ہوتی ہے۔ اکثر جگہ تو یہ انتظامات خودکار ہوتے ہیں۔ وہاں بڑی بڑی لوہے کی الماریاں رکھی ہوتی ہیں جن میں اتنی بڑی بڑی درازیں ہوتی ہیں کہ بڑے سے بڑا سوٹ کیس بھی آسانی سے ان میں سما جاتا ہے۔ ان درازوں کے قفل ہوتے ہیں جن کی چابیاں ان ہی میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ آپ ایک مخصوص سکہ ان میں ڈالیں تو چابی باہر آ جاتی ہے۔ سامان وہاں رکھ کر چابی جیب میں رکھیے اور بے فکری سے گھومتے پھرتے رہیے۔ کہیں کہیں سامان کی حفاظت کے لیے باقاعدہ ایک دفتر ہوتا ہے جس میں موجود اہل کار سامان رکھ کر اس کا ٹکٹ آپ کو دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی اپنا اٹیچی کیس تو سٹیشن پر ہی رکھ دیا اور ایک بیگ میں چند ضروری چیزیں لے کر کندھے پر لٹکا لیا۔

بلجیم لندن کی نسبت ایک کم آبادی والا پرسکون شہر ہے۔ میں وہاں بازاروں میں گھومتا رہا۔ پھر مجھے شہری سیاحت کی ایک بس نظر آئی اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ بس میں ایک خاتون جرمن، فرانسیسی انگریزی اور غالباً کسی مقامی زبان میں مختلف مقامات کا تعارف کرا رہی تھی۔ یہاں کوئی ایسی خاص چیز تو نظر نہیں آئی جس کا ذکر کیا جائے۔ البتہ ایک مقام پر کچھ پرانی عمارتیں تھیں جن پر نقاشی اور ملمع کاری کی ہوئی تھی اور جن کو قومی ورثہ کے طور پر محفوظ کر دیا گیا تھا۔ پھر یہاں انگلستان کے باتھ کی طرح پرانے شہر کی کچھ چھوٹی چھوٹی گلیاں تھیں جن میں کھڑکیوں کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی خواتین کڑھائی اور بنائی کے کام کر رہی تھیں، اس کے علاوہ کچھ سرکاری عمارتیں تھیں اور کچھ اقوام متحدہ کے دفاتر تھے۔ ہر جگہ سڑکوں اور گلیوں کے نام دو زبانوں میں لکھے ہوئے تھے۔ فرانسیسی اور فلیمش۔

اسی سفر کے دوران اتفاق سے میرے برابر والی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جو بظاہر ایک طالب علم نظر آتی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے جب ایک جگہ باہر کی طرف جھانکنے کے لیے گردن موڑی تو اس نے پوچھا آپ نے مجھ سے کچھ کہا میں نے

جواب دیا کہ نہیں۔ پھر از راہِ اخلاق میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ بھی میری طرح ایک سیاح ہے تو اس نے کہا کہ وہ وہیں کی رہنے والی ہے اور یونیورسٹی میں لٹریچر کی طالبہ ہے۔ چنانچہ اس مختصر سے تعارف کے بعد اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس نے بلجیم کے کلچر اور اس کی سیاست پر مجھے بہت سی معلومات فراہم کیں۔

یورپ کی سیاست میں بلجیم کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی ابتدا یہیں سے ہوئی تھی۔ لیکن ورسائی کے معاہدے کے تحت کچھ مزید علاقے بھی اس کو مل گئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک مرتبہ پھر بلجیم پر مصیبت آئی تو جرمنی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ یہ سہ فریقی فسادات کا بھی شکار رہتا ہے اور آج تک بھی ڈچ فلمیش اور فرانسیسی زبانیں بولنے والوں کے درمیان خونریز تصادم ہوتے رہتے ہیں۔ بہت عرصہ سے بلجیم طوائف الملوکی کا شکار ہے اور یہاں تیزی سے حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ حکومت پر بادشاہ کا اختیار صرف برائے نام ہے البتہ جب بھی اقتدار کے جھگڑے ہوتے ہیں تو بادشاہ ثالثی کا منصب ادا کرتا ہے۔ سیاحی بس کے ذریعہ تو برسلز شہر کی گوناگوں مصروفیات کا کوئی اندازہ نہیں ہوا البتہ اس طالبہ کے ذریعہ اس شہر کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ پہلے مجھے ایک تتلی گھر لے گئی۔ یہ بڑا ہی خوبصورت ایک چھوٹا سا الف لیلوی قسم کا تھیٹر تھا۔ اس میں ایک چھوٹا سا سٹیج تھا اور ہال میں بھی چھوٹی چھوٹی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں زیادہ تر بچے ہی کھیل دیکھنے آتے ہوں گے۔ اس وقت وہاں کسی شو کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ شام کو کچھ دیر کے لیے ایک تھیٹر میں بھی گئے جہاں کوئی فرانسیسی ڈرامہ ہو رہا تھا۔ کچھ آرٹ گیلریاں بھی دیکھیں۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں کھایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہاں اکثر ادیب اور شاعر قسم کے لوگ بیٹھتے ہیں اور یہ دوسرے ریستورانوں سے نسبتاً سستا بھی ہے۔ پھر ہم شہر کے گلی کوچوں میں پھرتے رہے ونڈو شاپنگ کرتے رہے اور تیسرے پہر ایک کافی ہاؤس میں چلے گئے۔ یہاں ایک دلچسپ بات ہوگئی۔ اس لڑکی نے جس کا نام ڈوروتھی تھا

مجھ سے کہا کہ دیکھیں صبح سے آپ تمام خرچ کر رہے ہیں۔ یہ اچھا نہیں لگتا۔ کافی کا بل میں دوں گی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ مجھے اچھا تو نہیں لگتا کہ ایک خاتون سے پیسے خرچ کراؤں لیکن اس کے اصرار پر میں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ جب ہم کافی پی چکے تو اس نے اپنا پرس میز پر میرے آگے بڑھایا اور کہا کہ اس میں سے پیسے نکال لیں۔ بل آپ ہی ادا کریں۔ ریستوران والے اس بات کو اچھا نہیں سمجھیں گے کہ ایک لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ آئے اور خود ہی بل ادا کرے۔ بہرحال میں نے اس کے پرس میں سے پیسے نکال کر بل ادا کر دیا۔ لیکن پھر سوچا کہ اتنی آزادی کے باوجود بھی عورت عورت ہی ہے چاہے امریکہ کی ہو یا یورپ کی یا پاکستان کی۔ آزادیِ نسواں صرف ایک نعرہ ہے۔

بلجیم میں ایک رات گذارنے کے بعد میں نے پھر گاڑی پکڑی اور یہاں سے جرمنی میں داخل ہو گیا۔ راستہ میں ایک بڑا شہر کولون پڑا۔ اس کے بعد مغربی جرمنی کے دارالخلافہ بون سے ہوتے ہوئے میں فرینک فرٹ پہنچا۔ یہ بہت خوبصورت تجارتی شہر ہے۔ لندن سے کہیں زیادہ صاف اور لوگ بھی بہت ہی چاق و چوبند نظر آئے۔ انگلستان میں کچھ جرمن لوگوں سے کافی قریبی مراسم رہے تھے اس لیے بھی جرمنی مجھے کچھ زیادہ غیر مانوس نہیں لگا۔ یہاں لوگوں کا عمومی خیال یہ ہے کہ انگریز یورپ کی کاہل ترین قوم ہیں۔ لیکن ہر طرح کی مکمل آزادی کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ گو جرمن بظاہر اور عام طور پر بہت سنجیدہ اور کم سخن اور کم آمیز لگتے ہیں لیکن اگر آپ قریب سے انھیں دیکھیں تو انگریزوں سے کہیں زیادہ ملنسار اور گرم جوش محسوس ہوتے ہیں۔ یہاں اندازہ ہوا کہ خواتین زیادہ تر گھریلو قسم کی ہیں اور یہاں ابھی تک گھر اور گھریلو زندگی کو بہت اہمیت ہے۔ زیادہ تر لڑکیاں گھر بسانے اور گھروں کو سنوارنے سجانے کی شوقین ہیں۔ بہت ہی کام کرتی ہیں اور خود کفیل ہیں۔ خاندان سے یہ جذباتی وابستگی ان کی ثقافت اور تہذیب کا حصہ ہے۔ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی ماں اس کا جہیز تیار کرنے لگتی ہے اور جب وہ خود کمانے کے لائق ہوتی ہے تو وہ بھی اپنے طور پر گھر کی چیزیں وغیرہ بناتی رہتی

ہے۔اینگلوسیکسن قوموں میں یہ بات نہیں دیکھی گئی۔نہ یورپ میں نہ امریکہ میں۔

یہاں پہنچ کر میں نے ہائیڈل برگ جانے کا ارادہ کیا۔یہ شہر اقبال اور گوئٹے کے حوالے سے اہمیت رکھتا ہے اور میرے سیاحی کے شوق میں یہ نسبت بھی شامل تھی۔چنانچہ ہائیڈل برگ کی گاڑی میں سوار ہوگیا۔پورے ڈبے میں میں ہی مسافر تھا۔سامان میں نے سٹیشن پر ہی چھوڑ دیا تھا۔لمبے سفر کی تھکان بھی تھی اور تنہائی بھی۔میں نے سیٹ سیدھی کی جو اچھا خاصہ بیڈ بن گئی اور آرام سے سوگیا۔کوئی تیسرے پہر ریل ہائیڈلبرگ پہنچ گئی۔سٹیشن سے نکل کر تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھوما۔واقعی خوبصورت شہر ہے۔لیکن جلد ہی شام کے سائے شہر پر پڑنے شروع ہوگئے۔میرا خیال تھا کہ رات کے لیے آسانی سے رہائش کا بندوبست ہوجائے گا۔

انگلستان اور بلجیم میں جہاں بھی گئے کسی یوتھ ہوسٹل، کسی ہوٹل میں جگہ مل گئی یا Paying Guest کے طور پر ایک رات کسی کے ہاں مہمان ہوگئے۔لیکن یہاں بڑا مسئلہ پیش آیا۔سٹیشن پر اور ٹورسٹ دفتروں پر لوگوں کے جمگھٹے تھے جن میں زیادہ تعداد امریکیوں کی تھی۔بہت سے گھروں پر ٹیلیفون کیے۔ہوٹلوں سے پوچھا۔یوتھ ہاسٹل کا پتہ کیا کئی گھنٹے اور بہت سے پیسے خرچ کرنے کے باوجود کہیں کوئی جگہ نہیں ملی۔چنانچہ تقریباً آدھی رات کو واپس ٹرین سے فرینک فرٹ آگیا۔یہاں تمام تر اچھی باتوں کے ساتھ ساتھ ایک بدمزگی بھی ہوئی۔یکے بعد دیگرے دو پاکستانی ملے۔جنھوں نے مجھے اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی بلکہ ایک نے تو مجھ سے میرا پاسپورٹ لینے کی بھی کوشش کی۔یہ دونوں اپنے آپ کو کشمیری بتاتے تھے اور انھوں نے میری میزبانی کے لیے بڑے اشتیاق اور اصرار سے کوشش کی۔لیکن میں بہت محتاط تھا۔میں نے سنا ہوا تھا کہ اس طرح کے کچھ لوگ جو ارضی جنت کے خواب دیکھ کر یورپ کے مختلف شہروں میں آگئے تھے اکثر غیر قانونی طور پر وہاں رہ رہے تھے۔یہ کوئی کام کاج نہیں کرتے تھے اور چوری ٹھگی اور دیگر ناجائز ذریعوں سے پیسے بناتے تھے اور اس کام کے لیے زیادہ تر پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو بے وقوف بنا کر لوٹنے کی کوشش کرتے تھے یہ ان کے

پاسپورٹ غائب کر دیتے اور پھر ایسے لوگ ان کے رحم وکرم سے رہ جاتے۔میں نے ان کا بڑا بڑا شکریہ ادا کیا اور زبردست احسان مندی کے اظہار کے ساتھ ان سے پیچھا چھڑایا۔

یہاں سے روانہ ہوئے تو راستہ نہایت ہی خوبصورت تھا۔ایک طرف اونچے اونچے پہاڑ اور دوسری طرف دریا۔پھر یہاں ہر چیز کو بڑی خوبصورتی اور سلیقہ سے رکھا گیا ہے۔دریا کے کنارے اور ریل کی پٹڑی کے دونوں اطراف نہایت دلکش منظر پیش کرتے تھے۔بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کسی تصویر کے درمیان سے گذر رہے ہوں اور خوبصورت راستوں کو طے کرتے ہوئے میونخ پہنچے۔

میونخ جنگ عظیم دوئم میں بری طرح تباہ ہوا تھا۔اس کے کچھ تباہ شدہ حصوں کو یادگار کے طور پر محفوظ کرلیا گیا ہے۔ایک طرف ویرانیاں تھیں اور کھنڈرات کے منظر تھے جبکہ دوسری طرف میونخ کے خوبصورت باغات اور جھیلیں۔انسان جب بنانے پر آتا ہے تو کیا کیا حسن پیدا کرتا ہے اور جب تباہ کرنے پر آتا ہے تو ہیبت اور ہولناکی میں بھی کوئی حد نہیں چھوڑتا۔میونخ میں خاص طور پر یہاں کا پوسٹ آفس ٹاور ہے جو عالمی نمائش کے دوران بنایا گیا تھا۔اس پر ایک گھومتا ہوا ریسٹورنٹ بھی ہے یہاں سے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اور کافی کے مزے لیتے ہوئے تمام شہر کی چاروں اطراف کی سیر کی جاسکتی ہے۔یہاں ایک یوتھ ہوسٹل میں قیام کیا۔یوتھ ہوسٹل کا ایک تو فائدہ یہ ہے کہ یہاں کرائے بہت ہی معمولی ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہاں ساری دنیا سے آئے ہوئے نوجوان سیاحوں سے بھی ملاقات ہوجاتی ہے۔میرے لیے خاص دلچسپی کا باعث مشرقی یورپ سے آئے ہوئے نوجوان تھے۔یہ عام طور پر زیادہ ملتے ملاتے نہیں۔لیکن خیر اتنے آدم بے زار بھی نہیں ہوتے۔مجھے بھی مشرقی یورپ دیکھنے کا بہت شوق تھا اس لیے ان سے جتنی ہوسکتی تھیں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔البتہ یہاں ایک ناخوش گوار تجربہ ہوا کہ میں سہ پہر کے وقت کچھ آرام کے لیے لیٹا تھا۔میرا منہ کمبل کے اندر تھا۔اسی دوران دو لڑکے آئے جو Coloured لوگوں کو گالیاں دیتے ہوئے اندر داخل

ہوئے ایک نے کہا کہ خدا کا شکر ہے آج کسی کلرڈ کا چہرہ ابھی تک نظر نہیں آیا۔ میں ان کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ دوسرے نے کہا کہ یہاں تو ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ جنوبی افریقہ سے آ رہے تھے۔ کیمرج میں میرے سپر اوائزر بھی جنوبی افریقہ کے رہنے والے تھے۔ وہ بڑے انقلابی نوجوان تھے اور غالباً اپنے ملک سے بھاگ کر کیمرج آئے تھے یہاں یوتھ ہوسٹل میں پہلی مرتبہ میرا اصل جنوبی افریقہ کے اپارتھائیڈ Aparthied سے سامنا ہوا۔ ابھی وہ کلرڈ لوگوں کو گالیاں ہی دے رہے تھے کہ میں نے کمبل میں سے منہ نکالا۔ وہ حقارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔ یورپ اور امریکہ کے اچھے خاصے قیام کے دوران مختلف ممالک میں سفر کرتے ہوئے یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے نسلی منافرت کا تجربہ ہوا یا اس سے پہلے ایک مرتبہ لندن میں کینزنگٹن کے علاقہ میں ایک بنک کے اندر ایک لڑکی نے میرا چیک کیش کرتے ہوئے عجیب سا منہ بنا کر میری طرف دیکھا تھا حالانکہ وہ اچھی خاصی شکل کی لڑکی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ مزاجاً ہی چڑ چڑی ہو یا پھر کسی اور بات سے جلی ہوئی ہو۔ یا پھر میری شکل ہی اُس کو برداشت نہیں تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے کسی ایشیائی کے ساتھ بہت تلخ تجربہ ہوا ہو۔ بہر حال یہی دو واقعات تھے جن سے نسلی تعصب کا احساس ہوا۔ اس کے علاوہ کہیں نفرت تو دور کی بات ہے غیریت کا احساس بھی نہیں ہوا۔ البتہ پاکی باشی اور ایشیا والوں کے ساتھ انگریزوں کی زیادتیوں کے واقعات اکثر سننے میں آتے تھے۔

میونخ سے میں آسٹریا کے لیے روانہ ہوا۔ ریل ایل برگ اور سالس برگ کے خوبصورت علاقوں سے خراماں خراماں گذر رہی تھی۔ دونوں طرف باغات ہی باغات تھے ۔نہایت خوش گوار رنگ و نور کا سماں تھا۔ اتنی خوبصورت گذر گاہ میں نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ پھر یہ بھی میری خوش قسمتی تھی کہ مطلع صاف تھا۔ موسم خوش گوار تھا جس سے رنگ اور بھی نکھر گئے تھے۔ ''ہے ہوا میں شراب کی تاثیر۔ بادہ نوشی ہے باد پیمائی'' یہ منظر کافی دیر تک

ہمارے ساتھ رہے اور پھر گاڑی آسٹریا کے دارالحکومت وی آنا میں آ کر رک گئی۔ سٹیشن پر اتر کر پہلے سامان رکھا اور اس کے بعد شہر کی سیاحت کے لیے روانہ ہوا۔

وی آنا ایک بہت ہی خوبصورت شہر ہے اور حسن میں منفرد ہے۔ یہ یورپ کے دوسرے شہروں کی طرح بہت بڑا اور پر شور نہیں ہے۔ یہاں کی عمارات بہت خوبصورت ہیں اور پہلی نظر میں بالکل کسی پرستان کا نقشہ نظر آتا ہے۔ عمارتیں بہت عظیم نہیں ہیں لیکن شان دار ہیں۔ سنہرے کلس اور خوبصورت رنگوں کے امتزاج نے یہاں کی پرانی عمارات بالکل کھلونوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ یورپ کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں یہاں ہر چیز کچھ چھوٹی چھوٹی نظر آئی۔ چھوٹی چھوٹی سڑکیں، چھوٹی چھوٹی ٹرام کاریں اور بسیں۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی کہ یہ شہر مجھے کچھ بہت مصنوعی سا لگا اور ماحول بھی بہت صاف ستھرا اور پر سکون تھا۔ یورپ کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح یہاں افراتفری اور شور وغل کا احساس بہت کم تھا۔

وی آنا میں آتے ہی سب سے پہلے تو یہ فیصلہ کیا کہ کسی اچھے سے ہوٹل میں ٹھہرا جائے۔ اب تک اکثر راتیں یا ریل میں گزری تھیں یا یوتھ ہوسٹلوں میں۔ اس لیے کچھ آسائش اور کچھ صفائی وغیرہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک ہوٹل اچھا لگا۔ اس کا کرایہ ۵ پونڈ یومیہ تھا۔ میں نے وہاں ایک کمرہ لے لیا۔ انگلستان میں ایک رات کے لیے کمرہ صرف ایک پونڈ میں مل جاتا تھا۔ یہاں البتہ ایک زیادتی یہ ہوئی کہ میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر سے ۱۰ پونڈ کے ایک نوٹ کا زرِ مبادلہ لیا۔ کیشیر نے مجھے تقریباً ایک پونڈ کم دیا۔ میں نے احتجاج کیا تو اس نے کہا کہ یہ ہوٹل کے سروس چارجز ہیں۔ اس نے مجھے اس کی رسید بھی دی۔ میں نے جب کہا کہ زرِ مبادلہ کی شرح جو اس کے کاؤنٹر پر لکھی ہوئی تھی بہت ہے تو اس نے کہا کہ یہ بنک کی شرح ہے مگر بنک میں لمبی لمبی قطاریں بنانی پڑتی ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ اب رسید کاٹ چکا ہے ورنہ میرے پونڈ مجھے واپس کر دیتا۔ بہر حال میں کمرے میں گیا کمرہ بہت اچھا تھا۔ ساتھ ہی ایک خاتون تولیہ اور صابن دے گئی۔ سب سے پہلے میں نے بیگ میں سے میلے کپڑے نکال کر دھوئے اور

انھیں باتھ روم میں ہی جو کہ خاصا بڑا تھا پھیلا دیا، پھر نہا دھو کر کچھ ہلکا محسوس ہوا۔ اس شہر کی سیر کو نکلا۔ غالباً اتوار کا دن تھا۔ کچھ زیادہ سیاح بھی نہیں تھے۔ لیکن کچھ گہما گہمی تھی۔ دکانوں کے انداز میں کچھ مشرقیت تھی۔ لندن کی طرح خرید و فروخت میں رکھ رکھاؤ اور خاموشی نہیں تھی بلکہ بھاؤ تاؤ بھی ہو رہے تھے اور بڑے زور و شور سے سودے بازی ہو رہی تھی۔ وہاں سے میں نے ایک چھوٹی سی آرائشی دیوار میں لٹکنے والی گھڑی خریدی اور کیمرے کے لیے ایک بیٹری کا بھی مناسب سودا ہو گیا۔ شام میں گلیوں اور بازاروں کی سیر کی، پارک میں گیا۔ یہاں ایک بہت بڑی چرخی ہے Riding Wheel اور مجھے بتایا گیا کہ یہ دنیا کا سب سے اونچا جھولا ہے۔ مجھے وی آنا یورپ میں پیرس کے بعد سب سے خوبصورت شہر لگا اور خاص طور پر اس لیے کہ یہاں پیرس کا سا شور اور ہنگامہ نہیں تھا۔ بہت ہی پرسکون اور پرستانوں جیسا شہر لگتا تھا۔ لوگ بھی بظاہر بشاش اور خوش حال نظر آتے تھے۔ البتہ ایک پاکستانی سے وہاں ملاقات ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ خوش حالی محض سطحی ہے۔ ذرا بڑی سڑکوں اور بڑے بڑے بازاروں سے پرے ہٹ کر دیکھو تو یہاں بھی وہی غربت اور بدحالی ہے۔ سارا شہر اتنا صاف ستھرا اور خوبصورت نہیں ہے۔ بہر حال سرمایہ دارانہ معیشت اسی طرح کی ہوتی ہے اور اس کے شہر بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اونچے اور نیچے طبقات کا فرق اس معیشت کی ایک واضح شناخت ہے۔

وی آنا ایک درمیانہ آبادی کا شہر ہے جس کی آبادی کوئی پندرہ سولہ لاکھ ہے۔ خود آسٹریا وسطی یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن وی آنا بین الاقوامی حیثیت کا مالک ہے۔ اس کے گرد اٹلی، سوئٹزر لینڈ، جرمنی، چیکوسلوویکیا، ہنگری، یوگوسلاویا وغیرہ کے ممالک ہیں۔ ثقافتی حیثیت سے بھی یہ شہر بہت اہم ہے۔ وی آنا موسیقی، مصوری اور تھیٹرز وغیرہ کے لیے بھی مشہور ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں وی آنا کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہاں تیل برآمد کرنے والی کمپنیوں کا ہیڈ کوارٹر (OPEC) واقع ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی اٹامک انرجی (IAEA) کے دفاتر بھی یہیں ہیں۔ بعد میں روس اور امریکہ کے درمیان (SALT II) کا معاہدہ بھی یہیں ہوا۔

(۷)

یورپ۔۔ دیوار کے اِدھر اور اُدھر

کوئی تین روز کی سیر کے بعد پھر سفر جاری ہوا اور اب میری منزل ہنگری کا دارالخلافہ بوڈاپیسٹ تھا۔ ایک دم سے دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اب ہم مشرقی یورپ میں تھے۔ یہاں لندن، پیرس، فرینک فرٹ اور وی آنا جیسی گہما گہمی نہیں تھی۔ صفائی بھی اتنی نہیں تھی۔ ماحول سے غربت آشکارا تھی۔ شام کے وقت روشنیاں بھی بہت دھندلی اور مدھم تھیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے لاہور میں ہوتی ہیں۔ یہاں ایک طریقہ یہ دیکھا جو غالباً سارے مشرقی یورپ میں ہے کہ ٹرام میں سفر کرنے کے لیے ٹکٹ سگریٹ فروشوں کے کھوکھوں سے ملتے ہیں۔ ٹرام کے اندر دو تین جگہ ٹکٹ پنچ کرنے کی مشینیں لگی ہوتی ہیں۔ ان میں آپ ہی خود اپنا ٹکٹ پنچ کریں اور اپنی سیٹ پر بیٹھ جائیں۔ میں دو تین دن اور اس شہر میں ٹھہرا لیکن میں نے کبھی کسی چیکر کو ٹرام کے اندر ٹکٹ چیک کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ محض اتفاق تھا غالباً اسی شہر کے لیے اختر ریاض الدین نے لکھا تھا کہ یہاں فقیر نظر نہیں آتے۔ نہ سڑکوں پر نہ کانفرنس کی میزوں پر۔

شہر کا چکر لگاتے ہوئے اب شام کے سائے بڑھنے لگے تھے اور ماحول پر خاصا اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں دریا کے کنارے کنارے ٹہلتا رہا وہاں ایک خوبصورت پل تھا جس میں پرانی شاہی عمارات کا شکوہ تھا۔ پل کے اس پار غالباً کوئی قلعہ نما تعمیر بھی تھی جو شام کے دھندلکے میں کچھ اور بھی زیادہ رومانوی نظر آ رہی تھی لیکن تمام جگہ تقریباً ویران تھی کوئی ایک شکل چلتی پھرتی نظر نہیں آئی۔ اس وجہ سے پل کے اس پار جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ویسے بھی مشرقی یورپ کے متعلق لوگوں نے شروع سے ہی خاصا ڈرایا ہوا تھا۔ بہر حال گھوم پھر کر میں پھر

سٹیشن واپس آیا تا کہ پتہ کرسکوں کہ کہیں کوئی مناسب سی ٹھہرنے کی جگہ کا انتظام ہو اکہ نہیں ۔ریسپشن پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے مجھے ایک جگہ کا پتہ دیا اور اس جگہ کی نشان دہی بھی کر دی لیکن جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ بڑی اداس سی ویران جگہ ہے۔ آس پاس بھی زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔تمام عمارتیں آسیب زدہ سی لگتی تھیں اور ہر طرف بالکل خاموشی تھی۔لگتا تھا جیسے میں قرونِ وسطیٰ کے کسی شہر میں آ گیا ہوں۔ایک عجیب سی وحشت میرے اوپر طاری ہوگئی اور میں فوراً ہی سٹیشن کی طرف لوٹ گیا۔وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بلگراڈ کے لیے گاڑی آنے والی ہے۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا بے پناہ ہجوم تھا۔تاہم میں نے بوڈ پیسٹ کی سیر کا ارادہ بادل ناخواستہ ترک کیا۔گاڑی آئی تو وہ پہلے ہی مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔کسی نہ کسی طرح ایک ڈبے میں گھس گیا دیکھا کہ سیٹوں کے درمیان راستے میں بھی بیٹھنے کی تو کیا کھڑے ہونے تک کی جگہ نہیں تھی۔بہر حال کسی نہ کسی طرح وہاں پیر جمالیے اور بلگراڈ کے لیے روانہ ہوگیا۔

اگلے روز صبح بلگراڈ کی سیر کے لیے نکلا۔بلگراڈ پہنچ کر معلوم ہوا سب سے پہلے یہاں کا ویزا لینا ضروری ہے۔دوسرے ملکوں کے ویزے تو ریل میں ہی مل جاتے تھے اور دوران سفر ہی امیگریشن اور کسٹم وغیرہ کی کاروائیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن یوگوسلاویہ کا ویزہ وہیں سے لینا تھا۔(یہ بات بہت پرانی ہے۔ہوسکتا ہے کہ ویزا لینے نہیں بلکہ ویزے کے اندراج کا مسئلہ ہو) میرے ساتھ اور بھی کچھ لوگ تھے۔یہ تقریباً سب ہی یورپین تھے۔ہمیں بتایا گیا کہ بازار میں ایک دکان ہے جہاں ویزے کا ایجنٹ ملے گا۔ہم پانچ چھ لوگ وہاں پہنچے۔ایجنٹ نے ہم سے پاسپورٹ اور ویزے کی فیس لی اور ہمیں اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ہم ایک بڑی سے پراسرار عمارت پر پہنچے جس کا ایک بہت بڑا آہنی دروازہ تھا۔دروازے میں آنے جانے کے لیے ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ویزا ایجنٹ نے ہمیں باہر ٹھہرنے کو کہا اور خود اندر چلا گیا۔کوئی دو گھنٹے ہوگئے یا شاید پریشانی اور انتظار میں ہمیں دو گھنٹے محسوس ہوئے۔وہ واپس نہیں آیا۔سب کو بڑی تشویش ہوئی کہ پاسپورٹ بھی اس کے پاس ہیں اور آہنی دیوار کے اس طرف کے

حالات بھی کچھ مخدوش لگتے تھے۔ڈر تھا کہ کہیں وہ ہمیں بلیک میل نہ کرے۔دروازہ اندر سے بند تھا اور وہاں کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا۔نہ دروازے پر کوئی گھنٹی تھی۔دروازہ بہت کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہیں آیا اور یوں پریشانی بڑھتی گئی۔آخر کوئی دو گھنٹے پریشانی میں گزرنے کے بعد وہ کھڑکی سے نمودار ہوا۔ہماری جان میں جان آئی۔اس نے ہمارے پاسپورٹ لوٹائے اور اسی کی وساطت سے ہم نے رہنے کی جگہ بھی حاصل کر لی جو اتنی بری بھی نہیں تھی۔پروپیگنڈہ بھی کیا چیز ہے۔اچھے خاصے انسان کو بھوت اور بلا بنا دیتا ہے۔

یوگوسلاویہ میں ۹% مسلمان ہیں اور اس کے علاوہ یہاں دوسری قومیں بھی آباد ہیں۔سب سے زیادہ سرب (Serb) آباد ہیں۔اس کے بعد آبادی کے لحاظ سے کروٹس کا نمبر آتا ہے۔یہاں کی زندگی کافی کھلی ڈلی ہے۔یہاں کے لوگ مغربی یورپ والوں کی طرح سمٹے سمٹائے نہیں رہتے۔کچھ علاقوں میں تو ایسا لگا جیسے میں کراچی میں پھر رہا ہوں۔عورتیں بھی تقریباً میمن عورتوں کی طرح کے لباس میں تھیں اور بچے بھی بڑی بے پروائی سے کھیل رہے تھے جیسے ہمارے شہر کے پارکوں میں ہوتا ہے۔کوئی جھجک نہیں بالکل Unself-coscious یہ ماحول بہت ہی مانوس لگا۔البتہ غربت واضح نظر آتی تھی اور اسی نسبت سے شہر بھی کچھ اتنا زیادہ صاف نہیں تھا۔

بلگراڈ آہنی دیوار کے اندر بھی تھا اور باہر بھی۔اس زمانے میں مارشل ٹیٹو صدر تھے جو ڈپلومیسی کے ماہر تھے اور Tight Rope-dancer کہلاتے تھے۔انھوں نے امریکہ اور روس دونوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کیے ہوئے تھے۔یوگوسلاویہ کا نظام اشتراکی تھا لیکن ٹیٹو روس پر تنقید بھی کرتے رہتے تھے۔انھوں نے چین کے خلاف روس کا ساتھ بھی دیا تھا۔پھر کچھ عرصہ پہلے ہی (۱۹۶۳ء میں) انھوں نے کچھ دوسرے بین الاقوامی لیڈروں کے ساتھ مل کر غیر وابستہ بلاک بنایا تھا۔وہ غیر وابستہ تحریک کے ایک اہم رکن تھے۔''تیسری دنیا'' کو منظم کرنے میں ٹیٹو کا بڑا ہاتھ تھا۔تمام تر خدشات اور تعصبات کے

باوجود یہاں کے لوگ بہت ملنسار اور خوش اخلاق نظر آئے۔ پروپیگنڈہ بھی عجیب چیز ہے یہ لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے اور ایک دوسرے کے خلاف جذبات بھڑکانے میں بہت آگے رہتا ہے۔ اتنی دنیا گھوم کر اندازہ ہوا کہ سب انسان ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ البتہ ایک چیز جو لوگوں میں فرق کرتی ہے وہ ان کی مالی حیثیت ہے۔ اس کا تعلق ملکوں کے درمیان بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ہی ملک کے اندر رہنے والے مختلف لوگوں کے درمیان جتنی جتنی مالی حالت بہتر ہوتی جاتی ہے اتنے ہی انسانی رشتے کمزور پڑتے جاتے ہیں۔ مغرب کے ممالک میں ذاتی تعلقات تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں جب کہ مشرق کے غریب ممالک میں یہ تعلقات بہت مضبوط ہیں۔ خود مغربی ممالک میں بھی غریب علاقوں اور دور دراز دیہات میں لوگ کسی حد تک مہمان نواز بھی ہیں اور اجنبیوں سے اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ انگلستان کے دور افتادہ دیہات میں لوگ بہت ملنسار ہیں لیکن یہ فرق ہمارے ہاں بھی ہے۔ ڈیفنس یا گلبرگ میں پڑوسی ایک دوسرے کو نہیں جانتے جب کہ کچی آبادیوں اور غریب محلوں میں لوگ برادریوں کی طرح رہتے ہیں۔ اصل میں انسانوں کے دو ہی طبقے ہیں۔ غریب اور امیر قرۃ العین کے ابتدائی ناولوں میں طبقے واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں جہاں ہندو اور مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں لیکن غریب اور امیر میں فرق ہے۔ بہر حال سیاحت تعلیم کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور شعور میں پختگی پیدا کرتی ہے۔

بلگراڈ سے پھر ریل کا سفر دوبارہ جاری کیا اور اب رخ بلغاریہ کی طرف تھا۔ ریل میں اسی طرح کی کچھا کھچ تھی۔ یہ اورینٹ ایکسپریس تھی جو لندن سے چلتی تھی اور استنبول تک آتی تھی۔ ریل چلتی رہتی اور مسافر اترتے چڑھتے رہتے۔ اسی طرح اترتے چڑھتے سفر کرتے ہوئے لندن سے استنبول پہنچتے پہنچتے مجھے تین ہفتہ کے قریب لگ گئے لیکن سارا سفر نہایت خوش گوار اور بہت بامعنی رہا۔ میرا اگلا قیام بلغاریہ کا دارالحکومت صوفیا تھا۔

بلغاریہ ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کی سرحدیں یوگوسلادیہ، رومانیہ، یونان اور ترکی

سے ملتی ہیں۔ ۱۳۸٦ء سے تقریباً ۵۰۰ برس تک یہ علاقہ ترکی کے قبضے میں رہا۔ ۱۸۷۸ء میں روس نے ترکی پر زور دیا کہ وہ بلغاریہ کو آزاد کر دے لیکن یورپ کی دوسری حکومتوں کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں بلغاریہ مکمل طور پر روس کے زیر اثر نہ چلا جائے۔ چنانچہ ۱۸۷۸ء میں ایک معاہدے کے تحت بلغاریہ کو داخلی خود مختاری دے دی گئی اور اسے ترکی کی سرپرستی میں دے دیا گیا۔ ترکوں کے ۵۰۰ سالہ دورِ حکومت کی نشانیاں اب بھی بلغاریہ میں نظر آتی ہیں۔ صوفیہ کے عین مرکز میں خوبصورت سی ترکی طرز کی ایک مسجد ہے۔ مسجد بالکل صحیح سلامت ہے لیکن اس میں تالہ پڑا رہتا ہے لیکن اس کی اچھی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ غالباً اس کی دیکھ بھال ہوتی رہتی ہے۔

مشرقی یورپ کے تمام ملکوں میں تقریباً ایک جیسا ماحول ہے اور ایک جیسا نظام ہے البتہ صوفیہ میں عرب اور ایشیائی کافی تعداد میں نظر آئے۔ ایک ریسٹورنٹ میں جانے کا اتفاق ہوا تو یہی لوگ ملے۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان میں سے زیادہ تر غیر قانونی تجارت، منشیات اور سمگلنگ وغیرہ سے وابستہ تھے۔ کچھ اشتراکی انقلاب اور آزادی فلسطین کی باتیں بھی کرتے تھے۔ البتہ میں نے شروع سے ہی ایسے لوگوں سے دور رہنے کی کوشش کی۔ فرینک فرٹ میں مجھے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑ چکا تھا جو میرا پاسپورٹ ہتھیانے کے چکر میں تھے۔ وہاں تو میں نے کچھ جرمنوں سے دوستی کر کے اپنی جان بچائی لیکن یہاں صوفیہ میں زبان کا مسئلہ تھا اس لیے میں مقامی لوگوں کے قریب نہیں ہو سکا۔ البتہ اپنوں سے بچتا ہی رہا۔

میرا بہت جی چاہتا تھا کہ ان تمام ملکوں کے کلچر کو قریب سے دیکھوں۔ خصوصاً ان کے تھیٹر اور اوپیرا ہاؤس اور یونیورسٹیاں وغیرہ لیکن ایک تو ہر جگہ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اس لیے طلباء اور اساتذہ سے بہت کم ملاقات ہو سکی صرف عمارتیں ہی دیکھی جا سکیں۔ دوسرا تھیٹر اور اوپیرا وغیرہ میں مہینوں پہلے ٹکٹیں فروخت ہو جاتی ہیں اور تیسرا وقت کی کمی تھی اور مجھے پہلی ستمبر تک لاہور پہنچ کر یونیورسٹی میں حاضری بھی دینی تھی۔ پھر پیسوں کی کمی بھی آڑے آتی تھی۔ میں اس تمام سفر میں بمشکل پیرس کی ایک مشہور نائٹ کلب میں جا سکا اور برسلز کے ایک پتلی گھر تک

میری رسائی ہو سکی۔ پھر میں نے بھاگتے دوڑتے جو کچھ دیکھ لیا وہ بھی بہت تھا۔

صوفیہ سے اب اگلی منزل استنبول تھی لیکن گاڑی یونان کے کچھ حصے سے بھی گزرتی جس کے لیے ریل میں مجھے یونان کا ٹرانزٹ ویزا بھی لینا پڑا۔ اس لیے میرے پاسپورٹ میں یونان کا اندراج ہے مگر میں یونان نہیں گیا۔ ساری دنیا میں استنبول کا سفر میرے لیے سب سے زیادہ بور اور بے معنی گزرا۔ وجہ یہ تھی کہ میرے ایک پرانے واقف کار استنبول میں رہتے تھے۔ میں نے پیشگی ہی انہیں اپنے استنبول پہنچنے کی اطلاع کر دی تھی وہ اسٹیشن پر تو مجھے لینے نہ آ سکے البتہ ان کا پتہ میرے پاس تھا جس کی مدد سے میں خود ہی وہاں پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں انھوں نے میرے ٹھہرنے کا انتظام کر لیا تھا۔ میرے وہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد وہ خود بھی آ گئے۔ اس کے بعد تین چار روز کے میرے استنبول کے قیام کے دوران وہ مستقل میرے ساتھ رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ میں کسی ترک سے ملا نہ میں نے ترکی زبان سیکھی۔ ورنہ پیرس میں تین دن کے بعد میں اتنی فرانسیسی سیکھ گیا تھا کہ بازار سے چیزیں خرید سکوں اور ریل اور بس کے ٹکٹ لے سکوں یا آنے جانے والوں سے راستہ پوچھ سکوں۔ بغداد میں بھی۔ دو دن بعد میں نے حسب ضرورت عربی سیکھ لی تھی اور حلیب خرید سکتا تھا اور دیگر اشیاء بھی۔ البتہ ترکی میرے لیے ایسے ہی تھا جیسے میں نے صرف ٹی وی پر ترکی کی سیر کی ہو۔

ترکی کئی لحاظ سے ایک منفرد ملک ہے جہاں مشرق اور مغرب کی تہذیبیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ استنبول یورپ کا آخری شہر ہے اس کے بعد باسفورس ہے اور پھر ایشیا شروع ہو جاتا ہے۔ باسفورس سے گزر کر بحرِ اسود کے راستے روس تک پہنچا جا سکتا ہے۔ باسفورس کے دوسری طرف بحر روم ہے۔ پرانے وقتوں میں جب بازنطینی سلطنت اپنے عروج پر تھی تو یہ شہر بازنطیہ کہلاتا تھا۔ پھر عیسایت کا دور آیا اور یہ شہر مشرقی چرچ کا گہوارہ بنا تو اس کا نام شہنشاہ قسطنطین کے نام سے قسطنطنیہ رکھا گیا اور جب مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا تو یہ اسلام بول اور پھر استنبول ہو گیا۔ استنبول کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا سمندر ہے جو بحر مرمر

کہلاتا ہے۔ یہ یورپ کو ایشیا سے جدا کرتا ہے۔ اس کے مشرق میں باسفورس ہے اور مغرب میں درہ دانیال جو بحر مرمر کو Aegean Sea سے ملاتا ہے جو آگے چل کر بحرِ روم میں مل جاتا ہے۔ بحر مرمر ترکی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، یورپی ترکی اور اناطولیہ۔ لندن سے چل کر اورینٹ ایکسپریس براہِ راست استنبول تک پہنچتی ہے۔ مشرق و مغرب کے سنگھم پر ہونے کے علاوہ استنبول تین عظیم تہذیبوں، بازنطین، قسطنطین اور مسلم تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ ترکی کے شمال مغرب میں وہ شہر بھی تھا جس پر تاریخ کے سب سے بڑے المیے ایلیڈ اور اوڈیسی لکھے گئے۔ یہ ہومر نے لکھے تھے۔ جو حضرت عیسیٰ سے ۸۰۰ سے ۱۰۰۰ برس قبل کے زمانے سے تعلق رکھتا تھا۔ استنبول میں بڑی تعداد میں اور بہت خوبصورت مساجد ہیں جن میں مسجدِ احمد یا نیلی مسجد سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کے حمام بھی سیاحوں کے لیے بڑی کشش رکھتے ہیں۔ یہاں کا بازارِ حسن بھی عالمی شہرت رکھتا ہے۔ استنبول میں میرے رہنما نے ایک ایک جگہ بڑی تفصیل سے دکھائی۔ بازارِ حسن میں لوگوں کا بڑا ہجوم تھا لیکن ان مناظر سے میری طبیعت بہت مکدر ہوئی۔ برآمدوں میں حسن کی نمائش اور فروخت کے منظر لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ اربابِ نشاط خوب میک اپ کیے آ جا رہی تھیں۔ کچھ ملبوس، کچھ نیم برہنہ اور کچھ تقریباً بالکل ہی برہنہ، بہرحال کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ نسلِ انسانی کا قدیم ترین پیشہ ہے۔

استنبول کا پرانا قلعہ جس کا نام ٹوپ کاپی ہے یہ بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ اس میں اوائل اسلام سے لے کر اموی دور تک کے نوادرات محفوظ ہیں۔ استنبول کے گرد و نواح میں بہت سی تفریح گاہیں ہیں۔ ہم بھی ایک فیری کے ذریعے ایسے ہی ایک جزیرے غالباً شمران پہنچے۔ وہ بالکل مری کی طرح لگا۔ اسی طرح چہل پہل، اسی طرح فیشن شو۔ وہاں تفریح کے سارے سامان موجود تھے۔ کھیل تماشے اور انواع و اقسام کے کھانے تہذیب و تمدن کے لحاظ سے استنبول بالکل ہی یورپ ہے البتہ یہاں کے دسترخوان میں کچھ مشرقیت ضرور نظر آتی ہے۔ لاہور میں ایک مرتبہ ترکی کی ایک خاتون وزیر آئیں۔ وائس چانسلر

نے میرے سپرد یہ کام کیا کہ میں انھیں لاہور کے اہم مقامات کی سیر کراؤں۔ یونیورسٹی میں ایک بزرگ استاد نے ان محترمہ سے کہا کہ وہ مسلمان ہیں لیکن ان کا لباس غیر اسلامی ہے۔ اس پر وہ بہت برہم ہوئیں اور کہا کہ وہ پاکستانیوں کی طرح صرف دکھاوے کے مسلمان نہیں ہیں۔ ترک سچے دل سے مسلمان ہیں۔ بہر حال مجھے وہ خاتون اس لیے یاد آئیں کہ انھوں نے بھی سکرٹ پہنی ہوئی تھی یہی ترکی میں عام عورتوں کا لباس ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ترکی میں مجھے لوگوں سے گھلنے ملنے کا موقع نہیں ملا اس لیے کہ میرے گائیڈ اور ترجمان ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے۔ البتہ ترکی کے لوگوں کی کچھ باتیں مجھے بہت عجیب لگیں۔ مثلاً کسی دکان سے آپ کچھ خریدنا چاہتے ہیں اور وہ چیز اس کے پاس نہیں ہے تو وہ سر کو اوپر کی طرف جھٹکا دے کر زبان سے چیخ کی آواز نکالے گا۔ جس کا مطلب ہے نہیں اور اگر وہ چیز اس کے پاس ہوگی تو وہ مسکرا کر گردن کو دائیں بائیں ہلائے گا جیسے ''نہیں'' کہہ رہا ہو مگر اس کا مطلب ہوگا کہ ہاں وہ چیز اس کے پاس ہے۔ کئی روز تک یہ پتہ نہیں لگا کہ یہ ہاں ہے کہ نہیں۔

غرض استنبول میں خوب گھوم پھر کر ایک ایک چیز کو دیکھا۔ یونیورسٹی بھی گئے اور پروفیسروں، طالب علموں سے ملاقات بھی ہوئی۔ گو یونیورسٹی بند تھی پھر بھی کچھ لوگ مل ہی گئے۔ پھر ایک روز میرے میزبان مجھے اپنی ایک واقف کار خاتون کے ہاں لے کر گئے۔ یہ اپنی عمر کے درمیانی حصہ سے گزر رہی تھیں اور بہت مہمان نواز اور خوش اخلاق تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہ صاحب بزم تھیں اور انھیں خوش نشین کہا جا سکتا تھا۔ وہ انگریزی اصطلاح میں سوسائٹی وومن تھیں۔ یہاں کا دستور یہ دیکھا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی دروازے کے باہر جوتے اتار دیے جاتے تھے۔ محفل فرشی تھی۔ چاندنیاں اور گاؤ تکیے سلیقے سے بچھے ہوئے تھے۔ اندرون خانہ چلنے پھرنے کے لیے ربر یا پلاسٹک کے موزے تھے جو کچھ سلیپر نما تھا۔ یہ نشست عثمانیہ ثقافت کا خالص نمونہ نظر آئی۔

یہ شہر بھی اپنی مثال آپ ہے۔ کہیں تو لگتا تھا کہ جیسے بالکل لندن یا پیرس میں چل رہے ہیں اور کہیں محسوس ہوتا تھا کہ بالکل الف لیلوی دنیا میں آ گئے ہیں۔ میرے میزبان کو شاید سب میزبانوں کی طرح اپنے مہمان کو آثار قدیمہ دکھانے کا بہت شوق تھا۔ استنبول تک پہنچتے پہنچتے یہ شوق میرے لیے بالکل ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ انگلینڈ اور ویلز کی سرحد پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے قلعوں، ورسائی اور پیرس کے محلوں سے لے کر ٹوپ کاپی کے کھنڈروں اور مقبروں تک تقریباً ایک ہی منظر تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ عموماً سیاح لوگ اتنے بور کیوں ہوتے ہیں۔ جس طرح دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ایک یکسانیت ہے اسی طرح ان کے کھنڈر بھی ایک ہی جیسے ہیں۔ البتہ صرف امریکہ میں ایک مرتبہ تو احساس ہوا کہ یہ کوئی اور ہی دنیا ہے لیکن جب امریکہ میں گھومے پھرے تو پتہ لگا کہ یورپ اور ایشیا سے مختلف سہی، سارا امریکہ ایک ہی جیسا ہے۔ فلیڈلفیا ہو یا اٹلانٹا یا لونگ آئی لینڈ سب ایک ہی طرح کے ہیں۔ اس سے غالباً یہ بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سب انسان ایک طرح سوچتے ہیں۔ اسی لیے دنیا بھر کے شہروں کی عمارتوں صناعی کے نمونوں اور فن پاروں میں ایک باہمی رشتہ نظر آتا ہے۔ سب شہر ایک جیسے ہیں۔ سب کھنڈر ایک جیسے ہیں۔ سب انسان ایک جیسے ہیں۔ فرق ہے تو صرف غربت اور امارت کا اور یہ فرق فطری نہیں خود انسانوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔

....

(۸)

عراق، ایران، افغانستان

آیا صوفیہ اور باسفورس سے گزر کر ہم ایشیائی ترکی میں داخل ہوئے اور وہاں سے دوبارہ ریل میں سوار ہوئے۔ اب ہمارا رخ شام کی طرف تھا۔ استنبول تک آنے والی گاڑی میں دو ہی درجے تھے۔ اول اور دوئم، ادھر سے چلنے والی گاڑی میں چار درجے تھے۔ گاڑی انقرہ کے قریب سے گزری لیکن اب پیسے ہی ختم ہو رہے تھے اور وقت بھی تھوڑا تھا۔ اس لیے انقرہ دیکھنے کا ارادہ ترک کیا اور سفر جاری رکھا۔ کوئی سہ پہر کے وقت ہم شام کی سرحد پر پہنچے۔ یہاں دو باتیں بہت دلچسپ ہوئیں۔ پہلی تو یہ کہ فرسٹ کلاس کی سواریاں دوسرے درجہ کے ڈبوں کی طرف دوڑیں اس لیے کہ شام میں انقلاب آ چکا تھا اور وہاں صرف ایک درجہ کی اجازت تھی۔ ایک لڑکی جو پیرس میں ایک انڈر گریجویٹ طالب علم تھی اپنی نانی کے ساتھ ہمارے ڈبے کی طرف آئی۔ لوگوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ ان عورتوں کو اندر آنے کی جگہ ہی نہیں ملتی تھی۔ میں نے بڑی بی کو اندر بلا کر اپنی سیٹ دے دی اور خود اوپر کی برتھ پر چلا گیا۔ لوگ گاڑی کے فرش پر بھی بیٹھے ہوئے تھے اور سیٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے نیچے پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں ٹکٹ چیکر آیا اور جو لوگ اوپر کی برتھوں میں بیٹھے ہوئے تھے انھیں اتارنے لگا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اس لیے کہ وہاں سے اترنا پڑتا تو پھر گاڑی سے ہی اترنا پڑتا اور اپنی سیٹ تو میں پہلے ہی دے چکا تھا۔ اس نے مجھ سے ٹکٹ مانگا۔ میرے پاس لندن سے بغداد تک ریل کا ٹکٹ تھا وہ میں نے اسے دے دیا۔ اس پر چھوٹا سا ٹکٹ فیری کا بھی پن سے لگا ہوا تھا۔ اس فیری سے میں انگلستان کی بندرگاہ ڈوور سے بیلجیم کی بندرگاہ اینسٹورپ پہنچا تھا۔ چیکر نے وہ چٹ دیکھی تو مجھ سے کہا کہ ٹھیک ہے آپ اوپر ہی بیٹھے رہیں آپ کے ٹکٹ میں ریزرویشن چٹ لگی ہوئی ہے۔ یوں میری بچت ہوئی۔ اب میں آرام

سے بیٹھ گیا اور وہ لڑکی بھی جو چھٹیاں گزارنے اپنے گھر جا رہی تھی اپنی نانی کو آرام سے لٹا کر اوپر ہی میرے ساتھ برتھ پر آ گئی۔ اس سے پیرس اور لندن کی باتیں ہوتی رہیں اور یوں وقت اچھا کٹ گیا۔

دوسری اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ سرحد پر پہنچ کر گاڑی رک گئی اور جب تین چار گھنٹے ہو گئے تو لوگوں کو تشویش ہوئی۔ گاڑی کے سرحدی اسٹیشن پر پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی امیگریشن عملہ سب سواریوں کے پاسپورٹ ویزا لگوانے کے لیے لے گیا تھا۔ پانچ چھ گھنٹے گزرنے کے بعد تشویش اور بھی بڑھی۔ میں پلیٹ فارم پر ادھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ ایک نوعمر سی لڑکی میرے پاس آئی۔ سنہری بال، نیلی آنکھیں، جینز پہنے ہوئے، اس نے مجھ سے فرانسیسی میں کچھ کہا جو میں نہیں سمجھ پایا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شام کی رہنے والی ہے پھر اس نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس ماچس یا لائٹر ہے اور اپنی بیلٹ میں بل دے کر رکھی ہوئی سگریٹ نکالی جیسے ہمارے لوگ نیفوں میں پیسے اڑس لیتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ ساتھ ہی ایک مسافر ہمارے قریب سے گزرا جس کے ہاتھ میں آدھی جلی ہوئی سگریٹ تھی۔ لڑکی نے سگریٹ سلگانے کے لیے اس سے بھی کوئی چیز لائیٹر وغیرہ مانگی۔ اس نے وہ سگریٹ اسے دے دیا جو لڑکی نے لے لیا اور کش لگانے لگی۔ اپنی سگریٹ اس نے دوبارہ بیلٹ میں اڑس لی۔ اب تو یہ معلوم ہو ہی گیا تھا کہ وہ شامی ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ یہاں جو امیگریشن کا عملہ ہے وہ انگریزی نہیں سمجھتا۔ تم ان سے پوچھ کر بتاؤ کہ آخر گاڑی آگے کیوں نہیں روانہ ہو رہی۔ ہم دونوں ان لوگوں کے پاس گئے جو اپنے سامنے ہمارے پاسپورٹوں کا ڈھیر لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی نے عربی میں ان سے باتیں کیں اور پھر مجھے بتایا کہ یہاں حکومت ابھی ابھی تبدیل ہوئی ہے اور جب حکومت بدلتی ہے تو صرف سیاست دان ہی تبدیل نہیں ہوتے بلکہ دفتری عملہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کا ابھی ابھی یہاں تقرر ہوا ہے اور انھیں پاسپورٹ اور ویزا کے ضابطوں کا علم نہیں ہے۔ چنانچہ ایک آدمی کو ہیڈ

کوارٹر بھیجا گیا ہے تاکہ وہ وہاں سے کسی تجربہ کار آدمی کو ساتھ لائے۔کوئی رات گئے وہ شخص آیا اور پھر ہمارے ویزے لگے اور گاڑی روانہ ہوئی۔

یہ لڑکی شام کی رہنے والی تھی اور صرف سفید جلد، سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ اپنی گفتگو اور طور طریقوں سے بھی بالکل یورپین لگتی تھی۔بالکل پیرس کی کسی لڑکی کی طرح۔نہ شرم، نہ جھجک، نہ حیا، نہ ہی اپنے لڑکی ہونے کا احساس اور میرے ساتھ وہ پلیٹ فارم پر ایسے گھومتی رہی اور دوسرے مسافروں سے بھی باتیں کرتی رہی جیسے وہ لڑکی نہیں بلکہ کوئی لڑکا ہے۔

اب گاڑی روانہ ہوئی اور ہم اپنے ڈبوں میں چلے گئے۔گاڑی اسٹیشن پر رکی اور بہت سے لوگ اترے اور چڑھے اور پھر گاڑی بغداد کے لیے روانہ ہوگئی اور ہم عراق کے شہر موصل پہنچے۔یہاں سے کچھ نوجوان خواتین بھی سوار ہوئیں۔یہ چار پانچ خواتین معلوم ہوا کہ سب استانیاں ہیں اور چھٹیوں میں سیر و تفریح کی غرض سے نکلی ہوئی ہیں۔ان سے کیمرج ،لاہور، تعلیم اور کلچر وغیرہ پر دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ایک نے کہا کہ یورپ کی عورتیں تو بڑی بے حیا(ح پر کچھ زیادہ ہی زور تھا) ہوتی ہیں۔میں نے کہا کہ نہیں وہاں کی لڑکیاں تو بہت مہذب اور بااخلاق ہوتی ہیں۔تو دوسری بولی وہ تو ننگی پھرتی ہیں اور خود اس نے سکرٹ پہنی ہوئی تھی تو اس نے بری جھنجھلاہٹ میں اپنی سکرٹ کو نیچے کھینچنے کی کوشش کی اور جب یہ ناکام رہی تو اس نے اپنا رومال ٹانگوں پر پھیلا لیا پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔وہ سب ہندوستانی فلموں کی بہت شوقین لگتی تھیں اور خاص طور سے شمی کپور ان کا ہیرو تھا جس کی ایک ایک ادا پر وہ مرتی تھیں اور تفصیل سے اس کی اداکاری پر تبصرہ کرتی تھیں۔پھر انھوں نے میرے سفر کے متعلق باتیں کرنی شروع کر دیں اور میرے بیان سے وہ بہت زیادہ متاثر نظر آ رہی تھیں۔میں نے امریکہ اور یورپ کے شہروں اور لوگوں کے متعلق انھیں تفصیلات بتائیں۔پیرس اور وی آنا کے حسن کی بات کی اور مین ہٹن کی سکائی سکریپر کا تذکرہ کیا اور

میں نے ان کو بتایا کہ آخری خوبصورت شہر جو میں نے دیکھا وہ استنبول تھا۔جہاں تاریخ ،تہذیب، ثقافت اور جدید اور قدیم کا خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے پھر میں نے انھیں بتایا کہ بغداد کے الف لیلوی شہر کو دیکھنے کا بھی مجھے اشتیاق ہے اور اس کے بعد میں کربلا اور نجف اور دیگر متبرک مقامات پر بھی جاؤں گا۔ایک نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں شیعہ ہوں۔جب میں نے ہاں میں جواب دیا تو تقریباً سب ہی بول اٹھیں کہ یہ بہت برے ہوتے ہیں۔میں نے وجہ پوچھنی چاہی تو ان کے پاس کوئی خاص جواب نہیں تھا۔صرف ایک احساس تھا اور ایک طرح کی بدگمانی۔بہت عرصے کے بعد یہ احساس ہوا کہ دنیا میں صرف انسان نہیں بستے بلکہ شیعہ اور سنی ہی بستے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو کچھ زیادہ انسان بھی نہیں سمجھتے ہیں۔مغرب میں رہ کر یہ حقیقت تقریباً ذہن سے ہی نکل گئی تھی۔ویسے بھی یونیورسٹیوں کا ماحول ذرا مختلف ہوتا ہے۔وہاں تو رنگ و نسل کو اکثر زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔بہر حال ان خواتین کی باتوں سے مجھے یک لخت یہ احساس ہوا کہ میں اپنی دنیا میں واپس لوٹ رہا ہوں جہاں ہر قسم کے تعصبات ہیں۔مشرق اور مغرب کے بھی اور شیعہ سنی کے بھی۔البتہ ہندوستانی فلموں پر کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن سب سے زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب بغداد کے قریب آتے ہی ان تمام خواتین نے برقعے اوڑھ لیے۔میرے پوچھنے پر انھوں نے صرف اتنا ہی کہا کہ آپ کچھ روز عراق میں ٹھہریں گے تو یہ سب باتیں آپ پر خود بخود واضح ہو جائیں گی۔

چنانچہ بغداد کا اسٹیشن آیا اور ریل کا یہ طویل سفر ختم ہوا۔اس کے ساتھ ساتھ لندن سے خریدا ہوا لندن تا بغداد ریل کا ٹکٹ بھی ختم ہو گیا۔جیسا پچھلے واقعات سے ظاہر ہے۔اس طویل براہِ راست ٹکٹ کے بہت سے فائدے بھی ہوئے۔بغداد سے پاکستان کا سفر بذریعہ سڑک تھا۔آگے ریل نہیں،سوائے ایران کے جہاں چھوٹی پٹڑی کی گاڑی کی ایک بہت محدود سروس ہے۔

بغداد میں اتر کر میں نے اسٹیشن پر اپنا سامان رکھا اور ایک بیگ کندھے پر لٹکا کر شہر

کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں بغداد کے بجائے کاظمین میں ٹھہرنا چاہتا تھا بغداد کے بالکل قریب ہی مگر یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بسوں اور ویگنوں کے اڈے پر سب ہی لوگ اردو جانتے تھے اور دکان داروں سے کسی حد تک اردو میں بات چیت ہوسکتی تھی۔ شہر کے اہم چوراہے اور بازاروں میں مختلف مقامات پر کمیونسٹ پارٹی اور جنگ آزادی کے جیالوں کے مجسمے نصب تھے۔ ایک تو یہ نئی چیز اس شہر میں دیکھی کہ بڑی کاریں، فورڈ، مرسیڈیز اور شورلٹ وغیرہ سڑکوں پر دوڑتی نظر آئیں اور یہ ٹیکسیوں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ لیکن اس میں دو باتیں میرے لیے نئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ ٹیکسیاں سواریوں کو فی سواری کے حساب سے بٹھاتی تھیں اور دوسرے یہ کہ کرایہ فاصلے کے مطابق ہوتا تھا۔ یعنی ایک طرح سے یہ وہاں کی پبلک ٹرانسپورٹ تھی۔

بغداد کی سیاسی اور سماجی زندگی کا ایک منظر مجھے اس وقت نظر آیا جب میں نے دیکھا کہ ایک بڑے سے بازار میں گلی کی طرف ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اس کے پیچھے دو تین آدمی تھے جن میں ایک اس بھاگنے والے پر مسلسل پستول سے گولیاں چلا رہا تھا۔ میں نے دیکھا بازار میں نہ کوئی حراساں ہوا ورنہ کوئی بھاگا گویا ان کے لیے یہ کوئی معمول کی بات تھی۔ یہ سب بھاگتے ہوئے کسی دوسری گلی میں داخل ہوئے اور یوں یہ منظر کسی قسم کی ہلچل مچائے بغیر آہستگی سے ختم ہوگیا۔

ایک جگہ کچھ لوگ ایک تنبو کے نیچے ایک دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے عبدالقادر جیلانی کے مزار کا پتہ پوچھا۔ وہ کسی نے نہیں بتایا البتہ ایک آدمی نے اٹھ کر مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں ایک پاکستانی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ میرے پاس اجازہ (ویزا) ہے میں نے کہا کہ ہے۔ اس نے کہا مجھے دو۔ میں نے کہا کہ میں یہ کسی ذمہ دار آدمی کو دکھا سکتا ہوں۔ ایک تو شکل وصورت سے ہی یہ لوگ کچھ مشکوک سے نظر آئے۔ دوسرے میں بغداد کے نظم وضبط کا حال خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس لیے ان کی دھمکیوں اور زبردستیوں کے باوجود میں نے اپنا پاسپورٹ انھیں

نہیں دکھایا۔ پھر میں نے انھیں بتایا کہ میں یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں اور انگلستان سے پڑھ کر آرہا ہوں۔ شاید وہ کچھ مرعوب ہوئے یا پھر میری طرف سے کسی فائدے کے امکان سے مایوس ہوئے۔ بہرحال انھوں نے مجھے چھوڑ دیا۔

میں نے ایک دکان پر ''حلیب المعقم'' کا بورڈ دیکھا اور اندازہ لگایا کہ اس کا مطلب Sterilized Milk ہے۔ یہ پہلا عربی کا لفظ ہے جو میں نے بغداد میں سیکھا آہستہ آہستہ چند اور لفظ بھی سیکھنے۔ جیسے دکانوں کے بورڈ اشیائے صرف کے نام، سڑکوں اور گلیوں کے نام اور روڈ سائنز وغیرہ البتہ ایک بات سے مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ عبدالقادر جیلانی کا مزار کہاں ہے لیکن لوگ میری بات ہی نہیں سمجھتے تھے۔ آخر ایک بزرگ نے یہ اشارہ دیا کہ میں غالباً پیر ہندی کا پوچھ رہا ہوں۔ بات واقعی تعجب کی تھی اس لیے کہ یہاں انھیں پیر بغداد کہا جاتا ہے۔ شہر سے کچھ دور ایک چوراہے پر ایک چھوٹا سا مزار نظر آیا جس پر امام اعظم کی تختی لگی ہوئی تھی۔ روضہ پر قفل لگا ہوا تھا اور وہاں دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ان باتوں سے اندازہ ہوا کہ بغداد میں لوگوں کا مذہب کچھ زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ اس مزار پر ایک گھنٹہ بھی لگا ہوا تھا۔ لیکن اس پر وقت غلط تھا۔ بعد میں میرے پوچھنے پر ایک عراقی نے بتایا کہ گھنٹہ پر مکہ کا مقامی وقت دیا ہوا ہے۔

میں اسی طرح شہر کے مختلف مقامات کو دیکھتا ہوا اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا اور ابھی رہائش کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا کہ اچانک ایک سیاہ فام نوجوان سے مڈبھیڑ ہوئی جو فوراً ہی دوستی میں بدل گئی۔ پتہ چلا کہ یہ بغداد یونیورسٹی میں میڈیکل کا طالبِ علم ہے۔ اس لڑکے پر مجھے کچھ بھروسہ سا ہوگیا ورنہ میں اجنبیوں سے ذرا ہوشیار ہی رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دو اور ہم جاعتوں کے ساتھ رہتا ہے اور ان تینوں نے دریا کے قریب ایک مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی جو میں نے بخوشی قبول کرلی۔ وہ ایک کافی پرانی سی کوٹھی میں رہتے تھے جہاں ایک بڑا سا کولر لگا ہوا تھا جس سے سارا گھر کافی ٹھنڈا ہوگیا

تھا۔ ویسے باہر بہت گرمی تھی اس سوڈانی کا کہنا تھا کہ یہاں موسم بارہ مہینے ایسا ہی رہتا ہے اور سورج اپنی پوری تمازت کے ساتھ چمکتا رہتا ہے۔ تب مجھے محرم کے متعلق وہ بات یاد آئی جس کے متعلق کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کیلنڈر کے مطابق عاشورہ محرم ۶۱ھ کو اکتوبر کی ۷ تاریخ تھی۔ یقیناً کھلے صحرا میں یہ اتنا ہی گرم موسم ہوگا جیسے اب اگست کے قریب تھا۔ میرے دوست نے مجھے بتایا کہ وہ پڑھائی کی وجہ سے تین چار روز میرا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ چنانچہ میں نے اس دوران کاظمین نجف اور کربلا جانے کا پروگرام بنالیا۔ سب سے پہلے میں کاظمینؑ گیا جو مضافات بغداد میں ہی ہے۔ جو سڑک کاظمین جاتی ہے وہ شارع امامین کہلاتی ہے۔ اس لیے امام اعظم اور امام موسیٰ کاظمؑ دونوں کے مزار اسی سڑک پر ہیں۔ یہاں کا منظر بغداد سے بالکل مختلف تھا۔ سخت مذہبی فضا تھی اور روضہ اور اس سے ملحقہ بڑی سی مسجد زائروں اور نمازیوں سے بھری ہوئی تھیں اور ہر طرف لوگ مختلف عبادات میں مصروف تھے۔ روضے بہت خوبصورت بنے ہوئے ہیں جن کے گنبدوں اور میناروں پر سونے کے پترے چڑھے ہوئے ہیں روضوں کے اندر قیمتی قالینوں اور جھاڑ فانوس کی بہتات ہے۔ مردوں سے زیادہ عورتیں نظر آتی ہیں لیکن برقعوں میں ملبوس یا سیاہ چادروں میں لپٹی ہوئی۔ ایک صحن میں کوئی عالم ممبر سے وعظ دے رہے تھے۔ دوسرے صحن میں مجلس عزا منعقد تھی۔ روضے کے اندر اور باہر بڑی رونق تھی اور لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔

کاظمین سے میں ایک ویگن کے ذریعہ نجف کے لیے روانہ ہوا۔ یہاں مجھے احساس ہوا کہ عراق میں کس قدر انتظامی سختی اور سخت گیری ہے۔ ہر صوبہ کی سرحد پر ہر مسافر کو اجازہ یا پرمٹ دکھانا ہوتا ہے۔ یعنی عراق کے لوگ اپنے ملک میں بھی آزادی کے ساتھ نہیں گھوم پھر سکتے بعد میں کسی نے بتایا کہ روس میں بھی ایسا ہی نظام رائج ہے جہاں ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لیے پرمٹ لینا پڑتا ہے۔ نجف میں بڑی گہما گہمی دیکھنے میں آئی۔ پورا بازار چھت کے نیچے ہے۔ بازار سے گزر کر ایک بڑے دروازے سے باہر نکلتے ہیں تو سامنے

حضرت علیؑ کے روضے کے مینار اور گنبد نظر آتے ہیں۔ روضے کے بغل میں ہی خاصہ بڑا سا قبرستان ہے۔ یہاں مزار کے علاوہ ایک بڑا حوزۂ علمی یا دینی یونیورسٹی بھی ہے جہاں طلباء اور اساتذہ کے ہجوم مطالعہ یا عبادات میں مصروف نظر آتے ہیں ہر طرف جبہ و دستار اور عبادات کا زور ہے۔ علیؑ شیعوں کے امام بھی ہیں اور خلافت راشدہ میں بھی شامل ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں سنی، شیعہ کی کوئی تفریق نہیں۔ دونوں فرقوں کے علماء اور زائرین یہاں پوری عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے ہیں۔

نجف میں اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ مرقد علیؑ پر رکھی ہوئی ضریح تک پہنچنا ایک اچھا خاصہ مرحلہ ہے۔ یہاں ضریح کے اندر لوگوں کے لائے ہوئے نذرانے اور سکے وغیرہ بھی نظر آتے ہیں ایک طرف ایک تاج بھی رکھا ہوا ہے۔ روایت ہے کہ نادر شاہ حضرت علیؑ کا بہت معتقد تھا اور جب وہ بادشاہ بننے کے بعد نجف آیا تو اپنا تاج قبر پر رکھ دیا اور کہا کہ اصل بادشاہ تو آپ ہیں اور یہ تاج آپ کا حق ہے۔ نادر شاہ کے متعلق ایک کہانی بھی پہلے سے سنی ہوئی تھی۔ نادر شاہ ہر سال روضے کی زیارت کو آتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ایک اندھے کو دیکھا جو مزار کے دروازے پر رو رو کر اپنی بینائی کے لیے مولا علیؑ کے توسط سے دعا مانگ رہا تھا۔ نادر شاہ نے اسے کچھ بطور خیرات دیا اور زیارت کر کے چلا گیا۔ اگلے سال اس نے پھر اس نابینا کو رو رو کر دعائیں مانگتے دیکھا تو اسے غصہ آ گیا۔ اس نے فقیر سے کہا کہ اس در سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ تو میرے مولا کو بدنام کر رہا ہے۔ میں زیارت کے لیے اندر جا رہا ہوں۔ اگر میری واپسی تک تیری بینائی نہ آئی تو میں تیرا سر اڑا دوں گا۔ اب تو اس نے گڑگڑا کر دعا مانگی اور اس کی بینائی واپس آ گئی۔

نجف اور کوفہ کے بعد میں کربلا کے لیے روانہ ہوا۔ اس زمانے میں کربلا ایک پرانا سا چھوٹا شہر تھا جس کی گلیاں بہت تنگ تھیں۔ البتہ روضۂ حسینؑ اور روضۂ عباسؑ کے باہر کافی کھلی جگہ تھی پہلے میں امام کے روضہ میں گیا۔ اس وقت صرف چند ہی لوگ موجود تھے۔ اسی

دوران کوئی آٹھ دس عراقی عورتوں کا ایک گروہ وہاں آیا۔ان سب نے برقعے اوڑھے ہوئے تھے اور نیچے سکرٹ پہنے ہوئے تھے۔یہ نچلے طبقے کی عورتیں لگتی تھیں جنھوں نے جرابیں بھی نہیں پہنی ہوئی تھیں جوتے وہ روضے کے باہر ہی اتار آئی تھیں۔ننگے پیر، ننگی ٹانگیں، سکرٹ اور برقع۔کچھ بہت عجیب سا لگا۔

روضے میں مکمل سکون تھا بلکہ ماحول پر ایک طرح کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔میں امام حسینؑ کی ضریح اور گنج شہیداں کے درمیان کھڑا تھا کہ ایک بزرگ سنجیدہ صورت مولانا میرے پاس آئے اور بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے مجھے ایک ستون کے پیچھے لے گئے اور کچھ عربی کچھ اردو میں کہا کہ آؤ میں تمھیں زیارت پڑھا دوں۔پھر ڈرتے ڈرتے اشارے سے بتایا کہ وہ سامنے سپاہی کھڑا ہے اس کی نظریں ہم پر ہیں۔زیارت سے زیادہ میں اس وقت اُس بزرگ شخصیت کے متعلق سوچنے لگا۔انھوں نے مجھے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کے گھر میں کھانے کو بھی کچھ نہیں ہے۔میرے ذہن میں ایک عجیب سی کشمکش تھی۔ایک طرف تو مجھے ان بزرگ سے ہمدردی محسوس ہوئی۔میں نے انھیں کچھ پیسے دینے چاہے تو وہ اور بھی ڈر گئے اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جلدی سے میرے ہاتھ سے پیسے جھپٹ کر اپنے چوغے میں چھپا لیے۔معلوم ہوا کہ وہاں کسی زوار سے نذرانہ وغیرہ لینے پر سخت پابندی ہے اور اس کی کڑی سزا ہے۔دوسری طرف ان مولانا پر مجھے غصہ بھی آ رہا تھا کہ انھوں نے آخر مذہب کو ذریعہ معاش کیوں بنالیا اور کیوں خود کو اس قدر معتبر اور مقدس بنالیا کہ رزقِ حلال کمانے کے امکانات ہی ختم کر دیے، لیکن ساتھ ہی مجھے اپنے ملک کے علما کا خیال آیا جو باقاعدہ خونِ حسین کی تجارت کرتے ہیں کچھ دور ہی میں نے دیکھا کہ دو علما ایک شخص کو زیارت پڑھانے کے لیے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

روضہ عباسؑ پر اس سے بھی کم لوگ تھے لیکن وہاں کوئی مولوی صاحبان نہیں تھے جب کہ امام حسینؑ کے روضے پر میں نے علما کو زیارت پڑھانے کے لیے لڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

روضوں سے نکل کر میں قریب کی ایک گلی میں داخل ہو گیا۔گرمی بہت زیادہ تھی اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ایک دکان سے میں نے شربت لیا۔دکان دار نوعمر لڑکا ہی تھا۔وہ میرے ساتھ باتوں میں لگ گیا۔میں نے اپنا مفصل تعارف کرایا تو اس نے کہا کہ یہ سامنے جو ایک برجی سے بنی ہوئی ہے۔جو گلی کے بیچوں بیچ ایک کھلی سی جگہ پر تھی۔یہ بھی ایک زیارت گاہ ہے۔میں نے پوچھا کس کی زیارت ہے تو اس نے کہا کہ معلوم نہیں۔ہندی لوگ یہاں آ کر دعائیں پڑھتے ہیں۔میں نے اندازہ لگایا کہ یہ تلہٗ زینبیہ ہے۔

میرے میزبان پڑھائی میں مصروف تھے میں نے اکیلے ہی بغداد میں گھومنے کا پروگرام بنایا۔بغداد کے قریب ہی ایک پرانی۔خستہ حالت عمارت ہے جس کی بڑی بڑی محرابیں ہیں۔یہ طاق کسریٰ ہے اس کے باہر ایک بہت بلند محراب کے نیچے ایک وسیع وعریض شامیانہ ہے جس میں بہت دبیز بڑے بڑے لیکن زمانے کے روندے ہوئے قالین بچھے ہوئے ہیں۔گاؤ تکیے اور گدے بڑے ترتیب سے لگے ہوئے ہیں۔یہاں ایک عظیم الشان حقہ درمیان میں رکھا ہوا ہے۔جس کی نالی ایک نہیں ہے بلکہ دس بارہ بڑی بڑی نالیاں اس سے جڑی ہوئی ہیں جو شامیانہ میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور شامیانے کے باہر تک ان میں سے کچھ جاتی ہیں۔ان سے بیک وقت دس بارہ لوگ حقہ کے کش لگا سکتے ہیں۔یہاں چھوٹی چھوٹی نوادرات قسم کے پیالیوں میں قہوے سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے۔گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے لوگ قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے اور حقہ کے کش لگاتے ہوئے بالکل قرونِ وسطیٰ کے بغداد کے سحر انگیز منظر میں کھو جاتے ہیں۔

کربلا اور نجف سے واپس پہنچا تو ابھی میرے سوڈانی دوستوں کے امتحانات جاری تھے۔

اگلے روز جب میرے میزبان امتحان سے فارغ ہو گئے تو ان میں سے ایک نے میرے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا۔یہ نوجوان ایک سمارٹ سوڈانی تھا لیکن اس کا رنگ پکا کالا تھا۔ہم

بغداد کی ایک گلی سے گذرے جہاں کچھ بچے کھیل رہے تھے ہمیں دیکھتے ہی وہ سب شور مچانے لگے ''العابد، العابدؔ'' میرے ساتھی کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور لگتا تھا کہ اس کے اعصاب کھچ گئے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لیکن جب ہم گلی سے باہر نکل آئے اور شور کرتے ہوئے آوازیں لگاتے ہوئے بچے پیچھے رہ گئے تو اس نے بڑے غصہ سے کہا کہ جی چاہتا ہے میں ان سب کو کچا چبا جاؤں۔ میں نے پوچھا بات کیا ہے۔ اس نے تعجب سے جواب دیا کہ تمھیں نہیں معلوم۔ یہ مجھے عابد۔ عابد کہہ کر چلا رہے تھے جس کا مطلب ہے غلام۔ میں نے کہا دیکھو خدا کے بھیجے ہوئے سب نبی اسی مقام پر آئے اور سب نے بڑی مشکلیں برداشت کر کے یہی سبق دیا کہ کالے کو گورے پر اور عرب کو عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ساری دنیا نے اس پیغام کو سنا اور بہت سوں نے عمل بھی کیا لیکن جن لوگوں پر یہ پیغام اترا تھا۔ آج چودہ صدیاں گذر جانے کے باوجود بھی اسی رنگ و نسل کی عصبیت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بہر حال ہم پہلے مدائن گئے اور بعد میں سامرہ گئے۔ حلہ کربلا سے تقریباً ۴۰ کلومیٹر ہے اور اسی کے قریب شہر بابل کے کھنڈرات ہیں لیکن میں کھنڈرات دیکھ دیکھ کر تنگ آچکا تھا اور مزید کھنڈرات میں بھٹکنے کا میرا حوصلہ نہیں تھا۔ البتہ سامرہ میں ایک زیارت گاہ پر ایک مجاور بہت ہی پر تشدد انداز سے لوگوں سے نذرانے اینٹھ رہا تھا۔ وہ لوگوں کے ہاتھ اور کندھے پکڑ کر کھینچتا اور کہتا کہ زیارت پڑھو۔ میرے ساتھی نے کہا کہ اسے ایک پیسہ نہ دینا۔ ایسے لوگوں کا دین مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یہ تو صرف سیدھے سادھے لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ اس پر میرے ساتھی اور اس مجاور میں جھگڑا بھی ہوا اور دونوں عربی میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے رہے۔ مجھے بھی یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ کیسے کیسے لوگوں نے ایمان کو تجارت بنالیا ہے۔ اس کے بعد عراق کے اہم ترین تاریخی ثقافتی اور دینی مقامات سے فارغ ہو کر ہم دریائے دجلہ کے کنارے ایک ریسٹورنٹ میں گئے جو ایک کشتی میں بنایا گیا تھا کچھ شربت وغیرہ پیے تو یوں ہمارا دورۂ عراق مکمل ہوا۔

یہاں سے میری اگلی منزل ایران تھی۔ چنانچہ بغداد سے بس لے کر میں قصرِ شیریں

کے لیے روانہ ہوا جو ایک سرحدی شہر ہے قصرِ شیریں میں ایک بہت پرانی سی شکستہ عمارت کے آثار ہیں جن کا اب ایک بہت بڑا سا محرابی شکل کا دالان ہی باقی رہ گیا ہے اسے طاق کسریٰ کہتے ہیں اور اس کے بعد میں ایران میں داخل ہوگیا۔

ایران پہنچنے پر خیال تھا کہ وہاں ایک پاکستانی کا استقبال بڑی محبت اور گرم جوشی سے ہوگا۔ ترکی کا تجربہ پہلے ہی ہمارے سامنے تھا۔ ترکی میں جس کو بھی پتہ لگتا کہ میں پاکستانی ہوں تو وہ ایسے ملتا تھا جیسے کوئی بچھڑا ہوا دوست مل گیا ہو۔ تحریکِ خلافت میں اور اس کے بعد اتاترک کی محبت میں ہندوستانی مسلمان شاید ترکوں سے بھی آگے تھے اور یہ بات ترک نہیں بھولے ہیں۔ عراق میں ویسے ہی عربوں سے کچھ زیادہ توقعات نہیں تھیں لیکن ایران تو ہمار اہمسایہ برادر ملک ہے۔ ہماری ساری کی ساری تہذیب ہی ایرانی ہے۔ فارسی ہماری رگوں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ حافظ، عمر خیام، فردوسی اور سب سے زیادہ شیخ سعدی کو ہم اپنے ہی دانشوروں میں شمار کرتے ہیں۔ اس لیے سرحد پر ایرانیوں کی سردمہری دیکھ کر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ شاہِ ایران کا لاہور کا دورہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ لوگ اس طرح مال روڈ پر ڈھلے ہوئے تھے جیسے ان ہی کے بادشاہ کا جلوس گذرنے والا ہو۔ لیکن فوراً ہی سوچا کہ ہماری توقعات اور ہمارے جذبات بجا لیکن قومی سطح پر ہم نے ایران سے کیا کیا ہم تو ہمیشہ سے ان کے دشمنوں کے دوست رہے ہیں۔ بہر حال ایران میں استقبال کچھ خاطر خواہ نہیں ہوا۔ یہ نہیں کہ کسی نے بری نظروں سے دیکھا ہو یا کوئی ناگوار بات کی ہو۔ بس ایک لاتعلقی سی تھی جو اچھی نہیں لگی۔

سرحدی کاروائیوں کے بعد، جو خاصی منظم اور مختصر تھیں میں ایک بس میں بیٹھ گیا جو تہران جا رہی تھی۔ کوئی بیس گھنٹے کا سفر تھا۔ سڑک بالکل سیدھی اور نیو یارک کی سڑکوں کی طرح چوڑی اور صاف ستھری تھی بس بڑی روانی اور تیزی کے ساتھ اڑتی چلی جا رہی تھی کہ سواریوں میں کچھ کھلبلی سی مچی۔ معلوم ہوا کہ ڈرائیور سویا ہوا تھا اور سوتے سوتے ہی گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے جنجھوڑ کر اٹھایا گیا جو اسے اچھا نہیں لگا۔ لیکن کچھ دیر بعد وہ دوبارہ سو گیا اور اسی طرح

رات سے صبح ہوگئی۔ راستہ میں شاید کوئی زیادہ آبادیاں نہیں تھیں یا شاید رات کی وجہ سے کچھ زیادہ نظر نہیں آیا۔ البتہ صبح کو دیکھا کہ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں۔ دیہاتی عورتوں نے بھی سکرٹ پہنے ہوئے تھے اور اوپر چادریں لی ہوئی تھیں لگتا تھا کہ مغربیت زبردستی ان پر مسلط کی جا رہی تھی۔ نیویارک میں کچھ ایرانیوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی جس میں پتہ لگا تھا کہ شاہ کی حکومت میں کتنی سختی تھی اور کس طرح ریاستی ادارے ایک ایک پر نظر رکھے ہوئے تھے او رمعمولی جرائم بلکہ کوتاہیوں کی کتنی سخت سزائیں دی جاتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ خمینی کے انقلاب کے بعد حجاب پر اتنا زور کیوں دیا گیا۔ غریب عوام کے لیے شاید فوری طور پر نئے کپڑے بنوانا ممکن نہیں تھا اس لیے لباس تبدیل نہیں کیا گیا بلکہ اوپر حجاب کی پابندی لگا دی تاکہ ستر پوشی ہو جائے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جیسے انقلاب سے پہلے بہت سی خواتین سکرٹ سے خوش نہیں تھیں۔ اسی طرح انقلاب کے بعد کچھ حجاب سے خوش نہیں ہیں۔ دونوں ہی زبردستی مسلط کیے گئے تھے۔

تہران کے پاکستانی سفارت خانہ کے ایک افسر میرے ہم جماعت اور دوست تھے۔ میں نے انھیں پہلے ہی اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی اور وہ میرے منتظر تھے۔ چنانچہ میں نے چند روز تہران میں ان کے ہاں ہی قیام کیا۔ تہران بالکل لاہور جیسا لگا۔ وہی بدنظمی وہی افراتفری۔ وہی بھاگ دوڑ ٹریفک نہایت بے ہنگم، چہروں پر ایک عجیب سی بے چینی کا تاثر اور بالکل لاہور کی ہی طرح اعلیٰ طبقہ کی مغرب زدہ خواتین۔ ایسا لگا کہ اپنے گھر آ گئے ہیں۔ البتہ یہاں بھی میرے ساتھ وہی ہوا جو استنبول میں ہوا تھا۔ وہاں بھی ایک دوست مل گئے تھے اور یہاں بھی نتیجہ یہ ہوا کہ نہ استنبول دیکھا نہ تہران نہ ترکوں سے زیادہ ملنے جلنے کا موقع ملا نہ ایرانیوں سے جہاں دوست لے گئے چلے گئے۔ گویا یہ دونوں سفر ایسے لگے جیسے سب کچھ T.V. پر دیکھا ہو۔ کوئی تین چار روز بعد ہمارے دوست نے تہران سے مشہد تک کی بس میں ہمیں سوار کرا دیا۔ یہاں بھی بس اڈے پر بادامی باغ کے اڈے کا منظر تھا۔

اس بس کو تہران سے مشہد تک دشتِ لوط کا ایک طویل سفر طے کرنا تھا۔ بس اچھی تھی۔ اس کے پچھلے حصہ میں ایک چھوٹی بار بھی تھی جہاں کھانے پینے کی چیزیں مل جاتی تھیں۔ یہ سفر تقریباً ۲۴ گھنٹے کا تھا۔ لق و دق صحرا بے آب و گیاہ۔ سڑک بھی برائے نام تھی۔ یہ ایک چوڑا سا کچا راستہ تھا جس پر بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ گاڑی ان ہی پتھروں پر چل رہی تھی۔ گرمی بلا کی تھی۔ کہیں کوئی سایہ نظر نہیں آتا تھا۔ کافی دور دور چھوٹی چھوٹی آبادیاں آتی تھیں جہاں سے کچھ لوگ بس میں اترتے چڑھتے۔ عورتوں نے چادریں لپیٹی ہوئی تھیں۔ شہر اور دیہات کا فرق واضح نظر آتا تھا۔ البتہ چادروں کے نیچے سکرٹ نظر آتی تھیں۔ انقلاب ایران کے آنے میں ابھی کوئی پانچ برس تھے۔ یہ شاہی زمانہ تھا۔ شہنشاہیت ترقی کے خلاف تھی۔ صرف چند ایک شہر۔ بلکہ صرف تہران ہی کسی حد تک ایک جدید شہر نظر آتا تھا اس پسماندگی کو قائم رکھنے میں وہاں کے دینی علما کا بھی بہت حصہ تھا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ایک قصہ ''سخندان فارس'' میں بیان کیا ہے۔ کافی عرصہ پہلے ناصر الدین، شاہِ ایران یورپ کے دورے پر گئے۔ وہاں صدر اعظم کے مشورہ پر انھوں نے رائٹر (Reuter) کمپنی سے ریلوے لائن بچھانے کا ایک معاہدہ کیا۔ جب یہ خبر ایران پہنچی تو علماء نے صدرِ اعظم کو جو کہ وزیر تھے کافر قرار دے دیا۔ بادشاہ کو یہ خبر پہنچی تو اس نے صدرِ اعظم کو بندرگاہ پر ہی چھوڑا اور خود تہران پہنچ کر اعلان کیا کہ اس نے صدرِ اعظم کو اس کے عہدے سے سبک دوش کر دیا ہے۔ ساتھ بادشاہ نے علماء کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اس نے انھیں بتایا کہ ایران میں ریل کے آنے سے بہت فائدے ہوں گے۔ وہ لوگ حج اور زیارات وغیرہ کے لیے آسانی سے اور آرام دہ سفر کر سکیں گے۔ علماء نے جواب دیا کہ دوسرے مذہب کے مرد اور عورتیں یہاں کام کرنے آئیں گے۔ ان کے طور طریقے ہم سے قطعی مختلف ہیں۔ گدھے، خچر اور اونٹ ہمارے آباؤ اجداد کا بوجھ اٹھاتے رہے ہیں۔ ہمارے لیے وہی کافی ہیں۔ بادشاہ نے اسی میں عافیت سمجھی کہ معاہدہ کے توڑنے کی خفت اٹھا لے اس میں علماء کو

کچھ کہنے کی جرأت نہیں تھی۔

بہر حال آج کے ایران اور آج کے ایرانی علماء اب بالکل بدل چکے ہیں۔ یہ قصہ بعد میں آئے گا۔ لیکن اس زمانے میں جو پسماندگی تھی وہ انقلابِ ایران تک قائم رہی۔ شاہی ایران کے آخری دور کا احوال قرۃ العین حیدر نے اپنی خودنوشت خاندانی سوانح ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں تحریر کیا ہے۔ قرۃ العین نے شاہ ایران اور شاہ 'بانو' ملکہ ''فرح لیلوی'' کے ساتھ ۱۹۷۰ء میں ایک ہیلی کوپٹر میں خراسان کا دورہ کیا۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ان لق و دق صحراؤں اور سنگلاخ چٹانوں کے درمیان آج بھی کاروان اسی طرح گذرتے نظر آتے ہیں جیسے کبھی گذرا کرتے تھے۔ اب یہاں نئے نئے شہر وجود میں آ گئے جن میں جدید ترین سہولتیں مہیا ہیں لیکن شہر، طوس، اور نیشاپور میں آج بھی سبز قبائیں اوڑھے اور سبز عمامے پہنے علماء اور خورد و بزرگ طالب علم چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح خانمائیں چادریں لپیٹے پھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لگتا ہے کہ بیسویں اور بارھویں صدی کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ ایک درے سے خچروں کی ایک قطار گذرتی ہوئی نظر آتی ہے جن پر سوار لوگ شلواریں پہنے ہوئے ہیں اور ان کے سروں پر پگڑیاں ہیں''۔ لیکن آج انقلاب ایران کے بعد یہ تصویر بالکل بدل گئی ہے۔

غرض کوئی چوبیس گھنٹے کا دشوار ترین سفر طے کر کے مشہد پہنچے۔ گو کہ یہ سفر بس کا تھا لیکن مجھے ایسے ہی لگا جیسے میرے آباؤ اجداد کو اونٹوں کے کجاووں پر سفر کرتے ہوئے محسوس ہوا ہوگا۔ ہمارے مورث اعلیٰ بھی کوئی ایک ہزار برس قبل اسی طرح نیشاپور سے دلی آئے ہوں گے۔

تہران اور مشہد بس ایسے ہی ہیں جیسے صحرا میں ایک دوسرے سے بہت دور دو نخلستان ہوں۔ مشہد ایک چھوٹا سا شہر ہے اور امام رضاؑ کے روضے کے گرد آباد ہے۔ یہاں کے بازاروں کا منظر بہت مانوس لگا۔ بالکل جیسے لاہور کے بازار البتہ مجھے بازاروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور یہاں میں نے کسی طرح کی کوئی خریداری نہیں کی۔ دو تین روز وہاں قیام کرنے

کے بعد میں نے پھر افغانستان کا رخ کیا اور ایران سے نکل کر اسلام قلعہ پہنچا جو افغانستان کا سرحدی شہر ہے۔

اسلام قلع پہنچ کر پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اب اپنا علاقہ آ گیا ہے وہی بدنظمی وہی بدتمیزی اور بداخلاقی۔ لگتا ہے پاکستان میں آ گئے ہیں۔ ترکی تو خیر یورپ میں تھا اور شام میں انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے کچھ دقت ہوئی عراق اور ایران میں بھی کم از کم سرحدوں پر کسی بد مزگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن یہاں اسلام قلعے میں حالات مختلف تھے۔ ایک کوٹھری نما جگہ میں افغانستان کا سرکاری دفتر تھا اور اس میں صرف ایک چپڑاسی نما شخص بیٹھا تھا۔ نہ اس کا لباس ڈھنگ کا تھا نہ طور طریقے۔ اُس نے سب کے پاسپورٹ جمع کر لیے اور پھر کہیں غائب ہو گیا۔ کوئی چار گھنٹے بعد دوبارہ اس کی شکل نظر آئی۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے دوڑے۔ اس نے ایک طرف کو لے جا کر چند لوگوں سے کچھ بات کی اور اسی طرح وہ مختلف ٹکڑیوں سے علیحدہ علیحدہ ملتا رہا۔ خصوصاً کچھ یورپی ہپی اس کی توجہ کا مرکز تھے اور میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس سے ہیروین وغیرہ خرید رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو نسوار سونگھ کر زور زور سے چھینکیں لے رہا تھا۔ اسی طرح تقریباً چار گھنٹے اور گذر گئے۔ آخر اس نے ہمارے اجازے یا ویزے ہمیں دیے اور صبح سے انتظار کرتے کرتے ہم سہ پہر کو اسلام قلعہ سے کابل کے لیے بس میں روانہ ہوئے۔

سڑک بہت کشادہ اور اچھی بنی ہوئی تھی۔ بالکل قصر شیریں سے تہران تک جانے والی سڑک کی طرح۔ پتہ چلا کہ غالباً یہ افغانستان کی واحد سڑک ہے اور اسے روسیوں نے تعمیر کیا ہے۔ لیکن یہ بہت تاریخی سڑک ہے سب سے پہلے ہرات کا شہر آیا۔ میں نے یہاں کچھ دن ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ بزرگوں سے سنا تھا اور اپنے شجرۂ نسب میں پڑھا تھا کہ ہمارے بزرگ نیشاپور سے آ کر پہلے ہرات میں قیام پذیر ہوئے۔ ہرات پرانے طرز کا ایک شہر ہے۔ بالکل ہندوستان کے پرانے شہروں کی طرح اس شہر کی فضا سے مجھے اپنائیت کی بو آتی تھی۔ ماحول پُرسکون تھا اور کسی طرح کی دوڑ دھوپ اور ہنگامہ آرائی نظر نہیں آئی میں نے سوچا

کہ شاید انھی گلیوں اور بازاروں میں ہمارے بزرگ بھی چلتے پھرتے ہوں گے اور ہزار برس پہلے بھی یہ شہر شاید ایسا ہی ہوگا لیکن مجھے یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا کہ یہاں ہمارا خاندان کس جگہ رہتا تھا۔

تیسرے روز ہرات سے روانگی ہوئی۔ دنیا کی قدیم ترین گذرگاہوں میں سے ایک تاریخی گذرگاہ سے ہماری بس گذری۔ راستے میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں بھی نظر آئیں جہاں گھر کچے تھے یا کہیں کہیں چٹانوں کی کھوہ میں کچھ جھونپڑے سے بنے ہوئے تھے۔ بدھ مت والوں کے کچھ ٹوپے بھی نظر آئے۔ بس قندھار سے گذری جو خاصی بڑی آبادی لگتی تھی۔ یہاں سے ایک راستہ چمن کو جاتا تھا اور دوسرا کابل کو۔ مگر قندھار کے انار تو دکھائی دیے ان کے باغ کہیں نظر نہیں آئے۔ یہ سڑک غزنی سے بھی گذری۔ غزنی جہاں عظیم مغلیہ سلطنت کا بانی بابر کی آخری آرام گاہ ہے۔ اس طرح ہم یوں سمجھئے کہ قرونِ وسطیٰ سے گذر کر کابل پہنچے۔

کابل ایک چھوٹا سا اور کسی حد تک جدید شہر ہے۔ یہاں ایک یونیورسٹی بھی ہے۔ کچھ لڑکیاں سکرٹ پہنے ہوئے بھی نظر آئیں۔ برقعہ پوش خواتین بھی دکھائی دیں۔ یہ مشرق اور مغرب کا ایک عجیب سا انوکھا سا سنگم تھا۔ کابل کے بازار بیرونی ساخت کی اشیاء سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے بھی وہاں سے گھر کے لیے ایک پریشر کوکر اور ایک اچھا سا ٹی سیٹ لیا۔ اب تقریباً گھر قریب تھا اس لیے پیسے خرچ کرنے میں کوئی جھجک نہیں تھی۔

اس زمانے میں جشنِ کابل لگا ہوا تھا۔ ہندوستان سے بڑی تعداد میں فن کار اور ایکٹر اور ایکٹریسیں آئے ہوئے تھے۔ ان میں دلیپ کمار بھی تھا۔ میں نے نمائش میں اسے ایک ہجوم کے درمیان جاتے ہوئے دیکھا۔ البتہ نمائش ایسی ہی تھی جیسے ہمارے ہاں دیسی میلے ہوتے ہیں۔

کابل سے روانگی کے وقت ایک سخت سنگین صورتِ حال پیدا ہوگئی بسوں اور جہازوں میں کہیں کوئی سیٹ نہیں تھی۔ لوگ جشن کابل سے لوٹ رہے تھے اور بڑی افراتفری کا عالم تھا۔ آریانہ (افغانستان کی) ہوائی کمپنی اور پی آئی اے میں کئی ہفتوں تک کی سیٹیں بک

ہو چکی تھیں۔ میں پی آئی اے کے دفتر میں قومی ایرلائن کے مقامی منیجر سے ملا۔ میں نے اسے بتایا کہ پہلی ستمبر کو یونیورسٹی میں میری حاضری ضروری ہے ورنہ ایک دن بھی لیٹ ہونے کی صورت میں یونیورسٹی کے دفتر والے مجھے بہت تنگ کریں گے۔ ہوسکتا ہے جب تک ایک دو روز کی غیر حاضری کا مسئلہ طے نہ ہوگا۔ جس میں مہینے لگ سکتے تھے۔ مجھے تنخواہ نہیں ملے گی جس کی مجھے وہاں پہنچتے ہی فوری ضرورت ہونی تھی۔ منیجر صاحب نے میری پروفیسری کی شرم رکھ لی اور مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کی وین سے دوسرے مسافروں کے ساتھ ہوائی اڈے چلا جاؤں اور وہاں جہاز کے کپتان سے درخواست کروں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ کپتان صاحب بھی بہت مہربان ثابت ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ ابھی پریشر ٹمپریچر وغیرہ چیک کر کے کچھ بتائیں گے کہ کوئی زائد سواری لے جائی جاسکتی ہے کہ نہیں کچھ دیر بعد انھوں نے مجھے ٹکٹ خریدنے کو کہا جو میں کاؤنٹر سے لے آیا۔ اب ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے میرے ہر کام میں بڑی مشکل ہوتی ہے اور اکثر کام بالکل آخری لمحے میں ہوتے ہیں اور چلتے چلتے بھی کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے یہاں بھی ایسا ہی ہوا اور اب مجھے اندازہ ہوا کہ اسلام قلعہ کا افغانی اہل کار شاید پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک کاغذ پر مجھ سے دستخط کرائے اور دوسرا مجھے دے دیا۔ یہاں کابل کے ہوائی اڈے پر جب جہاز چلنے ہی والا تھا۔ امیگریشن افسر نے مجھے بتایا کہ میرے کاغذات ٹھیک نہیں ہیں میرے پاس افغانستان میں داخل ہونے کا پروانہ تھا۔ وہاں سے جانے کا نہیں۔ ان افسر صاحب نے فرمایا کہ مجھے پھر اسلام قلعہ جا کر وہ کاغذ لانا پڑے گا جو غلطی سے اس اہل کار نے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور مجھے وہ کاغذ دے دیا جو اسے اپنے پاس رکھنا چاہیے تھا۔ میرے تو چھکے چھوٹ گئے اور شاید اب میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے اور نہ ہی اتنا وقت تھا کہ میں دوبارہ اسلام قلعہ سے کاغذات لے کر آتا۔ کپتان نے میری پریشانی کو بھانپ لیا اور امیگریشن افسر کو کہا کہ میرا یہی کاغذ وصول کرلے۔ میری جان میں جان آئی اور میں پشاور کے لیے جہاز میں سوار ہوگیا جو جلال آباد سے ہوتا ہوا کوئی دو گھنٹے میں پشاور کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔

(۹)

وطن واپسی

پشاور کے ہوائی اڈے پر جیسے ہی میں نے جہاز سے باہر قدم رکھا فوراً ہی واپس جہاز کے اندر چلا گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں گرم ہوا کی ایک لوہے کی چادر سے ٹکرا گیا ہوں۔ کابل میں ایران کے مقابلے میں گرمی تھی اور میرا خیال تھا کہ پاکستان کا موسم بھی ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اپنے ملک کی گرمی کو تو میں بالکل بھول ہی چکا تھا۔

ہوائی اڈے پر کچھ دیر نہیں لگی۔ کسٹم افسر نے صرف اتنا پوچھا کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں اور میں نے جواب دیا کہ پڑھائی مکمل کر کے لوٹ رہا ہوں۔ اس کے بعد نہ اس نے اور نہ کسی اور افسر نے کچھ پوچھا اور میں چند منٹ میں ہی ایئر پورٹ سے باہر نکل آیا۔ سرحدیں عبور کرتے ہوئے اکثر اسی طرح مجھے بغیر کسی پوچھ گچھ کے چھوڑ دیا گیا۔ صرف لندن سے امریکہ جاتے ہوئے میری جامہ تلاشی ہوئی جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یا نیو یارک میں JFK جے ایف کے ایئر پورٹ پر میرا سوٹ کیس کھلوایا گیا۔ لیکن وہاں کے اہل کار نے اس پر صرف سرسری نظر ڈال کر مجھے فارغ کر دیا۔ مجھے اپنے پورے یورپ اور امریکہ کے سفر میں کہیں بھی پاکستانی ہونے کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ البتہ ایک دو متعصب لوگ ضرور ملے۔ ورنہ اکثر لوگ خندہ پیشانی سے ہی پیش آئے۔

پشاور ائرپورٹ سے میں سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ایک ریل حرکت میں تھی۔ میں اسی میں سوار ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ صرف گجرات تک جا رہی تھی۔ میں گجرات میں ریل سے اتر گیا۔ جلد ہی لاہور والی ٹرین آ گئی اس پر رش بہت تھا۔ میں ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں سوار ہو گیا۔ یہ تقریباً خالی ہی تھی۔ س طرح ۳۱ اگست کی شام میں لاہور پہنچ گیا اگلے روز مجھے

یونیورسٹی میں حاضری دینی تھی۔

گھر پہنچا تو دیکھا کہ میرے والدین پہلے ہی مجھے لینے کے لیے طورخم پہنچ گئے تھے۔ طورخم کسٹم میں میرے والد کے ایک دوست متعین تھے۔ وہ ان کے پاس ٹھہر گئے اور تین روز میرا انتظار کرنے کے بعد واپس آ گئے انھیں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ میں ہوائی جہاز سے واپس آ گیا ہوں۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
ہم پی کے کیا چلے کہ زمانہ بدل گیا

گھر کے حالات بدستور ویسے تھے۔ شاید میری غیر حاضری کی وجہ سے مالی حالات اور بھی خراب ہو گئے تھے۔ میرے دو چھوٹے بھائیوں نے کوئی چھوٹی موٹی نوکریاں کر لی تھیں۔ میرے گھر پہنچنے کے تقریباً تین روز بعد والدین بھی طورخم کی سیر کر کے واپس آ گئے۔ وہاں انگلستان میں میرے پاس کوئی چار پانچ سو پاؤنڈ بچ گئے تھے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ایک کار لے چلوں جو اس زمانے میں اتنے پیسوں میں آ جاتی تھی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کار کی ضرورت تو کوئی ہے نہیں۔ گھر سے یونیورسٹی تک کا پیدل کا راستہ ہے اور باقی کہیں اور آنا جانا ہوتا نہیں ہے۔ چنانچہ وہ پاؤنڈ میں نے پاکستان منتقل کرا لیے۔ لیکن پیسہ۔ بقول میرے دوستوں کے۔ مجھے کیلوں کی طرح چبھتا تھا ویسے بھی نہ میں نے کبھی پیسے کی قدر کی نہ پیسے نے میری قدر کی۔ لیکن یہ تجربہ تو بہت ہی تلخ ثابت ہوا۔ آٹھ ہزار روپے میرے بنک میں جمع تھے۔ جو اس وقت کے لحاظ سے جب کل تنخواہ۔ ٹرائی پاس کی ترقیاں ملا کر۔ /۴۵۰ روپے ماہانہ تھی۔ کافی بڑی رقم تھی۔ جب بھی مجھے دس بیس یا سو پچاس روپے کی ضرورت پڑتی میں کسی سے ادھار لے لیتا۔ ایک روز یوں ہی بیٹھے بیٹھے مجھے اپنے اوپر بہت غصہ آیا کہ میرے پاس پیسے ہیں اور پھر بھی میں دوسروں سے قرض مانگ مانگ کر ذلیل ہوتا ہوں۔ بس اس کے بعد میں نے فراغ دلی سے پیسے خرچ کرنے شروع کر دیے۔ پیڈسٹل پنکھے لیے۔ بہت اعلیٰ قسم کی

رائٹنگ ٹیبل اور آفس چیئر لی۔ بہت ہی نفیس بک شیلف لیا، اعلیٰ قسم کے دو بیڈ لیے۔ صحن میں رکھنے کے لیے کرسیاں لیں اور کمروں کے لیے قالین خریدے۔ ڈرائنگ روم کے لیے صوفے بنوائے اور چھ کرسیوں والی ایک ڈائننگ ٹیبل لی۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت روپے کی کتنی ضرورت تھی اور ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ سب چیزیں جو میں نے خریدی تھیں فالتو تھیں۔ محض دکھاوا تھیں۔ ورنہ گھر ان کے بغیر بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ کچھ پلنگ تھے ایک تخت تھا جن پر صاف ستھری چادریں بچھائی جاتی تھیں۔ صحن میں بھی شام کو چارپایاں بچھتی تھیں۔ رات کو چھت پر فرش بچھا کر سوتے اور تازہ ہوا کے مزے لیتے۔ آج بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرے گھر میں دو چیزیں قطعی فالتو اور بے مصرف ہیں۔ ایک ڈرائنگ روم اور دوسرے گاڑی۔ دونوں بہت ہی کم استعمال ہوتے ہیں۔

اور چیزوں کے علاوہ انسان کی تفریحی ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ کیمبرج میں سکواش کھیلتا تھا۔ چنانچہ دو سکواش ریکٹ ساتھ لے آیا۔ ایک گرنڈک کا چار ٹریک کا ٹیپ ریکارڈر۔ ابھی کیسٹس کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ دو لانگ پلے ریکارڈ کیمبرج سے خریدے۔ ایک پاکستانی کلاسیکی موسیقی کا ریکارڈ اور دوسرا لتا کے فلمی گانوں کا ریکارڈ۔ چنانچہ واپس آ کر ان کے لیے ایک خوبصورت ساڈیک بھی خریدا جس میں ریکارڈ پلیر بھی تھا اور وہ میز کا کام بھی دیتا تھا۔

یوں میں چند مہینوں میں پیسوں کی قید سے آزاد ہو گیا۔ لیکن اس طرح میں لوئر گلاس سے لوئر مڈل کلاس میں داخل ہو گیا۔ اس تمام اہتمام کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کے لیے سہولتیں تو بڑھیں لیکن اپنے حالات ذرا تنگ ہو گئے۔ اب مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ کافی تھی لیکن ان کو بٹھانے کے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ یوں سمجھیے کہ ہم نے بھی ترقی کی۔ اس کو کچھ اور تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن وہ جو قناعت کے مزے تھے ان کی جگہ اب تکلف اور تصنع نے لے لی تھی۔ شاید اسی کو ترقیٔ معکوس کہتے ہیں۔ شاید آپ کہیں کہ مجھ میں آگے بڑھنے کی خواہش ہی نہیں ہے۔

باہر کی دنیا میں بھی بہت تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ مگر یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں

کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور لگتا کہ جیسے میں کہیں گیا ہی نہیں تھا اور کہیں کچھ بدلا ہی نہیں تھا۔ وہی دفتر، وہی اساتذہ، وہی چیئرمین اور وہی ایک علمی اور ادبی لاپروائی کا عالم۔ کیمبرج میں اتنا عرصہ گذارنے کے بعد یہ لگتا تھا کہ سب یونیورسٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ فرق تو واپس آ کر محسوس ہوا۔ بالکل اسی طرح جیسے لگتا تھا کہ لندن کی سڑکیں اور گلیاں لاہور کی سڑکوں اور گلیوں کی طرح ہی ہیں۔ لیکن واپس آ کر ایک دھچکا سا لگا۔ اتنا فرق!

یونیورسٹی کی سطح پر زبردست تبدیلیاں نظر آئیں۔ حمید احمد خان اب وائس چانسلر نہیں تھے۔ وہ گئے تو یونیورسٹی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ جب میں ۱۹۶۷ء میں کیمبرج گیا تھا تو پنجاب یونیورسٹی میں یوم غالب، یوم اقبال اور یونیورسٹی کے جشن صد سالہ کی تقریبات کی تیاریاں زوروں پر تھی۔ یہ بالترتیب، ۱۹۶۸ء اور ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۹ء میں منعقد ہوئے تھے۔ اس سلسلہ میں حمید احمد خاں صاحب کی تحریک اور ذاتی دلچسپی سے کئی نئے شعبے بھی قائم کیے گئے مثلاً شعبۂ تاریخ ادب مسلمانان پاک و ہند، شعبۂ تالیف و ترجمہ، وغیرہ۔ امیر خسرو پر کچھ تحقیقی کام ہوا تھا۔ دیوان غالب نئے سرے سے مرتب ہو کر چھپ چکا تھا۔ اقبال پر زور و شور سے کام جاری تھا۔ واپسی پر مجھے اندازہ ہوا کہ اس سارے پروگرام میں اب وہ سرگرمی نہیں رہی ہے۔ یونیورسٹی کے مختلف شعبے یا بند ہونے لگے ہیں یا بے توجہی کا شکار ہو گئے ہیں۔

حمید احمد خاں صاحب اب مجلس اردو میں چلے گئے تھے۔ میں وہاں ان سے ملنے گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ خاص طور سے مجھے کیمبرج بھیجنے میں چوں کہ ان کی کوشش بھی شامل تھی اس لیے انھیں اور بھی خوشی ہوئی انھوں نے کہا کہ میں نے جو یہ ڈگری لی ہے اس سے بہتر کوئی ڈگری نہیں ہو سکتی اور یہ میرے بہت کام آئے گی۔ پھر انھوں نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے ایک حکم پاس کیا تھا کہ جو اساتذہ باہر سے پی ایچ ڈی کر کے آئیں انھیں چھ انکریمنٹ دی جائیں لیکن جو آکسفورڈ یا کیمبرج سے آنرز یا ٹرائی پاس کر کے آئیں انھیں زیادہ ترقیاں دی جا سکتی ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کا علم ہے لیکن دفتر والے اس سے لاعلمی کا

اظہار کر رہے ہیں۔خاں صاحب کتنے سادہ لوح انسان تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے زمانے میں ایک بہت ہی بدنام زمانہ ڈپٹی رجسٹرار تھے۔وہ زبردست سازشی مشہور تھے اور ان کی پہلی کوشش یہ ہوتی تھی کہ دوسروں کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچائیں میرے ساتھ بھی وہ ایک ہاتھ کر چکے تھے۔ملتان کے وائس چانسلر جو میرے اچھے دوست تھے۔انھوں نے مجھ سے ایک روز کہا کہ میں ان کے ہاں بطور پروفیسر آ جاؤں چنانچہ میں نے درخواست بھیج دی۔کئی مہینے گذرنے کے بعد وہ ایک ایرپورٹ پر ہمارے ایک مشترک دوست سے ملے اور میری شکایت کی میں نے ان کی پیش کش پر غور نہیں کیا کچھ روز بعد بورڈ آف سٹڈیز کی میٹنگز کے لیے میں ملتان گیا تو وائس چانسلر صاحب کو بتایا کہ میں تو کافی عرصے پہلے درخواست بھیج چکا ہوں۔صاحب موصوف اب وہاں رجسٹرار تھے۔ان کو بلوایا گیا اور پوچھا گیا کہ میری فائل کیوں پیش نہیں کی گئی تو حضرت موصوف نے فرمایا کہ یہ کوالیفائی نہیں کرتے۔وائس چانسلر صاحب نے کہا کہ یہ طے کرنا آپ کا کام نہیں آپ کو درخواست مجھے دینی چاہیے تھی۔جائیے اب وہ درخواست لے آئیے۔اس رجسٹرار صاحب نے کہا جو کلرک اس کیس سے متعلق تھا وہ کرپٹ تھا اور ہم نے اسے نوکری سے نکال دیا ہے۔جاتے ہوئے وہ سب کاغذات بھی اپنے ساتھ لے گیا۔خود حمید خان صاحب نے جب یہ صاحب پنجاب یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار تھے ان کے دفتر پر چھاپا مارا تھا اور بہت سے لوگوں کے سامنے کئی اہم دستاویزات وہاں سے برآمد کی تھیں۔لیکن یہ حضرت اتنے تیز تھے کہ بہت جلد ہی خان صاحب کے منظورِ نظر بن گئے۔خان صاحب نے مجھ سے کہا کہ یونیورسٹی میں بس یہی ایک مخلص اور ایمان دار شخص ہے اس سے ملیے۔البتہ ان صاحب نے حمید احمد خان صاحب کے اعتماد کی عزت رکھ لی اور مجھے وہ کاغذ دے دیا۔گو کہ اس کا مجھے فائدہ کچھ نہیں ہوا اس لیے کہ سنڈیکیٹ نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔بلکہ کچھ لوگوں نے تو اس خیال کا اظہار کیا کہ کیمرج اور آکسفورڈ کی ڈگریاں ہمارے بی اے کے برابر ہیں جب یہ رجسٹرار صاحب ریٹائر ہوئے تو

میں نے دیکھا کہ چپڑاسی تک ان کو سلام نہیں کرتے تھے۔

بہر حال خان صاحب کو یہ خوشی تھی کہ ان کی کوششیں بارآور ہوئیں۔اس سے پہلے انھیں دو دھچکے لگ چکے تھے کہ جس استاد کو وہ بہت ہی لائق اور ہونہار سمجھتے تھے اس کو انھوں نے دو مرتبہ انگلستان میں پی۔ایچ۔ڈی کا داخلہ دلوایا وہ دونوں مرتبہ پڑھائی چھوڑ کر واپس آ گیا۔اب انھیں اپنے غلط اندازے کا احساس ہو چکا تھا۔

ادھر یہ ہوا کہ ہمارے چیئرمین ہم سے سخت ناراض تھے اور کچھ کھچے کھچے سے رہتے تھے۔ایک دو مرتبہ کسی بے وجہ بات پر وہ مجھ سے خفا بھی ہوئے۔میں کیمرج سے اپنے کرایہ پر واپس آیا تھا۔یونیورسٹی کے وظیفہ کی شرائط کے مطابق مجھے واپسی کا کرایہ بھی ملنا تھا جو اس وقت ۱۸۰۰ روپے بنتا تھا۔۴۵۰/- روپے ماہانہ پانے والے کے لیے یہ خاصی رقم تھی۔میں نے درخواست دی۔چیرمین کے ذریعہ دفتر بھی بھجوائی لیکن کئی سال گذر گئے اور کوئی جواب نہیں آیا۔میں نے چیرمین صاحب سے گذارش کی کہ وہ کچھ کریں۔انھوں نے کہا کہ رجسٹرار میری مخالفت کرتا ہے۔میں نے کہا کہ میری تو اس سے ملاقات تک نہیں۔وہ میری مخالفت کیسے کرے گا۔لیکن ایک روز میں کسی کام سے دفتر گیا تو اتفاق سے میری فائل وہاں پڑی ہوئی تھی میں نے ایک دو ورق الٹے تو مجھے اپنے چیرمین کا ایک لمبا سا نوٹ نظر آیا۔مجھے عجیب دھچکا سا لگا۔اس میں لکھا تھا کہ مجھے پہلے ہی کافی پیسے مل چکے ہیں اس لیے کرایہ دینے کی ضرورت نہیں اور میں اب تک رجسٹرار کو غلط سمجھتا رہا تھا۔اتنی بڑے عہدے پر اتنی چھوٹی باتیں میرے گمان سے باہر تھیں۔لیکن بعد میں تو میں نے اس سے بھی بڑے لوگوں کو اس سے بھی گھٹیا حرکتیں کرتے دیکھا۔

آخر ایک روز کلرک نے مجھے بتایا کہ چیئرمین اس لیے ناراض ہیں کہ میں نے ان کا مناسب طریقے سے شکریہ ادا نہیں کیا۔جب کہ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے ہی میرا داخلہ کرایا تھا اور بعد میں وظیفہ دلوایا تھا۔لیکن حمید احمد خان صاحب مجھے پہلے ہی سب کچھ بتا چکے تھے کہ

جب میں نے کیمبرج جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے وہاں کے ٹیوٹر کو ذاتی خط لکھا جس پر میرا داخلہ ہوگیا۔ پھر جب وظیفہ کی باری آئی تو وائس چانسلر نے ہی چیرمین صاحب سے کہا تھا کہ وہ سنڈیکیٹ میں میرا نام تجویز کر دیں جس پر وائس چانسلر نے میرا وظیفہ منظور کر لیا۔ اس کے پیچھے جیسے کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے۔ ان کے اور کیمبرج کے وائس چانسلر کے درمیان خط وکتابت کا ایک طویل سلسلہ بھی تھا۔ تاہم میں چیرمین صاحب سے ملا اور ان سے معذرت کی کہ میں ان کی مہربانیوں کا خاطر خواہ شکریہ ادا نہیں کر سکا۔

یونیورسٹی کے باہر پورے ملک کے حالات بدل چکے تھے۔ ایوب خان کا دس سالہ جشن انھیں راس نہیں آیا۔ وہ کرسیٔ صدارت چھوڑ چکے تھے اور اب یحیٰی خان کا دور تھا۔ الیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بھٹو کا طوطی بولتا تھا۔ یونیورسٹی میں طلبہ کے تبادلے کی پالیسی کے تحت بنگال سے آئے ہوئے طلباء پریشان نظر آتے تھے۔ ایک بنگالی طالب علم سے کافی طویل گفتگو ہوئی۔ اس نے کہا کہ یہ اچھا تو نہیں لگتا کہ ہم آپ سے الگ ہو جائیں لیکن اب بنگلہ دیش کو کوئی نہیں روک سکتا۔ بعد میں پھر کبھی شاید ہم دوبارہ مل سکیں اسی دوران مجھے اپنے ایک دوست سے ملنے اسلام آباد جانا پڑا۔ وہ CDA میں انجینیر تھے اور F6/1 کے ایک سرکاری کوارٹر میں رہ رہے تھے تمام کوارٹر ایک ہی جیسے بنے ہوئے تھے۔ میں غلطی سے ایک بنگالی کے کوارٹر کی طرف جانے لگا۔ ابھی میں دروازے سے دور ہی تھا کہ بنگالی عورتوں نے شور وغل مچانا شروع کر دیا۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن جلد ہی مجھے صورتِ حال کا اندازہ ہوگیا۔ ایک دوسرے کے خلاف اس قدر خدشات پیدا ہو گئے تھے کہ بنگالی اب مغربی پاکستان میں خود کو غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں سب سے بڑا دھوکا ہمیں ہمارے ذرائع ابلاغ نے دیا اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کو ایک دوسرے کے حالات کا پتہ ہی نہیں ہونے دیا۔ اکثر لوگ حالات سے بے خبر تھے یہاں تک کہ کچھ دانش ور بھی احمقوں کی جنت میں رہ رہے تھے جس کی وجہ سے حلقۂ ارباب ذوق ادبی اور سیاسی حلقوں میں تقسیم ہوگیا اور یہاں بھی ہم نے

دیکھا کہ یہ تقسیم زیادہ تر نظریاتی نہیں بلکہ گروہی تھی اور لوگ ملکی وقومی یکجہتی کے بجائے گروہی اختلافات میں الجھے ہوئے تھے۔ اسی دوران کچھ صحافیوں اور دانشوروں نے مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کے خلاف ایک قرارداد پر دستخط کیے۔ جس کی پاداش میں بہت سوں کو نوکریوں سے ہاتھ دھونے پڑے اور یونیورسٹی سے مہدی حسن کی بھی اس باغیانہ عمل پر جواب طلبی ہوئی۔

میرے لاہور آنے کے کچھ ہی روز بعد یونیورسٹی میں اکیڈیمک سٹاف ایسوسی ایشن کے انتخابات ہونے والے تھے۔ دوستوں کے اصرار پر میں نے بھی انتخابات میں حصہ لیا اور کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد کئی سال یونیورسٹی کی اکیڈیمک سٹاف ایسوسی ایشن پر ترقی پسند گروپ کا قبضہ رہا یہاں تک کہ پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس دور میں تعلیم کے میدان میں بھی بہت سی انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں اور اس سلسلے میں اکابرین حکومت سے ملاقاتیں ہوتی رہیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

مشرقی پاکستان میں ایکشن ہوتا رہا اس کے خلاف دانشورانہ حلقوں میں کچھ چھوٹے چھوٹے احتجاج بھی ہوتے رہے۔ آخر کار بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آگیا۔ اس کے بعد تو کھلے عام مظاہرے ہونے لگے۔ پھر ملک میں مارشل لا لگا۔ بھٹو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ وہ سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ یحیٰی خان نظر بند ہوئے اور پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ یونیورسٹی میں پھر اکیڈیمک ایسوسی ایشن کے انتخابات ہوئے۔ اس مرتبہ ترقی پسند گروپ کے قائدین نے بند کمرے میں ایک فیصلہ کیا جس کے نتائج بہت دور رس ثابت ہوئے۔ فیصلہ یہ تھا کہ چونکہ حکومت پیپلز پارٹی کی ہے اس لیے انقلاب کی منزل قریب آگئی ہے۔ لیکن ہر حکومت کی طرح پیپلز پارٹی کی حکومت بھی ریکشنری ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اس وقت جماعت اسلامی کا ساتھ دیں۔ اس طرح پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی میں ٹکراؤ ہوگا جس کی وجہ سے انقلابی قوتوں کو کام کرنے میں آسانی ہوگی۔ چنانچہ کوئی ۲۰ یا ۲۵ پختہ نظریہ بازوں نے پروگریسو امیدواروں کی جگہ جمعیتی امیدواروں کو ووٹ دیے اور یوں تھوڑے فرق

کے ساتھ جمعیت اسلامی کو کامیابی حاصل ہوئی اور آج تقریباً ۳۰ سال گذرنے کے بعد بھی یونیورسٹی میں جمعیت چھائی ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے چند کالجوں میں بھی جمعیت کی اجارہ داری ختم نہیں ہوسکی۔ آپ اسے سیاست میں مثالیت پسندی (Idealism) کہہ لیجیے یا کوئی ''اجتہادی غلطی'' قرار دیجیے۔ ترقی پسند ملاؤں کے مکتبی فکر نے بڑے خلوص سے ترقی پسندی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ اسی ترقی پسند ملاؤں Schoolmen کے ایک گرو جو میرے ہی ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے تھے میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے کہا مبارک ہو افغانستان میں انقلاب آ گیا ہے تو بولے ہمیں کیا فائدہ۔ اگر پاکستان میں انقلاب آئے اور فیض صاحب کو صدر بنا دیں تو ہمیں کیا فائدہ۔ تب مجھے خیال آیا کہ ایسے معصوم لوگوں کو سیاست میں نہیں آنا چاہیے۔ لیکن ایک بات ماننی پڑے گی کہ وہ آج تک اپنے اسی موقف پر قائم ہیں۔ کچھ عرصہ پیشتر وہ Nation میں ملازم ہوئے اور اسکے ادارتی پینل میں شامل ہو گئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ ساری عمر جن لوگوں کے خلاف لڑتے رہے اب ان ہی کے ملازم کیوں ہو گئے تو بولے آپ Nation کو نہیں دیکھتے کتنا ترقی پسند ہو گیا ہے میں نہیں سمجھتا کہ اس کی کوئی ذاتی غرض یا انا شامل تھی۔ شاید یہ اس ٹولے کی اجتماعی سوچ تھی کہ ایک آرگنیشن میں ملازم ہو گئے تو دوسرے گرو مارشل لاء حکومت کے سرکاری ترجمان بن گئے۔ یونیورسٹی نے واقعی ہماری بڑی سیاسی تربیت کی یہاں ہم نے ترقی پسندی بھی دیکھی، رجعت پسندی بھی دیکھی اور میکیاویلین ترقی پسندی بھی دیکھی۔

یونیورسٹی اساتذہ کے ترقی پسند گروپ میں ایک بہت جرت مند اور بے باک لیڈر بھی تھے جو اس اندرونی حلقہ سے باہر تھے۔ گرو حضرات کو بڑی شکایت تھی کہ وہ ان سے ہدایات نہیں لیتے۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ وہ ہمیشہ ان کی ہدایات کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اگر کہیں ان سے غلطی ہوئی ہے تو بتائیں۔ گروہ صاحبان کا موقف تھا کہ ہم کیوں بتائیں۔ آپ کو خود معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ بات معقول تھی۔ ہمارے بزرگوں کا

بھی ہم سے یہی تقاضہ ہوتا تھا کہ ہم خود ان کی منشاء کو سمجھیں یہ جاگیردارانہ ذہن ہماری وراثت ہے۔

اس دور میں رموز مملکت خسرواں سے بھی واسطہ پڑا۔ اندازہ تو پہلے بھی تھا لیکن اب ذاتی طور پر یہ تجربہ ہوا کہ حکومت کسی بھی پارٹی کی ہو۔ حکومت خود ایک پارٹی ہوتی ہے جس کے پارٹی اور نظریاتی مفادات کے علاوہ خود اپنے مفادات ہوتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو ایک ایسے صاحب کو وائس چانسلر بنا دیا گیا جو ترقی پسندوں کے سخت مخالف تھے۔ ایک ملاقات میں پنجاب کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ سے جو پیپلز پارٹی کے اہم رکن تھے اس بات کی شکایت کی گئی۔ ان کا ارشاد تھا کہ حکومت کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ وہ کسی عہدے پر تقرری سے پہلے امیدوار کے متعلق تحقیقات کرتی ہے اور دیکھتی کہ وہ اور اس کا خاندان روایتی طور پر حکومت کا وفادار رہا ہے۔ ہم نے احتجاج کیا کہ آپ تو ایک انقلابی جماعت ہیں آپ بھی ایسا سوچتے ہیں۔

حکومتی سوچ کا ایک اور بھی تجربہ ہوا۔ وفاقی وزیر تعلیم لاہور تشریف لائے تو کچھ اساتذہ کو گورنمنٹ ہاؤس میں دعوت دی گئی۔ وزیر موصوف نے ہم سے تعلیمی پالیسی کے متعلق مشورے چاہے۔ ہم نے بہت سے مشورے دیے جو سب کے سب منظور کر لیے گئے۔ ان میں سے صرف تین مجھے یاد ہیں۔ ہمارا پہلا مشورہ تو یہ تھا کہ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں لیکن یونیورسٹی ایک محدود ادارہ ہے اسی لیے یہاں ترقی کے امکانات کم ہیں۔ اس لیے یہاں لوگوں کو ترقی نہیں ملتی جب کہ کالجوں کے اساتذہ یونیورسٹی کے اساتذہ سے بہت پہلے پروفیسر بن جاتے ہیں۔ بلکہ یونیورسٹی میں تو اکثر ایسوسی ایٹ پروفیسر بھی مشکل سے بن پاتے ہیں۔ اس لیے ہم نے Running Scale کی تجویز دی چنانچہ اس طرح Move-Over کی پالیسی بنائی گئی۔ دوسرا ہم نے یہ مطالبہ کیا کہ یونیورسٹی میں پروفیسر اور ایسوسی ایٹ پروفیسر کی تقرری کے لیے پی ایچ ڈی کی شرط نرم کر دی جائے۔ یہ تجویز

بھی مان لی گئی۔ تیسری تجویز بھی منظور تو ہوئی لیکن نقصان دہ ثابت ہوئی۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ نئی نئی یونیورسٹیاں کھل رہی ہیں جن میں تجربہ کار اساتذہ کی ضرورت ہے۔ اس لیے یونیورسٹی کے اساتذہ کو بھی تبادلوں کی سہولت ملنی چاہیے۔ اس حکم کے تحت کسی یونیورسٹی میں تو کسی کا تبادلہ نہیں ہوا البتہ کچھ معتوب لوگ کالجوں میں بھیج دیے۔ ہمارے ایک اسٹنٹ پروفیسر جو پی ایچ ڈی تھے ان کا تبادلہ غالباً تھل کے ایک کالج میں کر دیا گیا۔

پیپلز پارٹی کے دور میں اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی بڑی بڑی صنعتیں قومیائی گئیں۔ محنت کشوں اور استادوں کی تنخواہوں میں بہت اضافہ ہوا روٹی پلانٹ لگے۔ بھٹو نے جنگی بیڑے اور ہوائی جہاز بنانے کی خوش خبری دی۔ مشرق وسطیٰ میں ملازمتوں کے دروازے کھل گئے۔ لیکن یہ دور زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ دوسرے انتخابات ہوئے۔ اس کے بعد جو حکومت بنی وہ نوابوں اور وڈیروں کی حکومت تھی۔ پیپلز پارٹی کا عوامی تشخص ختم ہو گیا۔ بھٹو کے پرانے ساتھیوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ پی این اے کی تحریک چلی اور بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا۔ اب حکومت ضیاء الحق کی تھی۔ ضیاء الحق نے ۹۰ دن میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا اور سیاسی جماعتیں سرگرمی سے تیاریاں کرنے لگیں۔ اس دوران دو باتیں دلچسپ ہوئیں۔ ان میں سے ایک تو یہ تھی میں فلم سنسر بورڈ کا ممبر بن گیا اور فلمیں سنسر کرنے کا کام شروع ہو گیا۔ دوسروں کے علاوہ سنتوش کمار بھی سنسر بورڈ کے ممبر تھے۔ ایک فلم دیکھی جس میں کچھ لوگوں کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے اور کچھ کو کوڑے لگائے جا رہے تھے اور ایک صاحب فرما رہے تھے کہ ہم نے ملک میں اسلامی قوانین نافذ کر دیے ہیں اور ہر طرف امن و امان ہے۔ دوسری فلم دیکھی جس میں نوجوان لڑکوں سے بھرا ہوا ایک تانگہ دوڑتا ہوا آ رہا تھا دوسری طرف سے ویسا ہی ایک لڑکیوں سے بھرا ہوا تانگہ آیا۔ جب دونوں تانگے قریب آئے تو جوش میں گاتے ہوئے لڑکے لڑکوں سے ہم آغوش ہو گئے اور لڑکیاں لڑکیوں سے۔ میں نے ایک بظاہر صالح ممبر سے پوچھا کہ اس میں تو کوئی غیر اسلامی بات نہیں ہے۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ کچھ بزرگ

ممبران فرمائش کر کے بلوز کے ٹکڑے دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میں ایک سینما میں گیا اور سنسر بورڈ کا کارڈ دکھا کر ہال میں چلا گیا۔ فوراً ہی ہال سے احتجاج کے نعرے بلند ہونے لگے اس لیے کہ میرے وہاں پہنچتے ہی انھوں نے چلتی ہوئی فلم روک کر اس کی جگہ کوئی اور فلم لگا دی تھی جس پر شائقین بہت برہم تھے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر میں واپس چلا آیا۔

....

(۱۰)

امیر خسرو اور تاج محل

دوسری دلچسپ بات یہ ہوئی کہ مجھے اسلام آباد سے ایک خط موصول ہوا کہ امیر خسرو کے عرس پر ایک قافلہ دہلی جا رہا ہے۔ مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ میں ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے اس کے ساتھ جاؤں۔ اس کے لیڈر ایک مجسٹریٹ تھے۔ داتا دربار سے یہ قافلہ بسوں کے ذریعہ واہگے کے لیے روانہ ہوا۔ داتا دربار میں ہمیں ہار پہنائے گئے۔ ہندوستان کی سرحد پر کافی وغیرہ دی گئی۔ ایک صاحب کا پاسپورٹ ختم ہو چکا تھا۔ انھیں واپس بھیج دیا گیا کچھ لین دین بھی ہوا۔ زائرین میں بہت سے پیشہ ور تاجر تھے اور ان کے ہندوستانی عملے سے اچھے مراسم معلوم ہوتے تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم لوگ امرتسر پہنچے جہاں مقامی اہل کاروں کی طرف سے ہمیں شاندار استقبالیہ دیا گیا اس کے بعد لنچ کرایا گیا۔ پھر سب کو ریلوے سٹیشن پہنچا دیا گیا۔ کچھ لوگ موقع نکال کر گولڈن ٹمپل دیکھنے چلے گئے۔ ریل میں ایک ڈبہ ہمارے لیے مخصوص تھا۔ رات کو ریل روانہ ہوئی اور رات بھر چلتی رہی۔ راستے میں صرف سٹیشن یا ان کے قریب کی کچھ آبادیاں نظر آئیں البتہ ایک بات بڑی عجیب تھی۔ ہمارا ہندوستان کا تصور دور درشن کی بدولت تھا اور ہمارا خیال تھا کہ ہندوستان میں مرد دھوتی باندھتے ہوں گے اور عورتیں ساڑھیاں۔ لیکن یہاں دیکھا تو مرد اکثر جینز پہنے ہوئے تھے تو اور عورتوں نے شلوار قمیص۔ کہیں بھی کوئی گاندھی ٹوپی نظر نہیں آئی۔ دلی کے بازار میں تو لڑکیاں بھی جینز پہنے نظر آئیں گاڑی جب صبح صبح دلی کے قریب پہنچی تو ایک نایاب منظر دیکھنے کو ملا۔ غازی آباد سے لے کر دلی میں جمنا کے کنارے تک تقریباً ۸ یا ۱۰ میل کے علاقے میں حد نگاہ تک مرد اور عورت بیٹھے ہوئے

رفع حاجت کر رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے ورڈز ورتھ کے ڈیفوڈلز یاد آ گئے۔ اس عام علاقہ میں بہت سے کئی منزلہ اپارٹمنٹس بھی تھے لیکن لگتا تھا کہ ان میں ٹوائیلٹ وغیرہ نہیں ہیں اور مرد عورت سب جنگل جاتے ہیں۔ ایسا منظر شاید دنیا میں کہیں اور دیکھنے کو نہ ملے۔

غرض دلی پہنچ گئے وہی جانا پہچانا دلی کا سٹیشن ابھی تقسیم ہند کو صرف ۳۰ برس ہوئے تھے مگر کہیں بھی کچھ نہیں بدلا تھا۔ وہی ریل کے ڈبے شنٹنگ کرتے ہوئے انجن قلیوں کی بھاگ دوڑ مسافروں کا ہجوم۔ لگتا تھا کہ ابھی کل ہی تو یہاں سے گئے تھے۔

دلی کے سٹیشن سے ہمیں بسوں میں سکاؤٹ کیمپ میں لے جایا گیا جو نظام الدین اولیا کے سامنے ہمایوں کے مقبرے کے برابر تھا۔ اس جگہ سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں اور یہاں آ کر میں بہت نوسٹلجک ہو گیا۔ ہم یہاں اپنے سکول کے زمانے میں سکاؤٹ جمبوریوں میں آتے تھے مجھے یاد ہے کہ آٹھویں جماعت میں کیمپ فائر میں لڑکوں کے کاندھوں پر کھڑے ہوئے پیرامڈ Pyramid پر چڑھ کر میں سلامی دیتا تھا۔ وہ پرانے زمانے نظروں کے سامنے پھر گئے اور بچپن کے دوست ایک ایک کر کے یاد آئے۔ زواروں کو ایک بڑے سے ہال میں ٹھہرایا گیا اور مجھے اور گروپ لیڈر کو علیحدہ کمرے دے دیے گئے۔ برسات کا موسم تھا اور کھلے میدان میں فضا خوش گوار تھی۔ ہمایوں کا مقبرہ جیسا ۱۹۴۷ء میں تھا ویسا ہی شکستہ حال ۱۹۷۷ء میں تھا۔ صبح نظام الدین اولیاؒ اور امیر خسرو کے مزارات پر گئے۔ راستہ میں غالبؔ کا مزار تھا۔ جو مزار سے زیادہ ''نہ کوئی مزار ہوتا'' کی تصویر نظر آتا تھا۔ سنا ہے کہ ''مرزا غالبؔ'' فلم کی کامیابی کے بعد یہ سہراب مودی نے بنوایا تھا۔ اس کے بعد مزار پر چادر چڑھانے کا پروگرام تھا لیکن میں موقع نکال کر وہاں سے چل دیا۔ وہاں سے بس لے کر میں سیدھا کشمیری دروازے پہنچا۔ یہ برابر برابر دو دروازے تھے جن میں سے ایک سڑک جانے کے لیے اور ایک آنے کے لیے گذرتی تھی۔ یہ دونوں سڑکیں جو قائمہ زاویہ بنا کر مغرب کی طرف مڑتی تھیں اب توڑ دی گئی ہیں اور فصیل توڑ کر سیدھی سڑک شمال کی جانب نکالی گئی ہے اور اسی سڑک پر دلی کا جدید

طرز کا بس سٹینڈ ہے۔ ہمارے گھر کی چھت بالکل کشمیری دروازے سے ملی ہوئی تھی۔ مشرق کی سمت ایک جدید طرز کا بازار تھا جس میں ایک دو یورو پینز کی دکانیں تھیں اور چند قدم پر ایک چھوٹا سا پارک تھا جو سنگھاڑا باغ کہلاتا تھا۔ اس کے مشرق میں ایک بڑا ساگر جا گھر اور دلی پولی ٹیکنک تھا۔ بائیں جانب ہندو کالج تھا اور جنوب میں بورڈ آف ایجوکیشن کے دفاتر تھے۔ شمال کی طرف چھوٹے سے بازار سے گذر کر کشمیری گیٹ آتا تھا۔ ہمارے مکان کے پیچھے فصیل تھی اور اس کے پیچھے ٹیلر گارڈن اور نکلسن گارڈن تھے۔ کشمیری دروازہ اور فصیل تو صحیح حالت میں تھے لیکن باغ اجڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک حصہ میں دلی کارپوریشن نے ایک کباڑ خانہ بنا دیا تھا۔ ہندو کالج بھی شہر سے باہر منتقل کر دیا گیا تھا اور اس کی عمارت میں اب دلی کارپوریشن کے دفاتر تھے۔ یہ تمام مناظر میں نے چلتے چلتے سرسری طور سے دیکھے اس لیے کہ مجھے اپنے آبائی گھر جانے کی جلدی تھی۔ کشمیری گیٹ سے باہر نکل کر میں بس کے اڈے پہنچا اور سونی پت کی بس میں سوار ہو گیا۔ بس قدسیہ پارک اور جمنا کے درمیان سے گذری۔ قدسیہ گارڈن میں سینٹ سٹیفنز کالج کے ٹینس کورٹ تھے ہندوستان کے چار پت مشہور ہیں۔ پانی پت، سونی پت، باغ پت اور اندر پت جو غالباً دلی کے پرانے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ دلی سے تقریباً بیس میل دور جرنیلی سڑک سے ایک شاخ مغرب کی طرف سونی پت کے لیے مڑتی ہے۔ دوسری طرف مشرق میں جمنا پار کر کے میرٹھ جاتی ہے۔ بس کا کنڈکٹر سکھ تھا لیکن جسم جسے سے وہ ہریانے کا لگ رہا تھا اتنا چھوٹا اور سوکھا سا سکھ میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ پھر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی سونی پت کا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ آب و ہوا اتنی تبدیلی بھی پیدا کر سکتی ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر بس سونی پت پہنچ گئی۔ اب تک کہیں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی تھی مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میں گھر پہنچوں گا سب مجھے وہاں مل جائیں گے، سونی پت میں ایک اونچا سا ٹیلہ ہے جسے کوٹ کہتے ہیں۔ معززین شہر بالائے کوٹ رہتے تھے اور نیچے رہنے والے رعیت کہلاتے تھے سونی پت میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک بڑا سا محرابی دروازہ ہے۔ یہ

بھی ابھی تک قائم تھا۔ یہ امام ناصرالدین کی درگاہ کا دروازہ ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب وہاں وہ بڑا سا نقارہ نہیں ہے جو زائرین کے آنے پر زور زور سے بجایا جاتا تھا۔ پھر دروازے کے طاقوں سے یہ بھی دکھائی دے رہا تھا کہ اس دروازے میں لوگوں نے سکونت اختیار کر لی ہے۔ پہلی تبدیلی اس وقت نظر آئی جب بس ایک میدان میں رکی۔ اب جو میں اترا تو دیکھا کہ یہ ہمارا پرانا خاندانی قبرستان ہے جو اللہ والی کہلاتا تھا۔ اب بھی بسوں کے اڈے کے نیچے ہمارے آباؤاجداد کی ہڈیاں بکھری ہوئی ہوں گی۔

کوٹ پر چڑھنے کے لیے چاروں اطراف میں کوئی چھ گھاٹیاں ہیں جو آمد ورفت کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان کے درمیان بڑی بڑی غار نما کھائیاں ہیں جنھیں جھیرے کہا جاتا ہے۔ گذشتہ تیس برس میں یہاں صرف ایک تبدیلی نظر آئی۔ صرف ایک گھاٹی کے منہ پر مکان بنا کر اسے بند کر دیا گیا تھا۔ باقی سب کچھ اسی طرح تھا جس طرح ہم ۴۷ء میں چھوڑ کر گئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک گھر کی بیرونی دیوار میں جو شگاف تھا وہ اب بھی اسی طرح تھا۔ عجیب اداسی اور سناٹے کا عالم تھا۔

واپسی پر میں ریل کے ذریعہ دہلی آیا۔ یہاں دو چیزیں نئی تھیں۔ ایک تو بکنگ آفس سٹیشن سے باہر ایک چھوٹی سی بلڈنگ میں چلا گیا تھا اور دوسرے ریل کی پٹری اب ڈبل ہو گئی تھی۔ گاڑی لوکل تھی اور پہلے کی طرح تقریباً خالی ہی تھی۔ پھر دو دیہاتی مانگنے والیاں آئیں ایسی ہی جیسے پہلے آتی تھیں اور انھوں نے وہی گیت گایا جو غالباً ان کی ماں یا نانی گاتی ہوں گی۔ عرض ہر جگہ تبدیلی کا بہت کم احساس ہوا۔ شہر کی گلیوں میں اسی طرح سؤر اور کتے پھرتے تھے البتہ قصائیوں کے محلہ میں اب قصائی نہیں تھے۔ دلی پہنچ کر میں سبزی منڈی کے اسٹیشن پر اتر گیا۔ یہاں بھی کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی۔ البتہ دلی میں اب ٹرام نہیں چلتی تھی۔ آزادی سے پہلے تو یہاں بجلی سے چلنے والی بڑی خوبصورت بسیں بھی چلتی تھیں۔ چاندنی چوک میں بھی اب ٹرامیں نہیں چلتی تھیں۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ نظر آئی کہ اب وہاں گھنٹہ گھر نہیں تھا جو اس

تاریخی بازار چاندنی چوک کا تاج تھا۔اس کے متعلق بھی ایک لطیفہ ہے۔جنگِ عظیم کے بعد دلی کا وقت ایک گھنٹے بڑھا دیا گیا تھا۔اب گھنٹہ گھر پر گیارہ بجے ہی بارہ بج جاتے تھے۔کسی نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگِ عظیم میں سکھوں نے بڑی خدمات سرانجام دی تھیں۔جنگ کے بعد سرکار انگریزی نے ان سے پوچھا کہ وہ ان خدمات کا کیا انعام لینا چاہیں گے تو انھوں نے کہا کہ ہماری سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ لوگ ہمارا بڑا مذاق اڑاتے ہیں کہ بارہ بجتے ہی سردار جی کا سر گھوم جاتا ہے۔آپ ہم پہ یہ مہربانی کریں کہ ہندوستان میں بارہ نہ بجنے دیں۔چنانچہ وقت ایک گھنٹہ آگے بڑھا دیا گیا۔اب جب گھنٹہ گھر پر بارہ بجتے تھے تو سردار جی کہتے کہ یہ تو گیارہ بجے ہیں اور جب بارہ کا وقت آتا تو گھنٹہ گھر پر ایک بجا ہوتا تھا۔پاکستان میں بھی وقت کو آگے بڑھایا گیا تھا حالاں کہ بظاہر تو یہاں سکھ نہیں رہتے۔مجھے یاد آیا کہ انگلستان میں بھی اسی طرح کا ایک واقعہ پیش آیا تھا ہم Southampton میں سمندر کے کنارے سیر کر رہے تھے کہ میرے دوست کو سگرٹ کی طلب ہوئی۔سامنے ایک کھوکھا تھا۔سوچا وہاں سے سگرٹ لے لیں۔لیکن دیکھا تو دکان دار ایک سردار جی تھے سگرٹ مانگنے کی ہمت نہ پڑی اس لیے کہ سکھ اس سے سخت ناراض ہوتے ہیں۔اچانک دکان کی گھڑی نے بارہ بجائے ۔ہمارے دوست نے پوچھا۔سردار کیا یہاں بھی بارہ بجے کچھ ہوتا ہے۔سردار جی نے کچھ شرماتے ہوئے کہا کہ ''جی ہوندا تو اے''۔ڈاڑھی کے گنجل کے پیچھے ہلکی شرمیلی سی مسکراہٹ مجھے بہت اچھی لگی۔

تو بات ہو رہی تھی چاندنی چوک کی۔اب وہاں گھنٹہ گھر نہیں تھا اور عبدالخالق سوہن حلوے والے بھی وہاں نہیں تھے۔یہ عبدالخالق جن کے نام پر وہ دکان تھی نویں جماعت میں میرے ہم جماعت تھے۔ایک مرتبہ انھوں نے مجھے فلم دکھانے کی پیش کش کی اور گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ آ کر مجھے لے گئے۔پہلی دفعہ میں نے گیلری میں بیٹھ کر فلم دیکھی۔اس کے گریبان میں شاید کوئی مچھر گھس گیا تو اس نے قمیص کے بٹن کھولے۔اس کا بنیان اس قدر سفید

تھا کہ میں بس دیکھتا ہی رہ گیا۔پاکستان بننے کے بعد اس سے ملاقات نہ ہو سکی اس لیے کہ ہم لاہور آ گئے تھے اور وہ لوگ کراچی چلے گئے تھے۔

چاندنی چوک میں دلی کارپوریشن کی خوبصورت عمارت ہے اور اس کے ساتھ کمپنی باغ ہے جس کے دوسری طرف ریلوے سٹیشن ہے۔یہ کمپنی باغ بھی بڑی تاریخی چیز ہے۔ایک طرف تو یہ دلی کے کلچر کا نمونہ ہے۔یہاں ہر وقت چرسی، جواری اور اچکے جمع رہتے ہیں۔پھر مداریوں اور جادوگروں کے تماشے بھی ہوتے ہیں اور بڑے چرب زبانی سے دوائیں بیچنے والے بھی۔پھر یہیں عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مناظرے بھی ہوتے تھے۔ایک طرح یہ دلی کا ہائیڈ پارک ہے۔

چاندنی چوک سے سائیکل رکشے پر میں جامع مسجد گیا۔فاصلہ تو اتنا نہیں تھا لیکن میں سائیکل رکشے پر بیٹھنا چاہتا تھا۔آزادی سے پہلے دلی میں وہ رکشے بھی چلتے تھے جنھیں آدمی کھینچتے تھے۔گرمیوں میں سڑکیں تپتی تھیں۔برسات میں پھسلن اور سردیوں میں ٹھنڈک ۔غریب لوگ سب کچھ برداشت کرتے تھے۔یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ہندوستان میں خصوصاً نچلے طبقہ میں جوتے پہننے کا رواج نہیں ہے اور مزدور اور محنت کش اکثر ننگے پیر ہی ہوتے ہیں۔ایک روز ایک کینیڈین سیاح نے کہا کہ لاہور اور دلی ایک دوسرے سے بہت ملتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ دلی میں غربت زیادہ ہے۔میں نے اسے بتایا کہ ایسا نہیں ہے، ننگے پیر پھرنا اور صرف ایک پتلی سی چادر سے جسم ڈھکنا ان کا کلچر ہے یہ غربت نہیں ہے۔یہ بات غالباً ضیاء الحق کو بھی معلوم نہیں تھی اسی لیے اس نے کہا تھا کہ پاکستان کے لوگ خوش حال ہیں یہاں کوئی ننگے پیر نہیں پھرتا۔یہ خوشحالی نہیں کلچر ہے۔یہ تو ایسی بات ہوئی کہ انگریزوں کے بچے بھی انگریزی بولتے ہیں۔

جامع مسجد پہنچ کر مغلیہ کھانوں کے مزے لیے۔کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد واپس کیمپ پہنچ گیا۔زائرین کے اس قافلے کا حساب و کتاب ایک سرکاری افسر کے سپرد کیا ہوا

تھا۔ یہ سواتی صاحب تھے اور کسی فیڈرل منسٹری کے افسر تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں دلی دیکھنے گیا تھا۔ انھوں نے بھی دلی کی سیر کا اشتیاق ظاہر کیا۔ چنانچہ اگلے روز میں ان کے ساتھ پرانی دلی کی سیر کو گیا اور انھیں اس علاقہ میں لے گیا جو ریلوے لائن کے دوسری طرف ہے اور گندہ نالہ یا موری گیٹ کہلاتا ہے۔ یہ ریلوے لائن اور کشمیری دروازے کے درمیان کا علاقہ ہے اور ہمارے خاندان کے اکثر لوگ اسی علاقے میں رہتے تھے۔ یہاں ایک مشنری سکول تھا جس کا نام سینٹ سٹیفنز ہائی سکول تھا یہ ایک بہت اعلیٰ درجہ کا اسکول تھا جس کی اپنی یونیفارم ہی نہیں بلکہ اپنی اسٹیشنری بھی ہوتی تھی۔ یہ ہمارا خاندانی سکول تھا۔ اس کا ہیڈ ماسٹر ہمیشہ عیسائی ہوتا تھا۔ نہ بھی ہو تو وہ عیسائی ہو جاتا تھا۔ میں پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو یہ سینٹ سٹیفنز ہائی سکول تھا لیکن جب میں نویں میں پہنچا تو یہ اینگلو عربک ہائی سکول موری گیٹ ہو گیا تھا اس لیے کہ انجمن اسلامیہ نے اسے مشن سے خرید لیا تھا۔ اس انجمن کے دہلی میں دو سکول پہلے سے تھے۔ اینگلو عربک ہائی سکول دریا گنج اور اجمیری گیٹ۔ اجمیری گیٹ کے سکول کے ساتھ پرانا تاریخی دلی کالج تھا جو اس وقت اسلامیہ کالج کہلاتا تھا اور اب پھر دلی کالج ہو گیا ہے۔ یہ تحریکِ پاکستان کا گڑھ بھی تھا۔

اینگلو عربک ہائی سکول موری گیٹ کسی زمانے میں مغلیہ سلطنت کا اصطبل رہا تھا۔ اس کی فرش کے نیچے گہرے گہرے غار تھے جو پانی سے بھرے رہتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ یہاں سے ایک سرنگ لال قلعہ دلی اور دوسری آگرہ کے قلعہ کو جاتی تھی۔ لیکن کبھی کسی نے ان غاروں میں اترنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں سواتی صاحب کو لے کر اس علاقہ میں گھومتا رہا۔ وہ اسکول بند تھا اور اس کے دروازے پر تختے ٹھکے ہوئے تھے۔ سواتی صاحب نے وہاں کے لوگوں کو دیکھ کر کہا کہ یہ اتنے چھوٹے اور سوکھے ہوئے کمزور سے لوگ یقیناً ہماری نسل سے نہیں ہو سکتے اور یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی اس لیے کہ پاکستانی دلی میں دور سے پہچانے جاتے تھے۔ چاندنی چوک میں تو لوگ آوازیں دے کر بلاتے تھے کہ پاکستان سے تشریف لائے ہیں

ادھر آیئے گاہک بن کر نہیں مہمان بن کر لیکن بنیے کو کاروبار آتا ہے۔ وہ مہمان کہہ کر بلاتا اور گاہک بنا کر رخصت کرتا ہے۔ ہمارے دکانداروں کی طرح نہیں کہ وہ گاہک سے کہہ دیتے ہیں کہ لینا ہو لیں ورنہ آگے جائیں۔ واقعی وہ ایک مختلف قوم ہے۔ چند برس پیشتر ہمارے عزیزوں میں سے جو کراچی میں رہتے ہیں ایک لڑکا ہندوستان گیا تو انھوں نے یقین ہی نہیں کیا کہ یہ پاکستانی ہے اور اسے کچھ عرصہ قید میں گذارنا پڑا۔ وہ بہت ہی لاغر اور سوکھا ہوا سا تھا۔ بہر حال ہم نے اپنے دوست سواتی صاحب کو خوب دلی دکھائی۔ آزادی سے پہلے اجمیری دروازے اور دربار گنج کے باہر تقریباً سارا جنگل تھا لیکن اب یہ سارا علاقہ آباد ہو گیا تھا۔ وہی فیروز شاہ کوٹلہ، وہی خونی دروازہ، پرانا قلعہ، ہمایوں کا مقبرہ اور پھر قطب مینار۔ دلی تیرہ (۱۳) پیروں کی چوکھٹ کہلاتی ہے۔ سرکاری طور پر ہمیں ہر مزار پر لے جایا گیا۔ روشن چراغ دلی کا منظر بہت ہی منفرد تھا۔ درمیان میں قرونِ وسطیٰ کی طرز کی عمارت اور چاروں طرف جدید رہائشی علاقے۔

امیر خسرو کے عرس کے سلسلے میں چند تقریبات بھی ہوئیں جن میں کچھ وزراء اور دلی حکومت کے اعلیٰ افسر بھی شامل ہوئے۔ بڑی ضیافتیں ہوئیں اور ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ اس کے بعد زائرین کی فرمائش پر ہندوستانی منتظمین نے آگرے میں تاج محل جانے کا پروگرام بنایا۔ اس کے لیے غالباً زائرین سے کرائے کے طور پر کچھ مزید پیسے بھی لیے گئے۔ ہم بسوں میں دلی سے روانہ ہوئے۔ ہندوستان کا دیہاتی ماحول اب بھی وہی پرانا ماحول ہے۔ وہی کھیت کچی پکی سڑکیں دیہاتی لباس پہنے ہوئے مرد اور عورت۔ علی گڑھ سے باہر ایک چوراہے پر ہم رکے۔ معلوم ہوا کہ شہر میں حالات کچھ پرسکون نہیں ہیں وہیں سڑک کنارے ایک چھپر کے نیچے دودھ کی ایک بڑی سی دکان تھی وہاں سے دودھ لیا۔ آبخوروں (مٹی کے کچے پیالوں) میں گرم گرم دودھ پی کر بچپن کے مزے یاد آ گئے۔ ملائی بھرے ہوئے دودھ میں آبخوروں کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو مل کر عجیب ہی مزا دیتی تھی۔ پاکستان میں تو آبخورے اب کہیں

دکھائی نہیں دیتے۔ یہ پرانے ہندوستان کے کلچر کا ایک منظر تھا۔ پھر کچھ دیر بعد وہاں سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ سب کو ہی ہندوستان میں مسلمانوں کی اس عظیم درس گاہ کو دیکھنے کا شوق تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمیں اندر جانے کا موقع نہ ملا اس لیے کہ طلباء کا ایک زبردست احتجاج جاری تھا۔ اسی روز دلی میں اندرا گاندھی کی گرفتاری ہوئی تھی جس سے پورے ہندوستان میں امن و امان کی صورت حال خراب ہوگئی تھی۔ غرض وہاں سے چل کر آگرے پہنچے۔ پہلے بسوں سے اتر کر کھانے کے لیے گئے۔ معلوم ہوا کھانا بہت سستا ہے۔ لیکن جب کھانا آیا تو ایک غوری میں صرف دو نوالوں کا سالن تھا۔ ہمارے ساتھیوں نے چار چار پلیٹیں منگائیں۔ ہندوستانی جسم جیسے میں بھی چھوٹے چھوٹے اور نازک ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کی خوراک بھی کم ہوتی ہے۔

کھانا کھا کر ہم تاج محل دیکھنے گئے۔ روضے سے پہلے ایک بہت بڑی چار دیواری ہے جہاں سیاحوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں، جیسے ہی ہم نے اس چار دیواری کو عبور کیا تو اچانک جیسے آسمان سے ایک دم ایک خوبصورت عمارت ابھر کر سامنے آگئی۔ تاج محل میں داخل ہونے کا راستہ ایسا بنایا گیا ہے کہ تاج کا پہلا ہی منظر بھرپور منظر ہوتا ہے اور آنے والا ایک دم چونک کر رہ جاتا ہے۔ تاج محل بالکل ایک آسمانی چیز دکھائی دیتا ہے۔ لگتا تھا جیسے ہم کسی اور ہی دنیا میں آگئے ہوں۔ یہاں لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ لوگ فاتحہ پڑھنے کے لیے تہہ خانے میں جا رہے تھے جہاں شاہجہاں اور ممتاز محل کی قبریں تھیں۔ اوپر، گنبد کے نیچے صرف قبروں کے تعویذ تھے۔ میں نے سوچا کہ روزانہ ان دونوں کو کتنا ثواب ملتا ہوگا۔ ہزاروں مرد عورت روزانہ یہاں آ کر فاتحہ پڑھتے ہیں اور وہ صرف اس لیے کہ وہ تاج محل میں دفن ہیں۔ اسی لیے تو ساحر کو لگا تھا کہ ایک شہنشاہ نے تاج محل بنا کر ہم غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا ہے۔ یہاں ایک اور بھی دلچسپ چیز دیکھی۔ مسلمانوں کی عمارات کی طرح یہ عمارت بھی شمالاً جنوباً بنائی گئی ہے۔ مغرب کی طرف ایک خوبصورت مسجد ہے۔

ہمارے بزرگ استاد پروفیسر حمید احمد خان نے ہمیں بتایا تھا کہ لاہور میں دو قسم کے باغات ہیں۔ کلاسیکی اور رومانوی شالیمار کلاسیکی باغ ہے کلاسیکی باغ کی شکل اقلیدی انداز کی ہے۔ چوکور باغ، اس میں چوکور پھولوں کے تختے چوسر کی شکل میں بنی ہوئی نہریں اور ان میں جھلکتے ہوئے فوارے۔ اگر ایک طرف پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ تو دوسری طرف بھی ایسی ہی کیاریاں۔ ایک طرف پھلوں کے درخت ہیں تو دوسری طرف بھی ایسے ہی درخت ایک طرف فوارے ہیں تو دوسری طرف بھی فوارے ہیں ایک طرف مسجد ہے تو دوسری طرف الٹی مسجد ہے۔ یہ آہنگ یہ توازن یہ سمٹری کلاسیکل فن تعمیر کی جان ہے چاہے مسجد الٹی بنانی پڑے توازن نہ جائے۔ اس کے برعکس لاہور میں ایک رومانوی باغ بھی ہے۔ یہ باغ جناح ہے جو لارنس گارڈن بھی کہلاتا ہے۔ یہاں بڑی محنت اور بڑے سلیقہ سے بے سلیقگی پیدا کی گئی ہے جیسے خواتین بیوٹی پارلر سے پیسے خرچ کر کے اپنے بال پریشان کرواتی ہیں۔ اس ایک بگڑنے میں لاکھوں بناؤ ہیں تاج محل کلاسیکی فن تعمیر کا ایک مکمل نمونہ ہے اور مغلیہ فن کا شاہکار ہے۔

آگرے سے واپسی پر ہم دلی آئے۔ اگلے روز پاکستان روانگی تھی۔ اسی دوران پاکستان میں ضیاء الحق نے انتخابات کا پروگرام منسوخ کر دیا تھا۔ یہ بہت ہنگامی حالات تھے۔ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی۔ یہاں اندرا گاندھی قید ہوئیں اور وہاں انتخابات منسوخ ہوگئے۔ روانگی سے پہلے میں اپنے والد کے ایک ہندو دوست رام لعل سے ملنے گیا۔ ان کی دکان بلیو برڈ ہمارے گھر کے قریب ہی تھی اور کچھ ہی فاصلہ پر ان کا مکان تھا۔ وہاں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ یہاں تک کہ ان کے گھر کے قریب ہی ۱۹۴۷ء میں ایک بڑی سی بلڈنگ میں آگ لگ گئی تھی اور وہ اب تک جلی ہوئی کھڑی تھی۔ گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ رام لعل صاحب جو کانگریس کے سرگرم کارکن تھے اندرا گاندھی کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے خود گرفتار ہو گئے تھے۔ البتہ ان کی بیوی سے ملاقات ہوئی بڑی محبت سے ملیں۔ حال ہی میں ان کے چھوٹے بیٹے کی شادی ہوئی تھی۔ میں نے ان کی بہو کو منہ دکھائی بھی

دی سب ہی بہت خوش تھے اور وہ پاکستان میں ہمارے جن جن عزیزوں کو جانتے تھے ان کے نام سلام بھجوائے۔ سٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ قافلہ کے دو مسافر کم ہیں۔ وہ غائب ہیں لیکن اپنے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ چھوڑ گئے ہیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ ان کی تلاش اور انتظار کے بعد قافلہ دلی کے سٹیشن سے امرتسر کے لیے روانہ ہوگیا۔ رات بھر سفر کرنے کے بعد پھر امرتسر سے بسوں کے ذریعہ اٹاری پہنچے۔ یہاں سخت تلاشی ہوئی اور مسافروں کے سامان کھلوا کر دیکھے گئے۔ میرے پاس دو مور چھل تھے۔ وہ انھوں نے مجھ سے یہ کہہ کر لیے کہ یہ ان کا شاستری پنچھی ہے۔ لیکن پھر دوسرے افسر نے وہ مجھے واپس لوٹا دیے۔

....

(۱۱)

سیاست کی قلابازیاں

واہگہ پار کر کے جب لاہور میں داخل ہوئے تو سارا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ جب ہم ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے تھے تو ہر طرف سیاسی پارٹیوں کے بڑے بڑے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ لیکن جب واپس آئے تو ایک بھی جھنڈا نہیں تھا۔ وہ جھنڈے بہت زیادہ اور بڑے تھے جن میں سب سے زیادہ اور سب سے بڑے جھنڈے پیپلز پارٹی کے تھے ''مطلوبہ نتائج'' کا امکان نہ ہونے کے خوف سے انتخابات منسوخ کر دیے گئے تھے۔ یوں یہ دورۂ ہندوستان ختم ہوا۔

ادھر بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور یونیورسٹی میں جمعیت کی تشدد آمیز کاروائیاں تیز ہو گئی تھیں۔ ایک روز کچھ لڑکے میرے ڈیپارٹمنٹ میں اپنے ایک ساتھی کی پٹائی کر رہے تھے میں نے وہاں جا کر انھیں علیحدہ علیحدہ کیا۔ ایک دن میرے چپڑاسی نے بتایا کہ کچھ لڑکے پھر مار کٹائی میں لگے ہوئے میں نے پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس پر انھوں نے اس چپڑاسی کو بری طرح مارا۔ انگلش ڈیپارٹمنٹ روایتی طور پر ایک لبرل ڈیپارٹمنٹ تھا اور اسی وجہ سے جمعیت کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ ایک روز میرے ہی ڈیپارٹمنٹ کے ایک لڑکے کو جس کا تعلق جمعیت سے تھا دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے مخالف گروپ نے پکڑ لیا۔ مجھے خبر ملی تو میں نے جا کر اس کو چھڑایا۔ میری کلاس میں ایک نابینا لڑکی پڑھتی تھی۔ اس نے مجھ سے لیکچرز ٹیپ کرنے کی اجازت مانگی میں کسی کو بھی ٹیپ کلاس میں لانے سے منع نہیں کرتا تھا اور اسی وجہ سے آج میرے ٹیپ سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور دور دراز علاقوں سے مجھے فون بھی آتے رہتے کبھی میانوالی اور کبھی ڈیرہ اسمٰعیل خان سے اور کبھی کوئٹہ وغیرہ سے کہ انھیں میرے ٹیپ ملے ہیں اور

وہ مزید ٹیپ چاہتے ہیں۔ یہ لڑکی ایک دن ڈیپارٹمنٹ آئی تو اس کا چہرہ سوجھا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد نیل پڑے ہوئے تھے۔ ہوسٹل کی کچھ لڑکیوں نے اس سے ٹیپ مانگے تو اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ میری اجازت کے بغیر ٹیپ نہیں دے سکتی۔ یہ ایک امانت ہیں۔ اس پر اسے خوب مارا گیا میں نے اس کو سمجھایا کہ اس نے بے کار اتنی مار کھائی۔ میرے ٹیپ کوئی خفیہ تخریب کاری نہیں وہ تو میرے لیکچر ہیں اور دوسرے لوگ بھی انھیں ٹیپ کرتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اب وہ مانگیں تو ٹیپ انھیں دے دینا۔ پھر ایک روز ایک لڑکی اچھی خاصی زخمی حالت میں ڈیپارٹمنٹ آئی۔ اُسے برقع پوش طالبات نے یونیورسٹی کے سامنے مال روڈ پر بری طرح مارا تھا اور لڑکے ان مارنے والیوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ یہ منظر مال پر سب نے دیکھا۔

یونیورسٹی میں طلبہ کا عمل دخل اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ ساری ایڈمنسٹریشن ان کے ہاتھ میں تھی۔ ایک دو پروفیسروں کو بھی ڈنڈوں سے پیٹا گیا۔ ہمارا ایک وفد اس سلسلے میں DIG سے ملا تو اس نے کہا کہ وی سی مطلوبہ لڑکوں کی گرفتاری ہی نہیں دیتا تو ہم کیا کریں۔

میرا ایک طالب علم پڑھنے لکھنے کی طرف بالکل مائل نہیں تھا اور میرے پرچہ میں اس کے مشکل سے پانچ دس نمبر تھے۔ مجھ پر کافی دباؤ تھا کہ میں اسے پاس کردوں ایک روز میں نے نوٹس بورڈ پر دیکھا کہ اسے ڈیپارٹمنٹ کا ناظم بنادیا گیا ہے۔ پھر ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور دوسرے اساتذہ کے ساتھ پروفیسر اسرار احمد اور مشہور فلم ڈائریکٹر ضیا سرحدی بھی بیٹھے تھے۔ یہ صاحب بڑی بدتمیزی سے اندر آئے اور سب کے سامنے کہا کہ نمبر دینے ہیں۔ ورنہ باہر آؤ۔ کمرے میں موجود لوگ دنگ رہ گئے۔ میں اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر وی سی آفس لے گیا جو عارضی طور پر ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے قریب ہی تھا۔ میں نے وی سی کو بتایا کہ اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔ وہاں اور بھی سینیئر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وی سی اس لڑکے کو اندر کے کمرے میں لے گئے اور چند منٹ کے بعد واپس آ کر مجھ سے کہا کہ آپ

جایئے وہ اب آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ نتیجہ نکلا تو وہ پاس تھا حالاں کہ میرے پرچے میں وہ فیل تھا اور میں نے اسے پاس نہیں کیا تھا۔ اس وقت یونیورسٹی میں سمسٹر سسٹم تھا۔ یہ اس وقت یونیورسٹی کے حالات تھے۔

پھر بھٹو کی گرفتاری ہوئی۔ مارشل لاء کا ایک طویل دور شروع ہوا۔ ڈنڈا فورس ہر طرف نظر آنے لگی۔ یہ ڈنڈے صرف طالب علموں پر ہی نہیں بلکہ یونیورسٹی کے دو پروفیسروں پر بھی چلے۔ یونیورسٹی کے ماحول پر ایک عجیب سی گھٹن طاری تھی۔ باہر کی دنیا میں بھی تبدیلی آئی۔ مزاحمتی تحریکیں شروع ہوئیں اور مزاحمتی ادب لکھا جانے لگا۔ کراچی میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی ہوئی۔ لاہور سے دانشوروں کا ایک وفد اس میں شریک ہوا۔ حالاں کہ مارشل لاء کا دور تھا۔ راستہ کے سٹیشنوں پر اعلیٰ سرکاری اہلکاروں نے ہمارا استقبال کیا اور ہماری خاطر تواضع بھی کی۔ اسی دوران میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ سندھ کے دورے کا پروگرام بھی بنایا۔ لاڑکانہ، دادو، حیدرآباد وغیرہ کے دورے کیے۔ سندھ میں مجبوری اور غصہ کے ملے جلے جذبات نظر آئے۔ اس مدافعتی دور میں سندھی دانشوروں کی صلاحیتیں زبردست طریقہ سے بیدار ہوتی نظر آئیں۔ سندھ کے بڑے بڑے دانشوروں اور سیاست دانوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ادھر لاہور کے ادبی حلقوں میں بھی نئے سرے سے جان آگئی۔ انقلابی ڈرامے سٹیج کیے جانے لگے۔ مزدور کسان ریلیاں ہوئیں۔ غرض ہر طرف ایک طرح کی مایوسی بھی تھی اور گہما گہمی بھی تھی۔ اسی دوران ''ماہِ نو'' نے اپنا گولڈن جوبلی نمبر نکالا اور ''سارک نمبر'' بھی نکالا۔ غرض ہر طرف ایک گھٹی گھٹی سی لیکن ہیجانی فضا تھی۔

....

(۱۲)

ایران کا سفر

اسی دوران گھر والوں کے ساتھ ایران جانے کا اتفاق ہوا۔انقلاب کے بعد کا ایران شاہی ایران سے بہت مختلف تھا۔اب ہر جگہ ایک نظم وضبط نظر آتا تھا۔سڑکیں بازار سب صاف ستھرے تھے۔یہاں تک کہ بسوں کے اڈوں پر بھی نظم ونسق پہلے سی کافی بہتر تھا۔بازاروں میں بھی ایک سلیقہ آ گیا تھا۔کہیں تجاوزات نہیں تھیں۔سب دکانیں قرینہ سے سجائی ہوئی تھیں اور کہیں بھی کوئی ایک چیز پڑی یا سڑک پر نظر نہیں آتی تھی۔البتہ ایران پہنچتے ہی پہلا مسئلہ رہائش کا در پیش ہوا۔شام کا وقت تھا جب ہم زاہدان پہنچے اور کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ رہائش کی تلاش کرتے رہے۔ٹیکسی ڈرائیور ہمیں پورے شہر میں گھماتا رہا۔ہوٹل ہوں یا پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس۔سب ''سی دلار'' (تیس ڈالر) کرایہ مانگتے تھے اور اکثر نے تو دروازہ کھولنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔آخر کار ہم ایک ہوٹل پہنچے تو اس نے ہم سے ۵۰۰ تومان فی کمرہ مانگا جو اس وقت کے پاکستانی پچاس روپے بنتے تھے ہم نے دو کمرے لے لیے۔ہوٹل بالکل نیا تھا اور ہر طرف قالین بچھے ہوئے تھے۔کمرے اور باتھ روم صاف ستھرے تھے۔ہم نے ایک رات وہاں گذاری اور اگلے روز بس لے کر سیدھے قم چلے گئے۔کچھ روز وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم تہران گئے اور وہاں چند روز گذار کر مشہد آ گئے۔ایران کا یہ دورہ دلچسپ بھی تھا اور بہت معلومات افزا بھی۔

ایران میں خواتین حجاب میں رہتی ہیں۔اوپر سے نیچے تک سیاہ چادر میں ملبوس، سیاہ موزے پہنے ہوئے۔درگاہوں پر پاسداران سب کو ہدایت کرتے ہوئے کہ بال ڈھکیں۔لیکن چال ڈھال اور چہروں سے اعتماد جھلکتا ہوا۔نماز میں مرد اور عورت کی کوئی تمیز

نہیں سب ساتھ ساتھ ایک صف میں نماز پڑھتے ہیں۔پھر سنی شیعہ کی بھی تمیز نہیں۔اگر امام سنی ہے تو سب اسی کی طرح نماز پڑھتے ہیں اور امام شیعہ ہے تو اس کی طرح۔البتہ روضوں پر زبردست ہجوم ہوتا ہے۔یہاں مردوں اور عورتوں کے لیے روضہ کے مختلف حصے مخصوص ہیں۔لیکن بسوں میں عورت مرد سب ساتھ بیٹھتے ہیں وہاں خواتین کی علیحدہ نشستیں نہیں ہیں۔پھر ایرانیوں کی عام زندگی میں بھی کوئی زیادہ تکلفات نہیں ہیں۔ہم نے دیکھا کہ ایک گاڑی سے ایک خاندان اترا۔سڑک کنارے پٹڑی پر فرش بچھایا۔وہیں کھانا کھایا اور وہ وہیں سو گئے۔روٹیاں تندور سے ملتی ہیں جن کے لیے قطار بنانی پڑتی ہے۔وہ لوگ سالن کے بجائے گرے سے روٹی کھاتے ہیں یا ایک قسم کی گھاس کے ساتھ جو وہ روٹی کے ساتھ سلاد کی طرح کھاتے ہیں۔ان کی پسندیدہ ڈش چلو مرغ ہے۔چاولوں پر بوٹیاں رکھی ہوتی ہیں اور وہ بڑی رغبت سے یہ کھانا کھاتے ہیں لیکن جو تیل وہ پکانے میں استعمال کرتے ہیں اس میں سے ایک عجیب قسم کی ہیک آتی ہے اور پاکستانی بڑی مشکل سے اسے کھاتے ہیں۔اس کے علاوہ وہاں پاکستانی ہوٹل بھی ہیں جہاں ہر قسم کے پاکستانی کھانے ملتے ہیں۔لیکن یہ ذرا مہنگے ہیں۔

اسلامی انقلاب آنے کے بعد بھی یہاں مذہبی رواداری بہت ہے۔فرقہ بندی تو ویسے ہی نہیں ہے اس کے علاوہ بھی مذہبی فرائض کی ادائیگی پر سختی سے عمل نہیں کرایا جاتا جیسے کہ سنا ہے کچھ دوسرے اسلامی ملکوں میں ہے جہاں ہر شخص کو نماز کے لیے کاروبار بند کرنا پڑتا ہے۔یہاں با قاعدہ نمازیں ہوتی ہیں۔لیکن کاروبار بھی جاری رہتا ہے اور خود روضوں پر بھی بہت سے لوگ نماز نہیں پڑھتے بلکہ ادھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔البتہ کچھ لوگوں کو پاسداروں سے شکایتیں بھی تھیں اور ان کی زیادتیوں کے قصے بھی مشہور ہیں۔کچھ لوگ اسلامی انقلاب کے بعد ملک چھوڑ کر ہی چلے گئے تھے۔کچھ ایسے بھی تھے جنھیں شاہی دور کی آزادیاں یاد آتی تھیں۔غرض ہر طرح کے رویے دیکھنے کو ملتے تھے۔سب ہی عورتیں حجاب میں ہوتی تھیں لیکن حجاب کے نیچے سکرٹ پہنتی تھیں۔غالباً یہی وجہ تھی کہ اسلامی حکومت نے حجاب کی پابندی

لازمی کردی تھی۔شاہ کے زمانے میں زبردستی سب کو سکرٹ پہننے پر مجبور کردیا گیا تھا۔اب انقلاب کے بعد شاید زیادہ تر لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ فوراً نئے لباس بنوائیں اور نیا طرزِ زندگی اختیار کریں۔ان کے سکرٹ پہننے پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔صرف اوپر چادر لینے کو ضروری قرار دے دیا گیا۔اگر ایران میں بھی عورتیں پاکستانی عورتوں کی طرح شلوار پہنتیں اور سر پر دوپٹے لیتیں تو شاید وہاں حجاب کی پابندی نہ لگائی جاتی۔

اس مرتبہ چوں کہ گھر والے ساتھ تھے اس لیے ایران کی مفصل سیر کا پروگرام بنایا گیا۔سب سے پہلے نیشا پور گئے۔یہاں سے ہمارے آباؤ اجداد ہجرت کر کے ہرات آئے تھے اور پھر وہ ہرات سے دلی منتقل ہوگئے تھے۔اس لیے نیشا پور سے ایک دلی عقیدت بھی تھی۔نیشا پور باغوں کا شہر ہے اور تازہ پھلوں کے لیے مشہور ہے۔یہاں کی سب سے اہم جگہ عمر خیام کا مزار ہے اور دوسرے مزارات بھی موجود ہیں۔نیشا پور کے راستہ میں قدیم عباسی دور کے قید خانے بھی دیکھے جہاں امام بھی قید و بند میں رہے تھے۔

نیشا پور کے بعد ہم مشہد کی دوسری جانب فردوسیہ بھی گئے۔یہاں فردوسی کے مزار کے باہر فردوسی کا ایک بہت بڑا مجسمہ بھی ہے۔ایران کی اسلامی حکومت نے فردوسی کے اس مجسمہ کو نہیں توڑا۔فردوسی کا ایک ایسا ہی مجسمہ تہران میں بھی ہے۔یہ بھی ایرانیوں کی مذہبی رواداری کی ایک مثال ہے۔

نیشا پور اور مشہد کی سیریں کرنے کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اصفہان کی سیر کو گئے۔اصفہان جسے ایرانی نصف جہان کہتے ہیں۔یہ پرانی اور نئی دنیا کا ایک خوبصورت سنگم ہے۔یہاں دریا کے اوپر ایک پل ہے جو پل موجو کہلاتا ہے جس کے نیچے ستونوں کے درمیان بیٹھنے کی جگہیں بنائی گئی ہیں جن کے گرد پانی گھومتا ہوا گذرتا ہے۔یہاں پکنک پر آنے والے بیٹھ کر آرام کرتے ہیں کھاتے پیتے ہیں اور بہتے ہوئے پانی کے مزے لیتے ہیں۔یہاں کی پرانی مسجدیں اور پرانے بازار بھی بہت خوبصورت ہیں۔اصفہان بھی باغوں کا شہر ہے۔

اصفہان سے کچھ فاصلہ پر ایک مسجد ہے جو منارِ جنباں کے نام سے مشہور ہے۔ہماری تہران کی پاکستانی میزبان اسے جُھمن جُھمن کہتی تھیں۔یہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس کے مینار کو ہلاؤ تو دوسرا مینار خود بخود ہلنے لگتا ہے۔یہاں واشنگٹن کا کیپٹال یاد آیا جس کے بڑے سے ہال میں دو مقامات ایسے تھے کہ ایک جگہ کھڑا ہو کر کوئی آہستہ سے بھی بولتا تو دوسری خاص جگہ اس کی آواز صاف سنائی دیتی حالانکہ دونوں کے درمیان فاصلہ بھی کافی تھا اور ہال میں ویسے بھی خاصہ شور رہتا تھا۔

خراسان اور اصفہان کی سیر کرنے کے بعد ہم تہران پہنچے۔تہران میں شاہی محلات بھی دیکھے۔پہلی مرتبہ یہاں آنے پر ۱۹۶۹ء میں شاہی محلات کے دیکھنے کا کوئی امکان نہیں تھا البتہ شاہِ ایران کو ضرور دیکھا تھا جب وہ ملکہ کے ساتھ انیس برس پہلے لاہور آئے تھے۔لاہور میں ان کا بہت والہانہ استقبال ہوا تھا۔اس وقت کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ خود اپنے ملک میں وہ کتنی کسی نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں پاکستان کے اس دورے کے دو تین برس بعد ہی مصدق کے زمانے میں شاہِ ایران کو ملک چھوڑ کر بھاگنا بھی پڑا تھا۔ایرانیوں نے شاہی دور میں بھی اور انقلاب کے بعد بھی ثابت کر دکھایا کہ وہ آزادی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکرانے کو بھی تیار ہیں۔

وہاں قیام کے دوران ہی ۱۴ اگست کا دن آ گیا۔ہم جن صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہ اس وقت وہاں پاکستان کے قائم مقام سفیر تھے۔میرے ایک پرانے طالب علم شاگرد نے جو اس وقت دفتر خارجہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھے تہران میں ہمارا ان کے ہاں ٹھہرنے کا بندوبست کرا دیا تھا۔وہاں ہمیں قیام و طعام کے علاوہ کار کی سہولت بھی تھی۔تہران کے پاکستانی سفارت خانہ میں پرچم کشائی کی تقریب ہوئی۔ہم بھی اس میں شریک ہوئے۔وہاں سفارت خانہ اس وقت ایک بڑی سی سڑک کے ایک فلیٹ میں تھا۔پرچم کشائی کی تقریب بلڈنگ سے باہر فٹ پاتھ پر ہوئی اور قومی ترانہ بھی بجایا گیا اس تقریب کی وجہ سے

وہاں مقیم کچھ پاکستانی اساتذہ اور طلباء سے ملاقات بھی ہوئی۔تہران اور بغداد میں اور غالباً مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے شہروں میں ٹیکسیاں عموماً فی سواری کے حساب سے چلتی ہیں اور پرائیویٹ گاڑیوں والے بھی کرائے پر سواریاں بٹھا لیتے ہیں۔

ہمیں زاہدان سے کوئٹہ کے لیے ٹرین لینی تھی۔تہران میں ہمیں معلوم ہوا کہ کنارِ آب کا سفر بہت خوبصورت ہے۔پہلے تو ہم صحرا سے گذر کر مشہد پہنچے تھے۔اس مرتبہ سوچا کہ کیسپین سی کے ساتھ ساتھ کنارِ آب کے راستہ سے سفر کیا جائے۔اس کے لیے ہمیں ایک روز انتظار بھی کرنا پڑا اس لیے کہ اس روٹ پر مسافروں کا رش بہت تھا۔یہ واقعی بہت خوبصورت راستہ ہے اور کبھی سمندر کے ساتھ ساتھ اور کبھی پہاڑوں کی بلندیوں سے ہو کر گذرتا ہے۔آگے تہران کا صنعتی علاقہ بھی ہے۔وقت تقریباً دگنا لگا۔راستہ میں کوئی دو درجن سرنگیں آئی ہوں گی۔بہت ہی خوبصورت سفر تھا اور سیر بھی بہت اچھی رہی۔مشہد میں دو تین دن قیام کیا۔وہاں سے زاہدان پہنچے یہاں بھی میرے ایک شاگرد پاکستان کے کونسل تھے۔لیکن انھیں اگلے ہی روز بیرونِ ملک جانا تھا۔فیملی بھی ساتھ ہی تھی۔اس لیے ہمیں ٹھہرنا تو ہوٹل میں پڑا لیکن ان کی وجہ سے یہ فائدہ ہوا کہ ریل میں ہماری سیٹیں بک ہو گئیں جو ہمیں ڈپلومیٹک کوٹے میں سے مل گئیں ورنہ نجانے کتنے روز اور سیٹوں کے ملنے کا انتظار کرنا پڑتا۔

ادھر پاکستان میں اسلام کا بہت زور شور تھا،ہمارے ایک پروفیسر صاحب نے بائرن کی طویل نظم ''ڈان جان'' کی آٹھویں کینٹو میں سے دو سٹینزے نکالے جن میں ان کے خیال کے مطابق اسلامی عقاید کے متعلق کچھ نازیبا باتیں تھیں۔بورڈ آف سٹڈیز میں انھوں نے تجویز کیا کہ ان کو کتاب سے خارج کر دیا جائے۔میں نے گذارش کی کہ ''ڈان جان'' میں تقریباً دو ہزار بند ہیں جو یہاں یقیناً کسی نے نہیں پڑھے ہوں گے پھر یہ سلیبس میں بھی نہیں جس میں اس نظم کی صرف پہلی کینٹو ہے۔ابھی تک تو یہ بند یہاں کسی کی نظر سے نہیں گذرے۔اگر آپ ان کو نکالنے کا نوٹیفکیشن جاری کریں گے تو یہ دو بند تو سب ہی پڑھ لیں

گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔پھر پروفیسر صاحب نے بڑی سفارش کر کے اسے ''پاکستان ٹائمز'' میں شائع کروا دیا۔بعد میں بہت غصہ بھی ہوئے کہ کسی سب ایڈیٹر نے اس کی اصلاح کر دی تھی۔

اس کے بعد نصاب کی تطہیر کا مرحلہ آیا۔شام ہمدرد کی ایک محفل میں میں نے ایک مقالہ پڑھا جس میں واضح طور پر یہ بتایا گیا تھا کہ یونیورسٹی سے بہت سی کتابیں غیر اسلامی قرار دے کر جلائی گئیں۔اس پر بعد میں انتظار حسین صاحب نے ایک کالم بھی لکھا۔بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ایک روز انگریزی کے بورڈ آف سٹڈیز کی میٹنگ بلائی گئی۔بورڈ کے ایک ممبر نے جو ایک مقامی کالج کے پروفیسر تھے اعلان کیا کہ حکومت نصابوں کی تطہیر کرانا چاہتی ہے اور اس کی ذمہ داری ان صاحب کے سپرد کی گئی تھی۔اس پر کافی بحث ہوئی۔تو انھوں نے فرمایا کہ یہ فیصلے ہو چکے ہیں آپ کو صرف ان کی توثیق کرنی ہے۔وہ اختلافی رائے بھی ریکارڈ پر لانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔پہلی تبدیلی یہ تھی کہ بی اے کی کتاب میں جارج ایلیٹ کی ایک نظم تھی جس کے ایک مصرع میں یہ کہا گیا تھا کہ خدا کو بھی نیک لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ان کا اعتراض تھا کہ خدا کو کسی کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ کلمہ کفرانہ ہے۔پھر انھوں نے فرمایا کہ ڈی ایچ لارنس کو بھی کورس سے خارج کر دیا گیا ہے جس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ وہ خون کی بات کرتا ہے۔اب تک بورڈ کے ممبر اس قدر بد دل ہو چکے تھے کہ نہ کسی نے اس اعتراض کی وضاحت چاہی نہ انھوں نے وضاحت کی تیسرے فیصلے نے تو سب کو چونکا دیا۔حکم ہوا کہ جے ایس مل کی ''لبرٹی'' کو بھی نصاب سے نکال دیا گیا ہے۔اس پر مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے کہا کہ آزادی تو اسلام کی روح ہے اسلام آزادی کا سب سے بڑا علم بردار ہے اور اس کتاب میں تو مل صرف معاشرے میں فرد کی آزادی کی بات کر رہا ہے جو اسلام کے اصولوں سے کسی طرح متصادم نہیں ہے تو ان کا جواب یہ تھا کہ زمانے کے تقاضہ کے مطابق اس وقت پاکستان میں شخصی آزادی کی بات مناسب نہیں ہے۔پھر شاید مجھے قائل کرنے کے لیے انھوں نے مزید فرمایا کہ چین میں بھی ''لبرٹی'' کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے

پوچھا کہ یہ چین سے فتوے کب سے آنے لگے؟ اس نظام کو رد بھی کرتے ہیں اور اس کی پیروی بھی کرتے ہیں۔ بہر حال تطہیر ہوگئی۔

مارشل لاء آخر کار ختم ہوا بے نظیر کی حکومت آئی۔ یہ پاکستانی ترقی پسندوں کے لیے سب سے مشکل وقت تھا۔ انھیں تو صرف احتجاجی اور مزاحمتی سیاست آتی تھی۔ اب جب آزادی مل گئی تھی ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ البتہ جو ذرا گہرے سرخ رنگ کے تھے وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔ بالکل ایسی ہی صورت تھی جیسے قیام پاکستان کے وقت ہوئی کہ مسلم لیگ آزادی کی جدوجہد کرتی رہی لیکن یہ نہیں سوچا کہ آزادی مل گئی تو اس کا کریں گے کیا۔ وہ تو اللہ کے کچھ نیک بندوں نے پاکستان بننے کے بعد نظریہ پاکستان تخلیق کرلیا اور اس طرح ترقی پسندوں کو بھی لڑنے جھگڑنے کے لیے ایک بہانہ ہاتھ آیا۔ یہی اب ہوا۔ کچھ لوگوں کو تو پیپلز پارٹی کے خلاف کام کرنے کا بہانہ مل گیا لیکن اس پارٹی کے حمایتوں کی ایک بڑی تعداد کچھ بے بس سی نظر آرہی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ بھٹو کی پھانسی کے وقت کوئی بڑا ہنگامہ نہ ہوسکا۔ عوام مضطرب تھے لیکن قیادت خود کو بالکل بے بس محسوس کررہی تھی۔ ۴ اپریل کی صبح صبح اخباروں میں پھانسی کی خبر چھپی اور سارے ملک پر سناٹا چھا گیا اور بھٹو کی یہ بات بھی صحیح ثابت ہوئی کہ میری موت پر ہمالیہ روئے گا۔ اسی روز میری خالہ کی شادی تھی اور ہم بس کے ذریعہ رینالہ خورد کی طرف جارہے تھے۔ بس میں سناٹا تھا۔ بس کے ڈرائیور نے کہا کہ اس کی بیوی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور وہ روئے جارہی ہے۔ شام کو ہم ریل کے ذریعہ واپس آرہے تھے تو ہم نے PECO کی فیکٹری کی دیوار کے اوپر بڑی تعداد میں مردوں اور عورتوں کو چڑھے ہوئے اور نعرے لگاتے ہوئے دیکھا۔ عجب تذبذب کا دور تھا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ یہی صورت حال بحالی جمہوریت کے بعد بھی قائم رہی۔

....

(۱۴)

قافلہ امن

پھر وہ دور بھی آیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان امن و آشتی کی باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے پاک و ہند فورم برائے امن قائم کیا۔ اس کے اجلاس آگے پیچھے دلی اور لاہور میں ہوئے۔ دانشوروں، صحافیوں اور طالب علموں کے وفود آنے جانے لگے۔ ایک ہندوستانی طالبہ نے بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ پاکستان میں تو عورتیں بالکل ہندوستانی عورتوں کی طرح رہتی ہیں۔ اسی طرح مردوں کے ساتھ ساتھ پڑھتی ہیں۔ دفتروں، کارخانوں میں کام کرتی ہیں اور سیاسی اور سماجی تحریکوں میں شریک ہوتی ہیں۔ انھیں کہیں برقعے نظر نہیں آئے اور کسی میدان میں عورتیں مردوں سے پیچھے نظر نہیں آئیں میں نے انھیں بتایا کہ ہمیں بھی ہندوستان کے متعلق ایسی ہی غلط فہمیاں تھیں۔ ہمیں جو ہندوستان کا تصور تھا وہ اس زمانے کے دوردرشن کا دیا ہوا تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ وہاں سب مرد دھوتی باندھتے ہوں گے اور گاندھی ٹوپی اوڑھتے ہوں گے اور عورتیں ساڑھیاں باندھتی ہوں گی۔ جب کہ صورت حال یہ نظر آئی کہ مرد جینز اور ٹی شرٹ پہنے دکھائی دیے اور دلی یونیورسٹی میں اور کناٹ پلیس میں تو لڑکیاں بھی جینز اور ٹی شرٹ میں نظر آئیں۔

پاک ہند امن کانفرنسوں کے سلسلے میں ہمیں کلکتہ جانے کا موقع بھی ملا۔ اس مرتبہ میری بیوی بھی ہمراہ تھیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی وجہ سے اس امن کے قافلہ کو براستہ واہگہ جانے کی اجازت مل گئی، اس وقت یہ راستہ صرف غیر ملکی مسافروں یا سفارت کاروں کے لیے کھلا ہوا تھا۔ عام پاکستانی ریل کے ذریعہ یا ہوائی جہاز سے ہندوستان کی سرحد عبور کرتے۔ ہندوستان والوں نے بھی بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور ہمیں ۸ مقامات کے

ویزے دے دیے اور ہمیں کہیں پولیس رپورٹ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم لاہور سے بسوں کے ذریعہ صبح کے وقت روانہ ہوئے۔ واہگہ پر بس قافلہ کے آنے اور جانے کے متعلق خصوصی انتظامات کیے گئے تھے۔ سرحد کے ہندوستانی طرف عملہ بہت ناکافی تھا اور وہاں سے فارغ ہوتے ہوتے ہمیں شام ہوگئی۔ امرتسر کی طرف بسیں ہمارے انتظار میں کھڑی تھیں۔ میری بیوی نے بڑی حیرانی سے کہا کہ یہ تو بالکل لاہور جیسا ہے۔ لاہور سے واہگہ کا راستہ بھی بالکل واہگہ سے امرتسر تک کے راستہ جیسا تھا۔ وہی لوگ وہی سڑکیں اور دکانیں اور بالکل اسی طرح کا ماحول۔ ہم سیدھے امرتسر کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ وہاں سے ہمیں کلکتہ کے لیے گاڑی لینی تھی۔ گاڑی کی روانگی میں ابھی دیر تھی اس لیے میں اور میری بیوی رکشہ لے کر سکھوں کے مشہور گوردوارے ''گولڈن ٹیمپل'' دیکھنے چلے گئے۔ سکیورٹی کے عملہ نے سٹیشن پر ہمیں تاکید کی کہ شام کا وقت ہے۔ احتیاط سے کام لیں کہیں کوئی چور ڈاکو نہ پڑ جائیں۔ ہم سٹیشن سے نکل کر رکشہ میں سوار ہوئے تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ ہر جگہ لوگ بڑی خوش اخلاقی سے ملے۔ امرتسر کی چوڑی چوڑی سڑکوں اور کھلے بازاروں سے ہو کر ہم گولڈن ٹیمپل پہنچے۔ یہ ایک بہت ہی وسیع و عریض تعمیر ہے۔ باہر ایک خاص جگہ ہمیں جوتے اتارنے پڑے۔ پھر ہم اندر داخل ہوئے۔ اب شام تقریباً دھندلی ہونی شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ چھتوں کے نیچے برآمدے کی دیواروں پر بڑے خوبصورت نقش و نگار کیے ہوئے ہیں۔ قریب جا کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی اس لیے کہ یہ نقش و نگار نہیں تھے بلکہ چڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ چمٹی ہوئی کنگوروں کے اوپر بیٹھی تھیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ہر طرف چڑیاں ہی چڑیاں تھیں۔ دیواروں پر، منڈیروں پر، درختوں پر، دالانوں میں۔ چڑیاں ہی چڑیاں نقش بہ دیوار بنی بیٹھی تھیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ لاہور کی شاہی مسجد ہو، لندن کا سینٹ پال کا گرجا ہو یا امرتسر کا گولڈن ٹیمپل۔ سب چڑیوں اور کبوتروں کی آماجگاہ ہوتے ہیں یہ ایک عجیب بات ہے کہ پرندوں کو عبادت گاہوں میں سکون ملتا ہے۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ یہ عبادت گاہیں کس

مذہب کس فرقے یا کس قوم کی ہیں۔ ان کے لیے صرف عبادت اہم ہے عبادت کے طریقے اہم نہیں۔ دیو مالائی قصبوں میں بھی پرندوں کا عبادت سے ایک رشتہ نظر آتا ہے۔ شام کے قدیم مندروں میں فاختہ کو تقدس کا مقام حاصل تھا۔ جانوروں میں ایک خاص بات ہوتی ہے جو کاش انسانوں میں بھی ہوتی۔ وہ ہر آنے والی مصیبت۔ آندھی، طوفان یا زلزلے سے سب سے پہلے آگاہ ہو جاتے ہیں اور پریشانی سے اِدھر اُدھر اڑنے لگتے ہیں اور شور مچانے لگتے ہیں۔ اسی طرح عبادت گاہوں کی پرسکون فضا میں وہ نہ جانے کہاں کہاں سے اڑ کر چلے آتے ہیں۔ ہم بھی امن و سکون کا ایک قافلہ لے کر ہندوستان جا رہے تھے۔ ہم ہی جانتے ہیں کہ اس راستے میں کیا کیا دشواریاں حائل تھیں اور کتنے برسوں کی قومی اور بین الاقوامی کوششوں کے بعد ہم اس قابل ہوئے تھے کہ سلامتی کے اس سفر پر جا سکیں۔ اگر ہم پنچھی ہوتے تو نہ جانے کب سے پرسکون جھنڈوں میں اکٹھے ہوتے نہ ہمیں مذہبی اختلافات ایک دوسرے سے ملنے سے روک سکتے نہ جغرافیائی، سیاسی سرحدیں۔ کاش انسان پرندوں سے ہی جینے کے ڈھنگ سیکھ سکتے۔

بہر حال ہم گولڈن ٹیمپل کے خوبصورت اور پرفضا ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پہلی ہی نظر میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ گولڈن ٹیمپل بالکل شیخوپورے کے ہرن مینار کی نقل ہے۔ اسی طرح کی ایک چوکور عمارت ہے جس کے درمیان ایک بڑا سا تالاب ہے۔ تالاب کے بالکل درمیان ایک بارہ دری ہے جس پر ایک خوبصورت سی برجی بنی ہوئی ہے۔ اس بارہ دری میں ہر وقت کیرتن ہوتا رہتا ہے۔ جو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر نشر ہوتا رہتا ہے۔ وہاں سب آنے والوں کو پرشاد یا تبرک بھی دیا جاتا ہے جو ہمیں بھی ملا۔ غالباً حلوہ پوری تھا۔

گولڈن ٹیمپل سے ہم واپس سٹیشن پہنچے۔ وہاں سے ہمارے کچھ ساتھی دلی کی گاڑی میں بیٹھ گئے جو ہم سے کچھ دیر پہلے روانہ ہوئی۔ ہم کلکتہ کی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ دلی

نہیں جاتی تھی۔ ہمارا اپنا ایک ڈبہ تھا جس میں ہم بڑی فراغت سے لیٹے بیٹھے تھے۔ وہاں گرما گرم سیاسی بحثیں بھی ہوتیں۔ قومی بھی اور بین الاقوامی بھی۔ ہمارے ساتھ پولیس گارڈ بھی تھی۔ سفر کے دوران کھانا بڑی بڑی تھالیوں میں دیا جاتا تھا جن میں مختلف کھانے ہوتے تھے مثلاً دال، سبزی، مختلف قسم کی چٹنیاں، دہی اور کچھ میٹھا بھی۔ آرڈر دینے پر انڈے اور گوشت بھی مل جاتے تھے۔ تقریباً ہر گاڑی میں ایسا ہی کھانا ملتا تھا۔ ہندو مسلمان کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی تھی۔ اسی طرح لباس سے بھی ہندو مسلمان کا فرق پتہ نہیں لگتا۔ بقول قرۃ العین حیدر۔ ایک سٹیشن سے ایک خاندان ریل میں سوار ہوا تو سامان میں ایک لوٹا بھی تھا جس سے لگا کہ یہ مسلمان خاندان ہے۔ گویا ہندوستان میں اب مسلمان کی پہچان صرف لوٹا رہ گیا ہے۔

رات بھر گاڑی پنجاب میں چلتی رہی اور صبح ہوتے ہوتے ہم اتر پردیش میں داخل ہوگئے۔ یہاں اکثر ریلوے سٹیشنوں کے نام جانے پہچانے تھے۔ لکھنؤ، بنارس، پٹنہ راستے میں آئے۔ ایک سٹیشن پر ہمیں کئی گھنٹے ٹھہرنا پڑا اس لیے کہ آگے ایک زبردست حادثہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ ۲۴ گھنٹے کا یہ سفر ۳۶ گھنٹے میں طے کر کے ہم کلکتہ پہنچے۔ وہاں سٹیشن پر ہمارے استقبال کے لیے لوگ موجود تھے۔ کلکتہ کے ایک قدیم تاریخی ہوٹل میں ہمیں ٹھہرایا گیا یہ گریٹ ایسٹرن ہوٹل غالباً اٹھارویں صدی کا بنا ہوا ایک تاریخی ہوٹل تھا یہاں اونچی چھتوں والے بڑے بڑے وکٹورین سٹائل کے کمرے تھے اور ویسا ہی فرنیچر تھا۔ یہ کلکتہ کا پوش علاقہ ہے۔ ایک طرف رام تلہ کا بازار اور دوسری طرف گورنر ہاؤس اور کچھ فاصلہ پر کرکٹ سٹیڈیم ہے۔ لیکن یہاں بھی خاصی بدنظمی کا عالم تھا۔ فٹ پاتھوں پر، جو کافی چوڑی چوڑی تھیں۔ ناریل بیچنے والے بیٹھے ہوئے تھے اور دوسرے لوگوں نے بھی چھوٹے چھوٹے فرش بچھا کر ان پر مختلف قسم کی دکانیں لگائی ہوئی تھیں۔ خاصی گندی اور تاریک جگہ تھی۔ البتہ ٹیلیفون کی سہولت بہتر تھی اور صرف ۳۰ روپے میں لاہور بات ہو جاتی تھی۔ یہاں زیادہ تر بسیں کراچی کی اکثر بسوں کی طرح بدنما ہیں اور اکثر بہت پرانی اور ٹوٹی پھوٹی ہیں۔ ہوٹل کے مین ہال میں پاک و ہند امن

کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے لوگ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ افتتاحی تقریب کے بعد سب ہندوستانی پاکستانی مندوبین کو مختلف کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا، ادبی اور ثقافتی کمیٹی میرے حصہ میں آئی۔ سب کمیٹیوں نے اپنے اپنے ریزولوشن پاس کیے۔ ہماری کمیٹی نے سفارش کی کہ دونوں ممالک کے درمیان کتب کی فراہمی کا انتظام کیا جائے۔ دانشوروں، فنکاروں اور طالب علموں کو آزادی سے آنے جانے کی سہولت میسر ہو اور ثقافتی تبادلوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

سہ پہر کو ہم کچھ لوگوں کے ساتھ نکلے اور مٹیا برج جانے کا پروگرام بنایا جہاں سلطنت اودھ کا آخری تاجدار ابدی نیند سو رہا ہے۔ ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور کچی آبادیوں سے ہوتے ہوئے بس کے ایک طویل سفر کے بعد ہم دریائے ہُگلی کے کنارے مٹیا برج پہنچے۔ یہاں منظر بہت عبرت ناک تھا۔ ایک تنگ سے بازار میں ایک معمولی سی عمارت میں ایک امام بارگاہ ہے جہاں ہر چیز رو بہ زوال ہے۔ پرانے علم ایک آدھ ضریح جن کا رنگ اتر چکا تھا۔ پردے اور قالین جو کبھی بہت شاندار ہوں گے اور دو ممبر۔ ایک لکڑی کا دوسرا سنگ مرمر کا ۔ سنگ مرمر کا یہ ممبر بھی کافی میلا ہو چکا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس سنگ مرمر کے نیچے واجد علی شاہ دفن ہیں اور یہی جگہ مٹیا محل کہلاتی ہے۔ وہاں ایک دو لوگ بہت پتلی سی دھوتی باندھے اور ایسی ہی ایک قمیض پہنے خود کو اس جگہ کا مجاور کہتے تھے۔ ہر طرف بے رونقی اور اداسی تھی۔ وہاں انگریزی اور ہندوستانی سرکار کی طرف سے انگریزی اور اردو میں کچھ کتبے بھی لگے ہوئے تھے جو واجد علی شاہ کی زندگی کے متعلق تھے۔

یہ مسلمان آبادی کا علاقہ ہے اور یہاں غربت اور پسماندگی واضح طور پر نظر آتے تھے لوگوں نے بتایا کہ اس جگہ کی مناسب دیکھ بھال کے لیے ان کے پاس کوئی فنڈز نہیں تھے اور خود بھی بہت ہی غربت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اس امام بارگاہ سے کچھ دور لوگوں نے ہمیں ایک اور جگہ بھی دکھائی جہاں ایک مکان کی بنیادیں کھودتے ہوئے علم کا پنجہ زمین پر نکلا تھا محلہ

والوں نے اسے ایک معجزہ سمجھ کر وہاں بھی ایک امام باڑہ بنا دیا تھا۔

ہم ہوٹل واپس پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے کچھ ساتھی ماتھے پر تلک لگائے اور عورتیں ساڑھیاں پہنے ہوئے آ رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہندو بن کر کالی کے مندر گئے تھے جہاں انھوں نے کالی دیوی کے سامنے دی جانے والی قربانیوں کے ہولناک مناظر دیکھے۔ انھوں نے بتایا کہ سارا ماحول بکریوں کا بہتا خون، قربانی کی رسمیں ادا کرنے والے سرخ آنکھوں اور کالی رنگت کے پجاری ایک ایسا ہیبت ناک منظر پیش کر رہے تھے جس کی دہشت ابھی تک ان کے چہروں سے نمایاں تھی انھوں نے سختی سے ہمیں تاکید کی کہ ہم وہاں بالکل نہ جائیں۔

اگلے روز ہم بس لے کر ہاوڑہ پل پر گئے۔ اس سے زیادہ غلیظ اور مکروہ جگہ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ سوکھے سڑے آدھے ننگے کالے جسموں والے مرد، عورت اور بچے گلے سڑے پھل بیچ رہے تھے خصوصاً ناریل اور لوگ وہیں کھا کر ان کے چھلکے بے پرواہی سے پھینک رہے تھے۔ پل کی سیڑھیوں کے نیچے بلا کی بدبو تھی۔ یہ عظیم پل کسی زمانے میں انجینیر تک کا معجزہ سمجھا جاتا تھا اور ہزاروں ٹن لوہے سے بنا ہوا تھا۔ نیچے ایک عظیم دریا بہتا ہے جس میں چھوٹی بڑی کشتیاں بھی چلتی ہیں۔

کلکتہ میں وکٹوریا میموریل بھی ہے جو نوآبادیاتی دور کی ایک یادگار ہے۔ رام تلا کا علاقہ جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے وکٹورین طرز پر بنا ہوا ہے اور پہلی نظر میں اس کے اندر لندن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مگر یہاں عمارتیں کافی پرانی اور بوسیدہ ہو چکی ہے اور ان کی دیکھ بھال بھی غالباً نہیں ہوتی۔ دوسری طرف رام تلہ کا بازار ہے جو عام طرز کا ایک بازار ہے لیکن اس کا ایک حصہ کچھ جدید انداز کا ہے۔ یہاں ابھی تک سائیکل رکشا کے علاوہ ہاتھ سے کھینچنے والی رکشائیں بھی چلتی ہیں کمزور سے نحیف لوگ جن میں کچھ بوڑھے بھی تھے ان رکشاؤں کو کھینچتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دلی میں آزادی کے وقت ایسے رکشے چلنے شروع ہو گئے

تھے۔ ایک روز میں نے یہ بھی دیکھا کہ ڈفرن برج پر چڑھتے ہوئے ایک رکشا سواریوں کے بوجھ سے پیچھے کو جھک گیا اور رکشا چلانے والا اوپر لٹک گیا۔ رکشا بڑی ظالمانہ اور غیر انسانی سواری ہے۔ ویسے تو یہاں پہلے زمانے میں ڈولیاں بھی تھیں اور پالکیاں بھی جنھیں کہار اٹھاتے تھے۔ لیکن وہ عام طور پر تھوڑے فاصلوں تک جاتی تھیں اور ڈولی کو دو جب کہ پالکی کو چار کہار اٹھاتے تھے۔ وہ شاید اتنا مشکل نہ ہو۔ مگر ایک آدمی کو گاڑی میں بیل کی طرح جتا ہوا اور دو موٹی موٹی سواریوں کو کھینچتے ہوئے دیکھنا بڑا تکلیف دہ تجربہ تھا۔ ان رکشا کھینچنے والوں پر رحم بھی آتا تھا اور ایک طرح سے یہ خوش قسمت بھی تھے کہ اس غربت اور بے روزگاری کے دور میں ان کے پاس کم از کم ایک روزگار تو تھا۔ پھر ان کے کرائے بھی چونی اٹھنی ہوتے تھے ہم بھی صرف تجربہ کے طور پر، چند قدم کے لیے ایک رکشے میں بیٹھے۔

رام تلہ کے قریب ہی مسلمانوں کا ایک محلہ ہے۔ یہاں ایک بڑا سا مدرسہ بھی ہے اور مسجد بھی اور ایک ہال بھی ہے۔ ایک رات وہاں کے لوگوں نے پاکستان سے آنے والوں کے اعزاز میں ایک مشاعرہ کا بندوبست بھی کیا۔ کلکتہ کے شعرا نے اور کچھ پاکستانیوں نے بھی اپنے کلام سنائے۔ وہاں یہ بھی پتہ لگا کہ کلکتہ سے کوئی ایک درجن اردو اخبارات بھی شائع ہوتے ہیں۔ البتہ ہم نے محسوس کیا کہ وہاں یہ لوگ کچھ خوش نہیں تھے اور سہمے سہمے سے رہتے تھے۔ ایک دو نے وہاں کے مشکل حالات کی شکایت بھی کی۔ یہ بھی بتایا کہ یہاں مسلمانوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ افتتاحی تقریب میں کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی جو اسی مسلمانوں کے محلہ میں رہتے تھے اور وہاں ان کی دکانیں تھیں ہم نے ان سے بازار کے متعلق کچھ معلومات چاہیں تو دو جوانوں نے پیش کش کی کہ ان کی دکانیں اسی بازار میں ہیں اور وہ خود ہمیں وہاں لے جائیں گے۔ لیکن بعد میں وہ تین روز تک ہمیں کہیں نظر نہیں آئے۔ البتہ واپسی کے وقت سٹیشن پر ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ انھیں خدشہ تھا کہ خفیہ پولیس ان پر نظر رکھے ہوئے تھی اس لیے وہ ہم سے دور دور ہی رہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ سونی پت میں بھی

پیش آیا تھا جہاں اپنے پرانے آبائی گھر کے قریب ایک نیا ٹیوب ویل لگ گیا تھا۔وہاں دو لڑکے مکینک کے طور پر کام کر رہے تھے۔ہم نے ٹیوب ویل اور اپنے گھر کے ساتھ ان کی تصویر لی اور کہا کہ پاکستان جا کر ہم یہ تصویر انھیں بھیج دیں گے اس پر ایک اور شخص نے جو وہیں کھڑا ہوا تھا کہا کہ اگر پاکستان سے آپ نے انھیں خط لکھا تو پولیس ان کے پیچھے پڑ جائے گی۔مجھے معلوم نہیں لیکن شاید پاکستان میں بھی ہندوستانیوں کے متعلق ایسا ہی رویہ ہو۔کلکتہ میں پہلے ہمیں بنگال کے ایک وزیر نے دعوت پر بلایا۔یہ شاید کوئی پارک تھا اور ماحول بہت ہی عوامی قسم کا تھا۔اس موقع پر کچھ اور وزیر اور سرکاری حکام بھی موجود تھے۔تقاریر بھی ہوئیں۔ہمارے میزبان وزیر نے خواہش ظاہر کی کہ ہندوستان اور پاکستان میں اس قدر دوستی اور خیر سگالی کا جذبہ ہوتے ہوئے کیا ہی اچھا ہو کہ دونوں ملک بھی ایک ہو جائیں۔ڈاکٹر مبشر حسن نے جوابی تقریر میں کہا کہ ابھی تو لوگوں کو اپنے اپنے حالات سدھارنے ہیں۔ہندوستان والوں سے ہندوستان کے مسائل حل نہیں ہو رہے ہیں اور پاکستانی اپنے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔پہلے ہم اپنے اپنے ملکوں کو سنواریں پھر آپس میں ایک ہونے کی بات کریں ۔یوں ڈاکٹر مبشر نے وزیر موصوف کی تجویز رد بھی نہیں کی اور بڑی خوبصورتی سے ان کے مشورے کا جواب بھی دے دیا۔

اسی طرح گورنر بنگال نے بھی ہمیں رات کے کھانے کی دعوت دی۔یہ بھی ایک سادہ سی دعوت تھی۔کھانے بہت سے تھے جن میں زیادہ تعداد مختلف قسم کی بنی ہوئی مچھلیوں کی تھی۔لیکن نہ تو صوبائی وزیر کی دعوت میں نہ گورنر کی دعوت میں وہ شان و شوکت تھی نہ وہ رکھ رکھاؤ تھا جو ہمارے ہاں گورنر ہاؤس یا ایوان صدر میں نظر آتا ہے۔اس دعوت میں مختلف لوگوں کے علاوہ بنگال کے وزیر اعلیٰ جوتی باسو بھی تھے میں نے ان سے پوچھا کہ برسوں سے یہاں بائیں بازو کی حکومت ہے لیکن ہندوستان میں سب سے زیادہ غربت اور گندگی بھی اسی صوبہ میں نظر آتی ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ اول تو ان کی زیادہ تر توجہ دیہات پر رہی ہے اور

وہاں بہت تبدیلی آئی ہے۔دوسرے شہری مسائل کے حل کے لیے بہت سرمایہ درکار ہے اور مرکزی حکومت بنگال کی ترقی پر کوئی توجہ نہیں دیتی۔اسی دعوت میں ٹاٹا خاندان کی ایک خاتون بھی تھیں۔جو زیادہ عمر کی نہیں تھیں بلکہ پاکستانی ڈیلیگیشن میں شامل خواتین کی ہم عمر ہی تھیں۔انھوں نے پاکستانی خواتین کو اپنے ہاں دعوت دی۔اگلے روز ان کی گاڑی آئی اور چھ سات خواتین کو ان کے گھر لے گئی یہ ایک بہت خوبصورت، بڑا سا محل نما گھر تھا۔وہاں اس خاتون نے ان مہمانوں کو سبز چائے ڈبے اور کچھ ایمبرائیڈری وغیرہ تحفہ کے طور پر دی اور بڑی پر تکلف ضیافت بھی کی۔یوں اب خواتین نے غریب ترین سے لے کر امیر ترین لوگوں کی زندگی کو براہِ راست دیکھا۔

کلکتہ یونیورسٹی میں بھی ہمارے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا اور اسی میں کچھ دوسرا ورایٹی پروگرام ہوا۔ماحول بہت خوبصورت تھا اور بڑا لطف آیا۔کلکتہ کے شہریوں کی طرف سے بھی ایک ورایٹی پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔اس میں بڑے خوبصورت ڈانس پیش کیے گئے اور مشہور نغمہ نواز بوپن سرکار نے سامعین کو اپنے نغموں سے محظوظ کیا۔بنگال کا جادو سر چڑھ کر بولا۔بنگال کے فن سے ہمارا تعلق فلموں کی حد تک تھا۔نیو تھیٹرز نے صرف تفریح ہی فراہم نہیں کی تھی بلکہ ذوق کی تربیت بھی کی تھی۔وہاں ہال میں بیٹھ کر رقص و نغمہ کی اس محفل میں ماضی کے نغمے بھی کانوں میں گونجنے لگے۔کے سی ڈے پنکھج ملک پہاڑی سانیال۔کانن دیوی کے سریلے نغمے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔کلکتہ کا قیام بہت رنگا رنگ اور با مقصد تھا۔وہاں سب کچھ نظر آیا لیکن غالب کی ''وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے'' نظر نہیں آئیں۔یہاں آخری پروگرام امن کا جلوس تھا جو ہندوستانی اور پاکستانی مندوبین نے مل کر نکالا اور کلکتہ کے عام شہریوں نے بھی اس کا کھل کر استقبال کیا۔

کانفرنس کے اختتام پر فورم کی ذمہ داری ختم ہوگئی اور سب مندوبین کو ان کے ٹکٹ دے کر واپسی کا بندوبست اپنے اپنے طور پر کرنے کی آزادی دے دی۔واپسی ہندوستان کی

مشہور ریل راجدھانی ایکسپریس سے ہوئی۔ بے پناہ ہجوم تھا ہم گاڑی میں سوار ہو گئے لیکن سیٹوں کا بندوبست کرتے کرتے کئی گھنٹے لگ گئے۔ ہندوستان میں ٹرینوں کا نظام پاکستان سے بہتر ہے۔ سیٹیں تو تقریباً ایسی ہی ہیں جیسے یہاں نایٹ کوچ میں ہوتی ہیں البتہ وہ بستر بھی دیتے ہیں جو صاف ستھرا ہوتا ہے اور صبح کا ناشتہ بھی اس کے علاوہ سہ پہر کی چائے بھی۔ مسافروں کے لیے یہ بڑی سہولت ہے لیکن ریلوے والوں کے لیے کاروبار بھی اچھا ہے۔ بستروں اور چائے وغیرہ کے اخراجات ٹکٹ میں شامل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو کاروبار کرنا آتا ہے۔ وہ ایک ہی ٹکٹ میں تین کاروبار کرتے ہیں۔ ریل کا کرایہ بستر کا کرایہ اور کیٹرنگ۔

دلی میں کچھ روز ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن ابھی تک بندوبست کوئی نہیں تھا۔ کلکتہ میں ہی ستیہ پال سے ملاقات ہو گئی تھی۔ یہ لالہ لاجپت رائے کے نام پر قائم ہونے والی ایک تنظیم کے مینجر ہیں۔ اس تنظیم کے آشرم اور دوسرے ادارے پورے ملک میں قائم ہیں۔ ستیہ پال صاحب نے ہمیں نئی دلی کے لاجپت نگر میں قائم لاجپت بھون میں ٹھہرنے کی دعوت دی۔ البتہ دلی پہنچ کر ہم انور کمال صاحب کی ایک کزن کے ہاں ٹھہرے۔ یہ جامع ملیّہ کے قریب ایک فلیٹ میں مقیم تھیں اور بہت موڈ Mod تھیں۔ یہ فلم اور ایڈورٹائزنگ کے شعبہ سے متعلق تھیں اور اس وقت بھی کسی ڈوکومینٹری پر کام کر رہی تھیں۔ وہاں ان کے منگیتر سے بھی ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ ان کے خاندان کی بزرگ خواتین اب بھی برقعے اوڑھتی ہیں جب کہ وہ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھیں۔ فلیٹ اچھا تھا لیکن معلوم ہوا کہ اس وقت پراپرٹی کی قیمتیں لاہور سے زیادہ تھیں۔ ایک رات وہاں قیام کے بعد ہم لاجپت نگر آ گئے۔ یہ ایک بہت بڑا گیسٹ ہاؤس ہے جہاں ستیہ پال صاحب نے اور بھی لوگوں کو مدعو کیا ہوا تھا۔ یہاں طعام و قیام کا بہت اچھا انتظام تھا۔ ستیہ پال اپنی بیوی کے ساتھ وہاں رہتے ہیں۔ جب کہ ان کے بچے امریکہ میں ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہم میاں بیوی کو اپنے ہی گھر ٹھہرا لیا اور میزبانی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ لیکن جب وہ پاکستان آئے تو ہم نے بھی ان کی دعوت کرنی چاہی لیکن لگتا تھا کہ سارا

لاہور ہی ان کا عقیدت مند ہے ہمیں صرف ایک دوست کی ایک محفل میں ان کے ساتھ چند لمحے گذارنے کا موقع ملا۔

لاجپت ٹرسٹ کے دفاتر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں کھلے ہوئے ہیں اور ستیہ پال اس ٹرسٹ کے سیکرٹری ہیں۔ ان کے ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے سماجی کارکنوں سے ملاقات ہوئی۔ خصوصاً جنوبی ہند کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے اپنے خلوص، اتھاہ لگن اور انسانیت کی خدمت کے جذبے سے سب کو ہی متاثر کیا۔

چوں کہ اس سفر میں بیوی ساتھ تھیں اس لیے انھیں ساری دلی تفصیل سے دکھائی کشمیری گیٹ پر اپنا گھر، موری گیٹ میں میرا اسکول، کچھ عزیزوں کے گھر، فتح پوری، چاندنی چوک اور جامع مسجد کے علاقے دکھائے۔ پھر ہم آثار قدیمہ کی سیر کو نکلے۔ پرانا قلعہ، ہمایوں کا مقبرہ، نظام الدین اولیاء اور قطب مینار ۱۹۷۶ء میں ہمایوں کا مقبرہ محض ایک کھنڈر تھا جیسے کہ ہم ۱۹۴۷ء میں چھوڑ کر آئے تھے۔ لیکن ۱۹۹۶ء میں اسے اس کی اصلی صورت میں بحال کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح جامع مسجد جو پہلے کافی شکستہ نظر آتی تھی اب اچھی حالت میں تھی۔ خواتین کہیں بھی جائیں شاپنگ ضرور کرتی ہیں۔ ہم نے بھی شاپنگ کی کلکتہ میں بھی اور دہلی میں بھی۔ یہاں بھی ہمیں اندازہ ہوا کہ ہندوستانی بڑے پکے کاروباری لوگ ہیں۔ چاندنی چوک کی ایک بہت بڑی دکان سے ایک نہایت معتبر قسم کے آدمی نے بڑے سلیقہ سے ہمیں دکان میں آنے کی دعوت دی۔ ہم نے کہا کہ ہمیں کچھ خریدنا نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ خریدنے کو آپ سے کون کہتا ہے۔ آپ اس دیس میں ہمارے مہمان ہیں۔ ہم تو آپ کو کچھ چیزیں دکھانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بے حد اصرار کے بعد ہم آخر دکان میں چلے گئے اور وہاں انھوں نے ہمارے سامنے تھان پر تھان کھول دیے۔ ہم نے پھر معذرت کی کہ ہمیں کچھ لینا نہیں ہے۔ مگر وہ کپڑے دکھاتے رہے اور آخر کوئی دس ہزار روپے کی خریداری کر کے باہر نکلے، بیوی کا خیال تھا کہ اچھا سودا ہو گیا بہت ہی خوش اور مطمئن تھے۔ اس کے مقابلے میں انارکلی یا لبرٹی کی کسی دکان میں

جائیں اور ذرا سی رعایت چاہیں تو دکان دار ناراض ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہیں اور دیکھیے۔دلی سے واپسی پر بڑی دقت پیش آئی۔ کسی گاڑی میں کوئی جگہ نہیں ملی۔ بہت بھاگ دوڑ کے بعد بسوں کا رخ کیا۔لال قلعہ کے قریب سے بسیں چلتی تھیں۔ایک بس میں بمشکل جگہ ملی۔رات کا وقت تھا۔ہم نے اسے غنیمت جانا۔کوئی رات کے دس بجے بس روانہ ہوگئی بس مت پوچھیے برا حال تھا۔سیٹوں کے آگے ٹانگیں رکھنے کی جگہ بھی نہیں تھی اور ہم تقریباً اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔۴۵ سیٹوں کی بس میں کوئی ۷۰ سیٹیں لگائی ہوئی تھیں لیکن یہ بھی غنیمت تھی اس لیے کہ اگر اتنی فالتو سیٹیں نہ ہوتیں تو ہمیں جگہ نہ ملتی۔ہم اسی اطمینان میں بیٹھے تھے کہ صبح ہوتے ہی امرتسر پہنچ جائیں گے۔لیکن کوئی پانچ میل چل کر بس رک گئی اور جب بس کو وہاں کھڑے ہوئے ایک گھنٹہ گذر گیا تو چند سکھ نوجوانوں کو بڑی تشویش ہوئی انھیں صبح دفتروں میں حاضر ہونا تھا۔کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ بس کیوں رکی ہوئی ہے اور کب چلے گی۔آخر بڑی کوششوں کے بعد کچھ لوگ یہ جان پائے کہ بس کا روٹ پرمٹ ہی نہیں ہے۔اس لیے بس وہاں سے روانہ ہی نہیں ہوسکتی۔بالآخر کوئی دو گھنٹے کے بعد بس وہاں سے روانہ ہوگئی۔غالباً لے دے کر کچھ فیصلہ ہوگیا تھا۔رات بھر سفر کرنے کے بعد صبح کے وقت امرتسر پہنچے اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ہم چوں کہ امرتسر پہلے ہی گھوم چکے تھے اس لیے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے میں ہمیں کوئی دلچسپی نہیں تھی چنانچہ ہم رکشہ لے کر سرحد پر پہنچ گئے۔جانے سے پہلے میں نے اپنے ایک دوست کو ٹیلیفون کر دیا تھا جس نے واہگہ پر گاڑی بھیج دی تھی۔کسٹم امیگریشن وغیرہ پر سرحد کے دونوں طرف کوئی وقت نہیں لگا۔ہندوستان کے کسٹم ہاؤس سے ایک پورٹر نے ہمیں سرحد پر پہنچایا۔وہاں بھارتی امیگریشن کے افسران نے پھر ہمارے پاسپورٹ چیک کیے اور پوچھا کہ کچھ ہندوستانی کرنسی ہمارے پاس ہے۔میرے پاس کوئی تیس چالیس روپے بچے ہوں گے میں نے وہ ان دونوں اہلکاروں کو دے دیے۔پورٹر نے کہا کہ یہ پیسے اسی کو دے دیے ہوتے۔بعد میں مجھے اس کا افسوس ہوا۔شاید پورٹر کی ضرورت زیادہ ہو۔یوں ہندوستان کا دوسرا سفر بھی ختم ہوا۔

اس کے بعد پاک و ہند فورم کا اجلاس پشاور میں ہوا اور اس میں ہندوستان سے آئے ہوئے دوستوں سے پھر ملاقات ہوئی۔جن میں کچھ نئے تھے اور کچھ پرانے۔پشاور کے بعد دو کانفرنسیں بنگلور اور کراچی میں ہوئیں جن میں اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکا اور اس کا مجھے بہت افسوس رہا۔لیکن بعد میں ہندوستان سے طلباء اساتذہ اور سماجی کارکنوں اور دانشوروں کے وفد آتے رہے اور فضا میں ایک طرح کا ہلکا پن محسوس ہونے لگا۔

میرے ایک شاگرد پشاور میں طعینات تھے۔انھوں نے مجھے سوات کی سیر کی دعوت دی۔اس سے پہلے جب وہ ایبٹ آباد میں ڈپٹی کمشنر اور بعد میں کمشنر لگے تب بھی انھوں نے ہمیں کافی سیریں کرائیں۔اس مرتبہ منگورے میں ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا۔ہم ایک بڑے اچھے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے اور ایک پجیرو بھی ہمارے لیے مہیا کی گئی جس میں ہم نے کافی دور دور تک سیریں کیں اور مالم جبہ بھی گئے۔ایک بات کا مجھے کچھ افسوس بھی ہوا۔مدائن پر دو آبشاریں ملتی ہیں۔سوات کے گذشتہ سفر میں یہ مقام وہاں کی خوبصورت ترین تفریح گاہ تھا۔لیکن وہاں اب اس قدر دکانیں اور ہوٹل بن گئے جن کے پیچھے یہ آبشاریں بالکل چھپ گئی تھیں۔مادی فائدے نے قدرتی حسن کو بالکل تباہ کر دیا ہے۔شکر ہے کہ کالام ابھی تک ویسا ہی خوبصورت اور پرسکون ہے۔پھر جب سویت یونین کا شیرازہ بکھرنے لگا تو مجھے پشاور یونیورسٹی کے سنٹر فار سنٹرل ایشین سٹڈیز سے سنٹرل ایشیا کے ادب پر ایک مقالہ لکھنے کی دعوت ملی۔چنانچہ میں نے مقالہ لکھا اور فیملی کے ساتھ پشاور پہنچا۔ٹھہرنے کا بندوبست یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں تھا۔سمرقند اور بخارا ویسے ہی ہمارے لیے الف لیلوی نام ہیں۔پھر تاشقند،فرغانہ وغیرہ کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔میں نے وسط ایشیا کے افسانوی اور شعری ادب اور کچھ تاریخی معلومات کی روشنی میں جو مقالہ لکھا اسے کافی سراہا گیا،وہاں مجھ سے پوچھا گیا کہ گلاس نوخت اور پریسٹو روائیکا کے بعد اب پاکستان کے ترقی پسندوں کا کیا حال ہے۔میں نے کہا کہ برا ہی حال ہے یہ لوگ سخت تذبذب میں گرفتار ہیں۔صفدر میر صاحب کا

خیال تھا کہ یہ سب سی آئی اے کی سازش ہے۔ دوسرے تجزیہ نگار روس کی اقتصادی پالیسیوں کو اس ٹوٹ پھوٹ کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں کوئی مقامی یا indigenous تحریک تو تھی ہی نہیں۔ یہاں ترقی پسندی کا سارا زور نظریاتی بحثوں پر تھا۔ عملی جدوجہد کم تھی۔ اس کی ایک جھلک میں نے ہشت نگر کی مزدور کسان کانفرنس میں دیکھی۔ کیا کیا عظیم دیہی دانشور وہاں ملے تھے۔ یہی حال ہم پنجاب یونیورسٹی کے بائیں بازو کے دانشوروں میں بھی دیکھ چکے تھے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہاں کی ساری ترقی پسند تحریک اعلیٰ طبقوں کے دانشوروں کے ہاتھ میں تھی اور وہ دانشوری ہی کر سکتے تھے۔ بقول سجاد ظہیر۔

> ہم کیا کر سکتے تھے۔ محنت مزدوری ہم سے ہو نہیں سکتی تھی۔ ہم نے کوئی ہنر بھی نہیں سیکھا تھا اور یوں بھی ہم ایک استعماری حکومت کی خدمت نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے لیے میدان ہی کون سا بچا تھا۔

ویسے بھی ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی بنیاد لندن میں رکھی گئی تھی۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کے مراعات یافتہ طبقہ کے بیٹوں بیٹیوں کی تحریک تھی۔ اس کی بنیادیں روسی، فرانسیسی اور انگریزی دانشوروں کی تحریریں تھیں۔ ''آکسفورڈ آؤٹ لک'' اور ''کیمبرج لیفٹ'' ان کے محرک تھے۔ عوام سے یہ دوری ایک طرح سے ترقی پسندوں کے لیے مفید بھی تھی اور انھیں کانگرس کے سوشلزم یا جواہر لعل نہرو کے سوشلزم کے قریب لے آئی تھی۔ اگر ترقی پسند تحریک کی بنیادیں محنت کش عوام میں ہوتیں تو اسے زبردست حکومتی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا لیکن چونکہ اس کی بنیاد نوکر شاہی اور پیشہ ورانہ طبقوں میں تھی اس لیے اسے تخریب کاری کے بجائے جدیدیت سمجھ کر برداشت کر لیا گیا۔ ایک طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسندی اونچے طبقہ میں فیشن بن گئی تھی اور اس کی حیثیت ذہنی عیاشی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا انقلاب کتابی انقلاب تھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ خصوصاً پاکستان میں ترقی پسندی ایک منفی رویہ کے طور پر ابھری۔ یہاں کے

ترقی پسندوں کو ترقی پسندی میں اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنا انھیں ملائیت سے خوف تھا۔ یعنی یہاں ترقی پسندی کا تصور آزاد خیالی یا لبرلزم سے زیادہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سوویت یونین کے انتشار کے بعد پاکستان میں ترقی پسندی کی بنیاد مسمار ہو گئی تھی۔

پشاور میں قیام کے دوران یونیورسٹی میں سیمنار میں مقالہ پڑھنے اور کچھ خرید و فروخت کے علاوہ دوستوں سے بھی ملاقات رہی۔ کچھ یونیورسٹی میں تھے اور کچھ بیوروکریسی میں۔ میرے شاگرد اب سرحد ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے چیرمین تھے اور ان کی طرف سے مجھے خیبر پاس کی سیر کی دعوت ملی۔ چنانچہ ایک پولیس ایسکورٹ کے ساتھ ہم خیبر پاس کی طرف روانہ ہوئے۔ اب سے کوئی ۴۰ برس پہلے میں لنڈی کوتل گیا تھا تو وہ ایک دیہاتی منڈی کی طرح لگتا تھا۔ جہاں بڑی بڑی قیمتی چیزیں، مثلاً گھڑیاں، الیکٹرونک کا سامان اور کیمرے ٹوکریوں میں رکھے ہوتے تھے اور کھانے پینے کے عام سے ڈھابے تھے، لیکن اب وہاں شاپنگ پلازہ اور ہوٹل بن گئے تھے لیکن وہاں کوئی زیادہ ہلچل یا پہلی سی رونق نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام تجارت اب پشاور منتقل ہو گئی ہے۔ راستہ میں ہم فرنٹیر رائفلز کے ہیڈ کوارٹرز گئے اور کھانے کا آرڈر دے کر جمرود چلے گئے۔ جمرود کی سرحدی چوکی پر عموماً دو قسم کے مسافر دیکھنے میں آئے یا گدھوں پر بیٹھے ہوئے اور ان کے ساتھ چلتے ہوئے قبائلی لوگ یا بڑی بڑی گاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے غیر ملکی لوگ۔ دونوں طرف دور دور کھڑی ہوئی ایک آدھ بس بھی نظر آئی۔ پشاور سے آنے والی ریلوے لائن لنڈی کوتل پر ہی ختم ہو جاتی ہے اور ہفتہ میں دو روز چلتی ہے۔ اس میں مسافر نہ صرف گاڑیوں کی چھتوں پر بلکہ انجن تک پر چڑھے ہوتے ہیں۔

واپسی پر ہم دوپہر کے کھانے کے لیے نوآبادیاتی میس میں اترے۔ یہاں ابھی تک وہی نوآبادیاتی ماحول ہے۔ سالم بکرا روسٹ کیا گیا اور مختلف قسم کے کھانے ہمارے لیے تیار کیے جو بہت ہی باسلیقہ اور پرتکلف لباسوں میں ملبوس بیروں نے ہمیں بڑی نفاست سے پیش کیے۔ یہ بھی ایک خوبصورت تجربہ تھا۔

(۱۴)

اٹلانٹا سے نیو یارک

سرحدی علاقہ جات کی یہ سیریں اس طرح ختم ہوئیں۔

اب بچے بڑے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ بڑے صاحب زادے علی عابدی صاحب صحافی بن گئے اور The News لاہور میں سب ایڈیٹر ہو گئے۔ بیٹی، زہرہ نے سول انجینیر نگ میں آنرز کے ساتھ امتحان پاس کیا اور اس کی شادی کر دی گئی۔ چھوٹے صاحب زادے، صفدر علی امریکہ چلے گئے جہاں میری والدہ چھوٹے بھائی مہدی عابدی کے ساتھ پہلے ہی سے مقیم تھیں۔ صفدر صاحب نے اٹلانٹا میں جارجیہ ٹیک سے کمپیوٹر سائنس میں .B.Sc کیا۔ اسے وہاں گئے ہوئے اب تین برس ہو گئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ والدین اس سے ملنے آئیں چنانچہ ہم نے اٹلانٹا جانے کا پروگرام بنایا۔ سستی ترین ایر لائن کا انتخاب کیا جس کی وجہ سے ہمیں ۴ گھنٹے ابوظہبی میں ۸ گھنٹے لندن میں اور چار گھنٹے شکاگو کی ایر پورٹس پر رکنا پڑا اور یوں کوئی چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد اٹلانٹا پہنچے۔

اٹلانٹا زیادہ پرانا شہر نہیں ہے لیکن اب بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی جارجیہ ٹیک امریکہ کی صفِ اول کی یونیورسٹیوں میں شمار ہوتی ہے اور دوسرے یہاں سے CNN کی نشریات بھی براڈ کاسٹ ہوتی ہیں۔ یہ امریکہ کی ایک جنوبی ریاست ہے اور ''کالوں کی جنت'' کہلاتی ہے۔ اس کے ایک طرف ٹینی سی ہے اور دوسری طرف الاباما جو امریکی سول وار کے دوران میدان جنگ بنے رہے تھے۔

میرے بھائی اور بیٹا ہوائی اڈے پر ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ کافی لمبا راستہ طے کر کے ہم بھائی کے گھر پہنچے۔ یہ اٹلانٹا کے مضافات میں ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر بنا

ہوا ہے۔ تین طرف ڈھلانے ہیں اور چوتھی طرف تھوڑی سی چڑھائی۔ بہت ہی خوبصورت جگہ ہے۔ مکان کی بالکونی پر والدہ اور میرا چھوٹا بھتیجا ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے ہاتھ ہلا کر ہمارا استقبال کیا۔ یہ نہایت صاف ستھری اور پرسکون جگہ ہے۔ ایک گھاٹی پر چڑھ کر ہم گیراج تک پہنچے۔ یہ گھر کے تہہ خانے Basement میں بنایا ہوا ہے۔ ہم نے گاڑی باہر ہی چھوڑ دی۔ وہاں پہلے ہی چار گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک بھاوج کی، ایک بیٹے کی، ایک پرانی گاڑی جو اتنی پرانی بھی نہیں تھی اور ایک ٹرک اور ایک میرے بھائی کی اپنی گاڑی۔ معلوم ہوا کہ ٹرک تو سامان وغیرہ بازار سے لانے کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے کہ پلمبر، کارپینٹر اور رنگ وروغن کے کچھ کام تو لوگ خود اپنے آپ ہی کر لیتے ہیں اور اسی لیے مختلف قسم کے اوزار ہر گھر میں موجود رہتے ہیں۔ دوسرے یہ پتہ چلا کہ یہاں پرانی گاڑیوں کی بہت ہی معمولی سی قیمت ملتی ہے۔ مثلاً جو ایک فالتو گاڑی وہاں کھڑی تھی اور صرف ۸ سال پرانی تھی اور ۱۷ ہزار ڈالر میں خریدی گئی تھی۔ جب بیچنے کے لیے ایک شوروم پر اس کی قیمت لگوائی تو اس کے صرف ۶۰۰ ڈالر مل سکتے تھے۔ اس وجہ سے اس گاڑی کو بیچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور ہم اسی میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے پھر ایک روز سارے خاندان کو سیر کرانے کی غرض سے میرے بھائی نے سوچا کہ ایک بڑی گاڑی لی جائے چنانچہ ہم نے ایک بڑی گاڑی دیکھی جس میں دس لوگ آسانی سے بیٹھ سکتے تھے اور جس کی اندورنی سیٹوں کو الٹا کر کم از کم تین لوگوں کے سونے کی جگہ بن جاتی تھی۔ اس گاڑی کا کوئی ۲۲ ہزار ڈالر میں سودا طے ہوا۔ قسط ۔/۵۰۰ ڈالر ماہانہ بنی اور دو مزید رعایتیں یہ تھیں کہ کمپنی کی طرف سے اس میں ایک ڈیک لگا دیا گیا اور قسط بھی ایک مہینہ بعد شروع ہونی تھی۔ گاڑی خریدتے وقت ایک بھی پیسہ نہیں دینا پڑا اور بس چند کاغذوں پر دستخط کرائے گئے۔ یہ وہاں کا کاروباری نظام ہے۔ امریکہ بنیادی طور پر متوسط طبقے کے محنت کشوں کا ملک ہے۔ یہاں متوسط طبقے کو زندگی کی سب سہولتیں میسر ہیں لیکن سارا اقتصادی نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ غریب مزید غریب ہوتے جاتے ہیں اور امیر زیادہ امیر، ہر چیز قسطوں پر

ملتی ہے۔آپ کے پاس سب کچھ ہے مگر اپنا کچھ نہیں ہے سب ادھار پر ہے۔گھر بھی قسطوں پر، کار بھی قسطوں پر، تعلیم بھی قسطوں پر۔پھر کریڈٹ کارڈ کا نظام بھی ہے۔جو چاہے خرید لو اور ساری عمر اس کی قیمت ادا کرتے رہو۔گویا اس ہوشیاری سے یہ نظام بنایا گیا ہے کہ وہ آپ سے صرف آپ کی کمائی ہی نہیں لیتے بلکہ آپ کی آیندہ عمر بھر کی کمائی پہلے ہی لے لیتے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ چیزیں تو سب ہوتی ہیں لیکن جیب میں پیسہ نہیں ہوتا۔یہ نظام غربت میں لوگوں کو خوش رکھنے کا بہت ہی سوچا سمجھا نظام ہے۔لیکن یہ بڑی احتیاط سے بنایا گیا ہے۔مثلاً امریکی کاریں اس حساب سے بنائی جاتی ہیں کہ پانچ سال کے بعد یہ چلانے کے قابل نہیں رہتیں۔

آرتھر ملر کے ڈرامے The Death of a Salesman میں ایک غریب آدمی کی بیوی اسے بتاتی ہے کہ ان کا فرج اب کام نہیں کرتا۔وہ خود بھی کہتا ہے کہ اس کی کار اب چلانے کے قابل نہیں رہی ہے اس کی بیوی کہتی ہے کہ یہاں چیزیں اس حساب سے بنائی گئی ہیں کہ وہ اسی وقت تک چلتی ہیں جب تک قسطیں چلتی ہیں۔جیسے ہی قسطیں پوری ہو جاتی ہیں مشین بھی خراب ہو جاتی ہے۔یعنی آپ کو کوئی سہولت صرف اس وقت تک ملتی ہے جب تک آپ اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔قیمت ختم سہولت ختم۔لوگ صبح سویرے منہ اندھیرے کام پر جاتے ہیں اور شام کو بتیاں جلنے پر گھر لوٹتے ہیں۔کئی کئی کام بھی کرتے ہیں لیکن رہتے غریب ہی ہیں۔کام پر کام کیے جاتے ہیں لیکن پلے کچھ نہیں ہوتا۔سوائے ایک کریڈٹ کارڈ کے جس کی مالیت محدود ہوتی ہے۔یہ وہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جو جمہوریت کے نام پر چلایا جاتا ہے۔یہاں ایک طرف اتنے بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں جن کی آمدنی کسی ایک ملک کے پورے بجٹ سے زیادہ ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ ہیں جو صرف جیتے ہیں۔یہ نظام ایک غریب آدمی کو اتنا دے دیتا ہے کہ وہ احتجاج کرنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔لیکن اس دیس میں جو لینڈ آف آپارچونٹی کہلاتا ہے لینڈ آف فریڈم کہلاتا ہے۔نہ سب کے لیے ترقی کے

مواقع ہیں نہ سب کو آزادی ہے۔امریکی ادب اس فریب کا بڑی خوبصورتی سے پردہ چاک کرتا ہے۔کہنے کو تو آمدنی ہزاروں ڈالر ہوتی ہے جو پاکستان کے لاکھوں روپے کے برابر ہے لیکن اخراجات اس سے بھی زیادہ ہیں۔

ہم اٹلانٹا کے مضافات میں ایک چھوٹی سی خوبصورت آبادی وڈ سٹاک میں ٹھہرے۔یہ شہر کے مرکز سے کوئی تیس میل دور ہے۔مرکز میں ہی دو یونیورسٹیاں ہیں اور CNN کا براڈ کاسٹنگ ہاؤس ہے۔یہاں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ اس علاقہ میں کوئی بس یا ریل نہیں آتی۔معلوم ہوا کہ اس آبادی کے لوگ ہی یہاں پبلک ٹرانسپورٹ کو نہیں آنے دیتے۔ان کا خیال ہے کہ اگر یہاں ٹرانسپورٹ کی سہولت ہو گئی تو کم آمدنی والے لوگ ادھر آجائیں گے۔امریکہ میں طبقاتی احساس بہت شدید ہے۔یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ مسجدوں اور امام بارگاہوں میں بھی لوگ بہت زیادہ سٹیٹس کونشس ہیں اور لوگ اپنی حیثیت کی عبادت گاہوں میں ہی جاتے ہیں۔ہماری بھاوج کو ایک تشویش ہو چلی تھی ان کا بڑا بیٹا تو میڈیکل یونیورسٹی میں پہنچ گیا تھا لیکن چھوٹا ابھی سکول میں ہی تھا۔ان کے پڑوس میں ایک کالا خاندان آکر آباد ہو گیا تھا اور میرے بھتیجے کی اس نو وارد خاندان کے کالے لڑکے سے جو اسی کی عمر کا تھا دوستی ہو گئی تھی۔میری بھاوج بہت پریشان تھیں اور اس علاقہ کو چھوڑنے پر مصر تھیں۔چنانچہ اس سلسلے میں کئی مکان دیکھے گئے۔لیکن یہ مکان بہت مہنگے بھی تھے اور بہت آبادی والی جگہوں میں تھے جب کہ ان کے اپنے مکان کی جگہ بہت ہی کھلی اور خوبصورت ہے، کچھ اس وجہ سے بھی اور کچھ یوں بھی کہ یہ نسلی تعصب مجھے اچھا نہیں لگا۔میں نے ان مکانوں کی اچھی خاصی برائی کی چنانچہ مکان بدلنے کا پروگرام اس وقت ملتوی ہو گیا۔

جیسا کہ میں نے بتایا وہاں دور دور تک کوئی ٹرانسپورٹ نہیں تھی اور ویسے بھی اس علاقہ سے میں واقف بھی نہیں تھا کہ ٹیکسی لے کر کہیں چلا جاتا۔بس ایک آدھ میل پیدل چکر لگا کر لوٹ آتا۔پھر ایک روز میں اپنے بھائی کے ساتھ ایک فیکٹری میں چلا گیا جہاں وہ انسپکٹر

تھے۔میں نے وہاں قطار میں لٹکی ہوئی مرغیوں کو مشینوں سے ذبح ہونے سے لے کر پیک ہونے تک کے سارے مناظر دیکھے۔ظاہر ہے وہاں جو صفائی کا انتظام تھا اس کا یہاں کسی گوشت کی دکان پر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔پھر ایک روز میں اپنے بیٹے ساتھ اس کی یونیورسٹی گیا۔یہ چھٹیوں کے دن تھے اس لیے کسی پروفیسر سے تو ملاقات نہیں ہوسکی البتہ چند طلبا سے ضرور ملاقات ہوئی ہمارے صاحب زادے کو یونیورسٹی میں کوئی دو تین گھنٹے کا کام تھا۔اس لیے میں ٹہلتا ٹہلتا مارکیٹ میں پہنچ گیا اور وہاں سے ایک زیر زمین گاڑی میں سوار ہوگیا ٹرین آئی تو میں اس میں سوار ہوگیا اور آخری سٹیشن تک چلا گیا۔وہاں سے میں پل پر سے دوسری طرف گیا اور واپسی کی ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔مجھے ٹکٹ نہیں لینا پڑا اس لیے کہ میں سٹیشن سے باہر نکلا ہی نہیں۔دوسری طرف بھی میں آخری سٹیشن تک گیا اور پھر اسی طرح واپسی پر آکر مارکیٹ میں اتر گیا اور وہاں سے یونیورسٹی چلا گیا اور پھر ہم لوگ کار میں بیٹھ کر گھر واپس آگئے۔

میں نے ایک روز اپنے بیٹے سے کہا کہ اب تم امریکہ میں ہو تو امریکیوں سے زیادہ میل جول رکھو اور پاکستانیوں ہندوستانیوں سے بہتر ہے کہ دور دور ہی رہو۔میں نے بتایا کہ میں جب کیمرج میں تھا تو برصغیر کے لوگوں سے دور دور ہی رہتا تھا سوائے ایک پاکستانی لڑکے جو میرے برابر کے کمرے میں رہتا تھا اور ایک بنگالی لڑکی کے جو کبھی کبھی وہاں آجاتی تھی۔

اس پر اس نے جواب دیا کہ امریکیوں سے ملنے میں ان کے کلچر کو اپنانا پڑتا ہے۔وہ پیتے پلاتے ہیں اور کلبوں میں جاکر ڈانس کرتے ہیں جو مجھے پسند نہیں۔مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر مذہبی ہو چکا تھا۔میں نے اسے بتایا کہ میں انگریزوں سے دوستی رکھتا تھا لیکن ان کے کلچر کو نہیں اپناتا تھا۔میں نے سب کو بتا رکھا تھا کہ کھانے کے سلسلے میں بل میں ادا کروں گا لیکن اس میں شراب کا بل شامل نہیں ہوگا ہندوستانی پاکستانی تو صرف فلمیں دیکھتے تھے۔میں نے بھی ایک فلم دیکھی لیکن وہ مجھے کچھ اتنی اچھی نہیں لگی۔وجہ شاید یہ تھی کہ اس فلم کے گانے بہت اچھے تھے اور میں نے بار بار سنے تھے ان سے میرے ذہن میں بڑی رومانوی قسم کی تصویریں ابھر آئی

تھیں۔جب فلم میں یہ گانے دیکھے تو تصور کا وہ سارا طلسم ٹوٹ گیا۔چنانچہ میں فلموں سے دور ہی رہا۔لیکن انگریز دوستوں کے ساتھ میں ایک بہت بڑے کنسرٹ میں بھی گیا جہاں مذہبی گانے بڑے کلاسیکی انداز میں گائے گئے۔یہ کوئی بہت ہی مقبول اور خاصا مہنگا پروگرام تھا۔میرے انگریز میزبان بار بار معذرت کرتے رہے اور میں انھیں یقین دلاتا رہا کہ میں اس پروگرام سے بہت لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ہمارے صاحب زادے یہ باتیں سن کر کچھ متاثر ہوئے اور جب ہم نیویارک گئے تو وہ موقع لگا کر ایک نائٹ کلب میں چلے گئے اور وہاں سے بہت بور ہو کر واپس آئے۔

ایک روز بیوی کے دانت میں شدید درد ہوا۔وہ بھاوج کے ساتھ ڈاکٹر کو دکھانے گئیں۔ڈاکٹر نے صرف چیک اپ کے ڈیڑھ سو ڈالر وصول کرلیے۔پاکستانی کرنسی میں وہ ۹ ہزار روپے بنتے تھے۔یہ بہت ہی دل شکن تجربہ تھا۔چنانچہ وہاں سے کوئی ۶۰۰ میل دور مس سی سی پی میں ہمارے ایک وقف رہتے تھے۔وہ دونوں میاں بیوی ڈاکٹر تھے۔ان سے تکلیف بیان کی گئی تو انھوں نے ہمیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔یہ لمبا سفر تھا۔لیکن تکلیف سے زیادہ سیر کا شوق تھا۔چنانچہ ہم الاباما کی ریاست کے راستے پوری ریاست کو عبور کرکے مسی سی سی پی پہنچے۔راستہ میں ایک شہر فاطمہ بھی پڑا۔اس کی کہانی یہ تھی کہ یہاں ایک کالی عورت کو جس کا نام فاطمہ تھا اس کے رنگ کی وجہ سے بس سے اتار دیا گیا تھا جس پر بہت ہنگامہ ہوا۔اس کے بعد اس جگہ کا نام ہی اس عورت کے نام پر رکھ دیا گیا۔یہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں تھی۔

مسی سی سی پی کا یہ ساحلی شہر Biloxi بہت خوبصورت اور قدرے پرسکون ہے حالیہ کڑینا میں یہ تقریباً بالکل تباہ ہوگیا ہے جس روز ہم وہاں پہنچے وہ اتفاق سے کوئی خاص دن تھا اور سمندر میں دور دور تک جہاز سجائے گئے تھے جو روشنیوں میں جگ مگ کر رہے تھے شام کو آتش بازی کا مظاہرہ بھی ہوا جو دیر تک جاری رہا۔ہمارے میزبان ایک فلیٹ میں رہتے تھے جو بالکل ساحل سمندر پر تھا اور یہاں سے اس جشن کا نظارہ بہت خوبصورت تھا۔اس کے بعد وہ

ہمیں اپنا نیا گھر دکھانے بھی لے گئے جو ساحل سے ذرا ہٹ کر ایک رہائشی علاقہ میں تھا۔ مکان ابھی زیر تعمیر تھا لیکن اب اس کی شکل نکل آئی تھی جو خاصی شان دار نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک بڑا سا دو منزلہ مکان تھا۔

یہ شہر ایک مختصر سا خوبصورت سا شہر ہے لیکن یہاں کی سب سے بڑی دلچسپی اور اس کی شہرت کا سبب یہاں کے بنگو کلب ہیں۔ رات کو ہم بھی وہاں گئے۔ ہم جس کلب میں گئے یہ کسی بہت بڑے فائیو سٹار ہوٹل کی طرح لگتا تھا زبردست پرشکوہ دروازے کے اندر بڑے بڑے ہال تھے جن میں بنگو مشینیں سینکڑوں کی تعداد میں لگی ہوئی تھیں جو ہر قسم اور ہر سائز کی تھیں۔ ہمارے میز بانوں نے جاتے ہی جوا کھیلنا شروع کر دیا اور ہمیں بھی دعوت دی۔ میں نے کہا کہ میں جوا نہیں کھیلتا۔ جیسے پہلے لکھ چکا ہوں میں نے یورپ اور امریکہ میں بہت سیریں کیں اور بہت پیسے خرچ کیے لیکن جوئے اور شراب پر کبھی ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔ میرے میزبان نے مجھے سو سینٹ دیے کہ میں ان کو داؤ پر لگاؤں۔ میں مختلف مشینوں پر کھیلتا رہا اور ایک وقت میں نے ۵۰ ڈالر تک جیت بھی لیے تھے۔ لیکن میں پیسے لگاتا رہا یہاں تک کہ وہ سارے سینٹ ختم ہو گئے میرے میزبان نے مجھے کچھ اور سکوں کی پیش کش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ یہاں سے زیادہ تر لوگ اکثر ہار کر ہی نکلتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کو کوئی فائدہ بھی ہو جاتا ہے۔ امریکی پیسہ سے بہت پیار کرتے ہیں اور ہر وقت اس کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ یہی ان کی ''ترقی'' ہے۔ لیکن پیسہ کبھی بھی کافی نہیں ہوتا اور یہ ہمیشہ محنت کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ پریشان ہوتے رہتے ہیں۔

وہاں ڈاکٹر صاحبان سے کچھ دوائیں وغیرہ لے کر ہم واپس اٹلانٹا پہنچ گئے۔ راستہ میں ایک ریسٹنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کر کے اور منہ ہاتھ دھو کر ہم کوئی تین چار لوگ گاڑی کے اندر ہی سو گئے ہماری طرح کچھ اور لوگ بھی وہاں اسی طرح اپنی اپنی گاڑیوں میں سو رہے تھے۔ سنا ہے کہ اب وہاں حفاظتی انتظامات بہت سخت کر دیے گئے ہیں اور اب لوگوں کو ریسٹنگ

ایریا میں گاڑیوں میں سونے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ آج کل کے حالات سے سب سے زیادہ پریشان امریکی ہی ہیں۔ ہمیں اتنا فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ ہم تو پریشانیوں کے عادی ہیں لیکن عام امریکی شہریوں کے ساتھ جو کچھ گیارہ ستمبر کے بعد سے ہو رہا ہے وہ واقعی بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ ان کی سب آزادیاں اور سہولتیں ایک ایک کر کے ختم ہوتی جا رہی ہیں۔

پھر کرسمس کا زمانہ آیا تو پتہ لگا کہ ہمارے گھر سے آٹھ دس میل دور ایک جگہ بڑا جشن ہے ہمارے بھائی بھاوج اور بھتیجے بھی گو کہ برسوں سے وہاں رہ رہے تھے لیکن کبھی اس میلہ پر نہیں آئے تھے۔ ہم راستہ پوچھتے پوچھتے رات کے وقت اس مقام کی طرف چلے۔ ایک ویران سی جگہ ایک خالی بڑی دکان تھی۔ وہاں سے پتہ پوچھنے کے لیے اترے تو دیکھا کہ وہاں ایک نوجوان سردار جی دکان سجائے بیٹھے ہیں۔ ان سے سرراہے پوچھا کہ امریکہ انھیں کیسا لگا تو انھوں نے بتایا کہ وہ وہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے اور کبھی ہندوستان نہیں گئے۔ بہر حال انھوں نے بتایا کہ وہاں سے کچھ ہی دور روشنیوں کا شہر ہے۔ ہم وہاں پہنچے، کار سمیت سواریوں کا کرایہ ۲۰ ڈالر تھا۔ یہاں ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ بالکل ایسی جیسے ہمارے ہاں عید میلادالنبی کے موقع پر ہوتی ہیں۔ لیکن یہ روشنیاں سڑکوں، بازاروں اور محلوں میں نہیں تھیں بلکہ دریا کے کنارے ایک وسیع کھلے میدان میں تھیں۔ یہاں پہاڑیاں، قلعے، محل، پرندے اور جانور، شیر، ہاتھی وغیرہ بڑی خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ کوئی آدھے گھنٹے گاڑی میں بیٹھے سارے نظارے دیکھ کر اور تصویریں لے کر رات دیر گئے گھر پہنچے۔

پھر ایک روز برابر کی ریاست ٹینیسی کی وادی کا پروگرام بنایا۔ تاریخ میں اس کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہوا تھا۔ یہ امریکی خانہ جنگی کے دوران ایک بہت بڑا میدان جنگ رہا تھا۔ البتہ اب اس کی شہرت کی وجہ وہاں کی ایک آبشار ہے جو روبی فال Ruby Fall کہلاتی ہے۔ ایک اونچی سی پہاڑی پر ایک عمارت ہے جس کے ساتھ ایک بڑا سا مینار

ہے۔اس میں ایک لفٹ لگی ہوئی ہے جو لوگوں کو تقریباً ۲۰۰ فٹ زیر زمین لے جاتی ہے۔اس راستہ کو طے کرنے کے لیے اوپر نیچے دو لفٹ لگی ہیں۔سب سے نیچے پہنچ کر ایک بڑی سرنگ کے منہ پر لفٹ اترتی ہے۔یہ بہت خوبصورت جگہ ہے۔یہ ایک بہت ہی لمبی سرنگ ہے جس میں ایک وقت میں لوگوں کی صرف ایک قطار گذر سکتی ہے۔جب دوسری طرف قطار سامنے آتی ہے تو ایک طرف کے لوگ سرنگ کی دیواروں سے لگ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو گذرنے کا موقع مل جاتا ہے۔سرنگ کی چھتوں اور دیواروں سے پانی کے قطرے بہتے رہتے ہیں اور یہاں سٹیلکا ٹیٹس اور سٹیلگمائیٹس نے بہت خوبصورت پیٹرن بنائے ہوئے ہیں۔نوجوان لڑکے لڑکیاں گائیڈز کے فرائض انجام دیتے ہیں اور اس سرنگ اور آبشار کی تاریخ تعمیر اور اس کی دوسری خصوصیات کی تفصیلات بتاتے رہیں۔کچھ کچھ فاصلے پر ٹیلیویژن بھی ہیں اور وہ ابھی ایسی ہی تفصیلات دیتے رہتے ہیں۔کوئی ۲۵/۲۰ منٹ چلنے کے بعد ہم آبشار تک پہنچے۔یہاں سرنگ ختم ہو جاتی ہے اور اس کے آخر میں ایک بڑا کنواں سا ہے جس میں چھت سے پانی کی ایک مسلسل دھار گرتی رہتی ہے۔میں نے گرل گائیڈ سے پوچھا کہ یہاں آتے ہوئے اسے ڈر نہیں لگتا تو اس نے کہا کہ ڈر یقیناً لگتا ہے۔مگر یہاں کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوا ہے۔پھر واپس لفٹوں کے ذریعہ ہم اوپر آئے جہاں ایک ریسٹوران تھا وہاں کچھ کھانے پینے کے بعد ہم واپس ہوئے۔روبی فالز کو بھی کرسمس کے لیے بڑی خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔

ہمارا آخری پروگرام نیویارک کی سیر تھا۔بڑی سی گاڑی میں سوار ہو کر ہم سات لوگ شام کے وقت نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔راستہ میں کچھ بڑی بڑی کمپنیوں کے آؤٹ لٹ پوائینٹس آئے۔مثلاً کراکری، کپڑا، جوتے، الیکٹرونکس وغیرہ۔عام خیال تھا کہ یہاں چیزیں بازار سے سستی ملتی ہیں۔لیکن وہاں جاکر معلوم ہوا کہ یہاں وہی قیمتیں ہیں جو شہر میں مل جاتی ہیں۔میں نے ایک دکان سے صرف ایک دھوپ کا چشمہ خریدا۔ریڈیو پر موسم کا حال اور سڑکوں کی صورت حال پر مسلسل خبریں دی جاتی رہتی ہیں۔مثلاً کہاں بارش آئے

گی، کہاں آندھی ہوگی اور کہاں کتنا ٹمپریچر ہوگا۔پھر یہ بھی کہ کس سڑک پر کتنی آمدورفت ہے۔اگر فلاں مقام تک پہنچنا ہے تو اس سڑک پر آدھا گھنٹہ لگ سکتا ہے۔لیکن متبادل راستہ اختیار کریں تو آپ دس منٹ بچا سکتے ہیں۔راستہ میں ریسٹ ایریا بھی آتے رہے جہاں اتر کر ہم کچھ ستاتے، کچھ ٹہلتے، تازہ دم ہوتے اور کچھ کھاتے پیتے واشنگٹن سے پہلے ایک ریسٹ ایریا پر رکے گاڑی کی درمیانی سیٹیں کھولیں اور بستر لگا لیے جہاں چار لوگ بڑے آرام سے لیٹ گئے۔میں پچھلی سیٹ پر جو کھلتی نہیں تھی بڑے آرام سے لیٹ گیا اور دو نوجوان اگلی سیٹیں کھول کر ان پر سو گئے۔اس طرح گاڑی میں ہی کوئی چار گھنٹے آرام کیا۔ہوٹل کے کرائے سے بھی بچے اور سامان وغیرہ اتارنے رکھنے کی کوفت بھی نہیں ہوئی۔صبح صبح وہاں سے روانہ ہو کر ہم پھر نیویارک کی طرف روانہ ہوگئے۔جہاں ہم اپنے ایک عزیز کے ہاں گئے وہاں کھانا وغیرہ کھایا کچھ ریسٹ کیا گپ شپ کی اور مین ہٹن کی سیر کو نکل گئے۔یہ بالکل ایک اتفاق تھا کہ ۱۹۶۸ء میں اپنے پہلے امریکی سفر کے دوران کوینز ہسپتال میں ڈاکٹرز ہوسٹل میں ٹھہرا تھا۔وہاں میرے ایک عزیز اس زمانے میں انٹرن شپ کر رہے تھے۔اب وہ لونگ آئی لینڈ کی ایک زبردست کوٹھی میں رہتے ہیں۔اب ہم کوئی ۳۸ برس بعد اس ہسپتال سے صرف چند قدم کے فاصلے پر پارسن ایونیو کے سب سٹیشن کے قریب ٹھہرے تھے۔کچھ پرانی باتیں بھی ذہن میں آئیں۔وہاں سے زیر زمین ریلوں اور سڑکوں پر چلنے والی بسیں بہت حد تک ویسی ہی تھیں جیسے ۴۰ برس پہلے تھیں لیکن مین ہٹن بالکل بدل گیا تھا۔پہلے کہیں کہیں کوئی کھلی جگہ نظر آجاتی تھی مگر اب لگتا تھا کہ عمارتیں ایک دوسرے کے اندر گھسی ہوئی تھیں۔پورا کا پورا شہر بہت مصنوعی لگا جیسے کسی فلم کا سیٹ ہو یا کوئی خیالی قسم کی آبادی۔زندگی کے آثار بہت کم ہوگئے تھے اور ہر چیز میکانکی ہوگئی تھی۔پہلی بار جب میں یہاں آیا تھا تو ٹائم سکوئر پر کھانے پینے کی بڑی بڑی دکانیں تھیں جیسی لاہور میں لکشمی چوک میں ہیں وہاں لب سڑک ہی مرغیاں بھونی جاتی تھیں اور مچھلیاں تلی جاتی تھیں اور دوسرے کھانے مثلاً کباب وغیرہ بھی تیار ہوتے تھے۔اب یہ سب

شیشوں کی دیواروں کے پیچھے چلے گئے تھے۔انسانوں کے ہجوم تھے مگر گہما گہمی نہیں تھی۔ہر شخص صرف اپنے اندر سمٹتا ہوا چلا جاتا تھا۔یہ ایک کراؤڈ تھا کمپنی نہیں تھی اور بقول بیکن انسان نہیں تھے بلکہ تصویریں تھیں۔لیکن یہ میر تقی میر والی زندگی سے بھرپور تصویریں نہیں تھیں:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

نیویارک کی یہ تصویریں پہلے بھی خاصی میکانکی تھیں لیکن اب تو بالکل ہی مصنوعی ہو کر رہ گئی تھیں۔یہاں کی زندگی میں انسانی حرارت نہیں تھی۔بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ہم ٹی وی پر مین ہیٹن دیکھ رہے ہیں۔ہر چیز غیر انسانی Impersonal ہو کر رہ گئی تھی۔عمارتوں کی کچھ بیچ اتنی تھی کہ مجھے اپنے پرانے دفتر کی جگہ ڈھونڈنے میں بھی کافی مشکل پیش آئی۔گو وہ دفتر جو پہلے ففتھ ایونیو پر ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کے بالکل قریب تھا اب لونگ آئی لینڈ میں منتقل ہو چکا تھا۔ہم ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ پر بھی گئے۔وہاں لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔لیکن بغیر شناخت کے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی اور شناخت بھی وہ تصویر والی مانگتے تھے۔صرف شناختی یا کاروباری کارڈ قابل قبول نہیں تھے۔ہم تو خیر اجنبی تھے لیکن یہاں خود امریکیوں کے ساتھ بھی اجنبیوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔امریکہ نے دنیا کو جمہوریت کے لیے محفوظ بنانے کی خاطر خود اپنی جمہوری روایات کھو دی تھیں۔لیکن چوں کہ ہمارے پاس اپنے پاسپورٹ تھے اس لیے ہمیں ایمپائر سٹیٹ پر جانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔یہاں بھی ہم نے دیکھا کہ لوگوں کی بہت بڑی قطار اندر جانے کی منتظر تھی اور خود ہال کے اندر جہاں ٹکٹ ملتے تھے کوئی چار یا پانچ قطاریں بنی ہوئی تھیں اور سامنے بورڈ پر انتظار کا وقت بھی لکھا تھا۔مثلاً آخری لائن والوں کو ٹکٹ لینے میں ۱۰ منٹ لگیں گے۔یوں ہر چیز نہایت میکانکی بلکہ کمپیوٹرائزڈ ہو گئی تھی۔ایمپائر سٹیٹ پر تین لفٹوں کے ذریعہ چڑھتے ہیں بالکل چھت پر ہوا اتنی تیز ہے کہ وہاں کھڑا نہیں ہوا جاتا۔میں نے دیکھا کہ اکثر لوگ ایک دوسرے کو اس مقام کی نشان دہی کر رہے

تھے جہاں کبھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر تھا جو گیارہ ستمبر کو گر گیا تھا۔

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ سے اتر کر ہم واپسی پر اس جگہ بھی گئے جہاں کبھی مین ہاٹن کے جڑواں مینار تھے اور جو نیویارک کی پہچان تھے۔ابھی وہاں سے ملبہ ہٹایا جا رہا تھا اور بڑی بڑی کرینیں اور بلڈوزر اس کام میں مصروف تھے۔گو ان میناروں کو گرے ہوئے تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا تھا مگر ابھی تک وہاں سے کہیں کہیں دھواں اٹھ رہا تھا۔جیکسن بولیوارڈ پر ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا،یہاں ہندوستان سے آئے ہوئے لوگ بڑی تعداد میں رہتے ہیں اور ہر طرف چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔یہاں ہندوستانی ریسٹورنٹ،ہندوستانی دکانیں اور ہندوستانی سینما خاصی تعداد میں ہیں۔جس میں ایک آدھ پاکستانی بھی گھسے ہوئے ہیں۔

نیویارک سے ہم نیوجرسی گئے جہاں میرے بھائی کی سسرال کے لوگ رہتے تھے اور وہاں سے نکل کر ہم بھائی کے ایک دوست کے گھر ہیرس برگ کے شہر گئے جو قریبی ریاست فلیڈلفیا میں واقع ہے۔یہاں کچھ عجیب باتیں دیکھنے میں آئیں بھائی کے یہ دوست کوئی ۲۵ سال پہلے امریکہ آئے تھے پھر ایک ایک کر کے انھوں نے اپنے تمام خاندان کو وہاں بلوا لیا تھا۔اب اس شہر میں ان کے بہت اچھے اور بڑے بڑے سات آٹھ گھر ہیں بچے وہیں پیدا ہو کر جوان ہو چکے ہیں۔کچھ زیر تعلیم ہیں اور کچھ بیروزگار ہیں۔یہاں ان تمام گھروں میں ہمیں بڑے اصرار سے بلایا گیا اور ہم ہر گھر میں گئے۔یہاں ان کے دو اہم مسئلے تھے۔ایک تو بچوں کی شادیوں کا مسئلہ۔امریکہ میں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے کے باوجود گھروں کا ماحول خالصتاً مشرقی تھا۔ٹیلی ویژن پر PTV اور ہندوستانی چینل بھی چلتے تھے۔یہ واقعی ایک سنجیدہ مسئلہ ہے کہ وہاں شادی کے لیے مناسب لڑکے لڑکیاں نہیں ملتے ہیں۔خصوصاً لڑکیوں میں اتنی امریکیت آ گئی ہے کہ پاکستانی لڑکے ان سے گھبراتے ہیں۔اور امریکیوں کے شادی بیاہ کے تصورات ہم سے بالکل مختلف ہیں۔دوسرا مسئلہ دلچسپ ہے۔اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ خاصی Comic سچویشن لگتی ہے مگر دوسری طرح سے دیکھا جائے تو یہ اچھی خاصی ٹریجڈی

ہے۔ گھر بڑے بڑے ہیں اور خوبصورتی اور نفاست سے سجائے گئے ہیں۔ مگر انھیں دیکھنے کوئی نہیں آتا۔ یہاں کے معاشرہ میں فرد کی کوئی حیثیت نہیں۔ آپ کے کپڑے کیسے ہیں، جوتے کیسے ہیں، کتنے مہنگے اور خوبصورت ہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا۔ یہاں تک کہ کوئی لڑکی کتنی خوبصورت ہے۔ کوئی لڑکا کیسا گبرو جوان ہے۔ ان باتوں میں کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ذاتی خوبیاں اور ذاتی کامیابیاں بالکل بے معنی ہیں۔ ہر چیز غیر شخصی ہے اور تمام رشتے کاروباری ہیں۔ یہ تمام اقدار پاکستانی امریکی جوان نسل میں بھی سرایت کر گئے ہیں۔ لیکن مشرقیت بھی ابھی کافی مضبوط ہے۔ یہ جوان نسل دو دنیاؤں میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ نہ پوری طرح امریکی بن سکی ہے اور نہ پوری طرح مشرقی رہی ہے۔ البتہ مذہب کی طرف رجحان کچھ بڑھتا جا رہا ہے لیکن یہ بھی کوئی روحانی ضرورت کے طور پر نہیں بلکہ مغربی معاشرے کے خلاف ردِعمل کے طور پر بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ سب نے ہمیں اپنے اپنے گھروں میں بلایا اچھے اچھے کھانے کھلوائے اور ان سب چیزوں کی بہت تعریف کی تقریباً سب نے بڑی حسرت سے کہا کہ یہاں ہم نے اتنے اچھے گھر سجائے ہوئے ہیں۔ مگر کوئی دیکھنے ہی نہیں آتا۔ اس سماجی تنہائی کا احساس یہاں بہت شدید ہے۔

ہیرس برگ میں دو روز ٹھہرنے کے بعد ہم پھر واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ہیرس برگ سے کچھ ہی فاصلے پر امریکہ کی ایک بہت بڑی چاکلیٹ بنانے کی فیکٹری ہے جس کا نام ہرشے ہے یہ بہت ہی وسیع و عریض اور خوبصورت جگہ ہے جہاں بڑے بڑے ہال ہیں اور چاکلیٹ کے سٹال ہیں جن میں مختلف قسموں اور قیمتوں کی چاکلیٹیں بازار سے بارعایت نرخوں پر ملتی ہیں۔ ایک طرف ایک تہہ خانہ ہے جس میں کچھ ٹرالی ٹرینیں ہیں۔ یہ ٹرینیں فرش میں جُڑی ہوئی ہیں اور بالکل حرکت نہیں کرتی ہیں۔ البتہ ان کے نیچے جو فرش ہے وہ مسلسل چلتی رہتی ہے۔ ہم ان ٹرالیوں میں بیٹھے اور یہ ہمیں فیکٹری کی سیر کرانے لے گئیں۔ ہم نے فیکٹری کے ایک ایک حصہ اور اس کے کام کو بہت قریب سے دیکھا۔ پہلے چاکلیٹ کے خول توڑے جاتے

تھے۔ پھر ان میں سے نکلی ہوئی چاکلیٹ کو دھویا جاتا تھا۔ پھر دودھ اور چینی اور کہیں میوہ جات ان میں ملائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ چاکلیٹ کی پھلیوں سے لے کر اس کو پیکٹوں اور ڈبوں میں بند کرنے کے عمل تک ہم نے پوری چاکلیٹ بنتی دیکھی۔ جب یہ سفر ختم ہوا تو فیکٹری کے ساتھ مختلف گیلریوں سے ہوتے ہوئے ہم باہر نکلے۔ باہر نکلتے وقت سب کو ایک ایک چاکلیٹ دی گئی۔ یہ سیر بھی خوب رہی۔

اس کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا۔ یہاں پھر محسوس ہوا کہ امریکہ میں شہریوں کی سہولتوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ہر مسافر کو دو بکس لے جانے کی اجازت ہے۔ وزن اور حجم کی کوئی قید نہیں جب کہ پاکستان میں یہ سہولت نہیں ہے۔ سامان کی چیکنگ ہوئی اور مختلف آلوں کی مدد سے اس کا جائزہ لیا گیا۔ اس سارے عمل میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا۔ پھر ہم روانگی لاؤنج کی طرف چلے۔ یہاں بہت لمبی لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں اور تلاشی بھی بہت سخت تھی لیکن اس میں گورے کالے، امریکی اجنبی کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ پہلے پرس اور جیبیں خالی کر کے تمام چیزیں ایک ٹوکری میں رکھوا دی گئیں۔ پھر جامہ تلاشی ہوئی۔ آگے چل کر ہر ایک مسافر کی تلاشی نہیں ہوئی بلکہ آٹھ دس لوگوں کے بعد ایک مرد یا عورت کی تلاشی ہوتی تھی۔ خصوصاً جوتے اور جرابیں اتروائے جاتے تھے۔ غالباً کچھ عرصہ پہلے ایک مسافر جوتوں میں بم چھپائے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ البتہ تلاشی لینے والی لڑکی نے اصرار کر کے خود جوتے پہنائے اور تسمے باندھے۔ شاید یہ احترام تھا۔ معذرت تھی یا مزید احتیاط یوں کافی مرحلوں سے گذر کر اور کافی دیر کے بعد ہم جہاز تک پہنچے اور ساڑھے سات گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد شکاگو سے لندن پہنچ گئے۔

ایک مسئلہ یہ بھی پیش آیا کہ اٹلانٹا میں ہمارا جہاز دو گھنٹے لیٹ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے ہم شکاگو تاخیر سے پہنچے ہمارا جہاز پرواز کر چکا تھا۔ نتیجتاً لندن بھی تاخیر سے پہنچے۔ وہاں سے ہمیں سعودی ایرلائن کی پرواز لینی تھی لیکن وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی روانہ ہو چکی

تھی۔چنانچہ امریکن ایرلائن والوں نے ہمیں متبادل پرواز دینے کی جستجو شروع کی۔بتایا گیا کہ ہمیں لفت ہانسا کی پرواز سے فرینک فرٹ ہوتے ہوئے لاہور جانا پڑے گا۔لیکن یہاں ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ جرمنی پاکستان کے ٹرانزٹ مسافروں کو قبول نہیں کرتا۔لیکن جب انھیں بتایا گیا کہ ہمارے پاس امریکہ کا پانچ سال ملٹیپل ویزا ہے تو پھر ہمیں پرواز کی اجازت دے دی گئی۔تقریباً ۳۶ برس بعد یہ میرا فرینک فرٹ کا دوسرا سفر تھا۔لیکن ہم ایر پورٹ پر ہی رہے۔میری بیوی زیادہ گھومنے پھرنے کی شوقین نہیں ہے۔

فرینک فرٹ پر جو تجربہ ہوا وہ نہایت ہی منفرد اور دلچسپ تھا۔یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ لفت ہانسا اور پی آئی اے میں شراکت کی وجہ سے دونوں ہوائی کمپنیوں کی پروازیں یہاں مشترک ہیں۔ایمسٹرڈیم سے جب پرواز فرینک فرٹ پہنچی تو معلوم ہوا کہ یہ پی آئی اے کا جہاز ہے۔بورڈنگ کارڈ دینے والے جرمن تھے۔سب مسافر،عورت مرد چھوٹے بڑے نہایت نظم وضبط کے ساتھ اور سکون سے کھڑے ہوئے تھے۔یورپ اور امریکہ کے دستور کے مطابق مسافروں نے کاؤنٹر سے کوئی تین فٹ دور قطاریں بنائی ہوئی تھیں جب ایک مسافر فارغ ہو جاتا تو دوسرا قطار سے آگے بڑھ کر کاؤنٹر پر آجاتا۔یہ منظر پورے مغرب میں ہر جگہ اسی طرح ہوتا ہے۔چاہے آپ کھانے کی چیزیں خرید رہے ہوں یا ایمپائر سٹیٹ کے ٹکٹ لیکن جوں ہی ہم جہاز کے اندر داخل ہوئے سارا منظر یکسر بدل گیا۔ہر طرف سے شور وغل کی آوازیں آرہی تھیں۔اس نے تکیہ اس کی طرف پھینکا اس نے اپنا بیگ ادھر دے مارا۔مائیں چلا رہی تھیں باپ ڈانٹ رہے تھے۔مغربی تہذیب کا رنگ پاکستانیوں پر کتنا کچا تھا۔یہ سب لوگ جو شاید پیدا بھی وہیں ہوئے تھے وہیں پلے بڑھے تھے یا کم از کم برسوں سے وہاں رہ رہے تھے لگتا تھا کہ ایک دم کسی قید خانے سے چھوٹ گئے تھے۔پی آئی کا جہاز مکمل پاکستان تھا اور یہ لوگ برسوں سے دبی ہوئی آزادی کی تڑپ کو ایک دم اپنے اندر جاگتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔میری بیوی کا جی چاہا کہ اٹھ کر ایک ایک کو ڈانٹیں۔مگر میں نے اُن کو سمجھایا کہ یہ اس ہنگامہ آرائی کے

مزے لے رہے ہیں اور کسی کی بات نہیں سنیں گے اور رویوں میں یہ مکمل انقلاب صرف چند لمحوں میں آگیا تقریباً ساڑھے سات گھنٹے ہوا میں رہنے کے بعد ہم لاہور کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔البتہ جہاز کا عملہ اتنا ہی مستعد اور با اخلاق تھا جیسا کہ کسی بھی مغربی ایرلائن کا۔

ائرپورٹ پر بڑی پریشانی ہوئی۔یہاں پھر وہی ہنگامہ تھا۔لگ رہا تھا جیسے بھاٹی گیٹ میں کھڑے ہوں۔وہی شور وہی لے دے۔بہت دیر اپنا سامان تلاش کرتے رہے لیکن پروازوں میں مختلف مقامات پر تاخیر کی وجہ سے ہمارا سامان ہمارے ساتھ نہیں آسکا تھا۔وہ ہمیں تین روز بعد ملا۔

اٹلانٹا میں ہمیں لگتا تھا کہ یہاں کی سڑکیں بہت کشادہ اور صاف ستھری ہیں بالکل لاہور کی جیل روڈ کی طرح۔لیکن اب جیل روڈ سڑک ہی نظر نہیں آرہی تھی۔لگتا تھا کوئی بے ہنگم سی گلی ہے۔گھر پہنچ کر میں نے بڑے زور سے کہا کہ کتنا اندھیرا ہے بتیاں کیوں نہیں جلاتے۔جواب ملا کہ ساری بتیاں جلی ہوئی ہیں۔یہ تقریباً دوپہر کا وقت تھا۔ہوائی اڈے پر ہی ہمیں اطلاع مل گئی تھی کہ ایک کزن کا چونیاں میں انتقال ہو گیا ہے۔چنانچہ منہ ہاتھ دھو کر ہم فوراً چونیاں کے لیے روانہ ہو گئے۔

روزمرہ کی زندگی میں واپسی پر کچھ شادیاں تھیں کچھ ولادتیں اور اموات کچھ دیگر خاندانی تقریبات اس کے علاوہ چند ادبی نشستیں اور وہی روزمرہ کی معمول کی مصروفیات۔اس کے علاوہ پاک وہند امن فورم کی کانفرنسیں۔اسی دوران بڑے بیٹے کی شادی سے بھی فارغ ہوئے۔پھر امریکہ سے تقاضوں پر تقاضے آنا شروع ہوئے۔چھوٹے صاحب زادہ نے اپنی ہمسفر تلاش کر لی تھی یہ مضافات لکھنؤ کے ایک سادات خاندان کی فرد ہیں۔صاحب زادہ کا تقاضہ تھا کہ والدین ضرور شادی میں شرکت کریں حالاں کہ ہم نے بہت اصرار کیا کہ سفر نا قابل برداشت حد تک طویل ہے اور خرچ بھی بہت زیادہ اور کچھ غیر ضروری ہے پھر اس کی دادی اور چچا وغیرہ وہاں موجود ہیں شادی میں ان کی شرکت کافی ہو گی لیکن اصرار یہی تھا کہ ہمارا وہاں

موجود ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم نے دوسری بار امریکہ جانے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی سوچا کہ شادی کرنے جا رہے ہیں تو بارات لے کر جائیں۔ چنانچہ صاحب زادی اور داماد کو دعوت دی گئی کہ امریکہ جانے کی تیاری کرلیں۔ پہلے تو ان کو اس دعوت پر یقین ہی نہیں آیا۔ بہرحال بار بار اصرار کے بعد انھوں نے بھی تیاری شروع کی اور یہاں سے ہمارے معاشرے کی ستم ظریفیاں شروع ہوتی ہیں۔ چوں کہ نوکری فوج کی ہے اس لیے پاسپورٹ بنوانے کے لیے اجازت مانگی گئی جس کے ملنے میں ایک مہینہ صرف ہوگیا۔ اس کے بعد پاسپورٹ بنے۔ ایک نواسہ اور ایک نواسی کے پاسپورٹ ان کی ماں کے پاسپورٹ میں شامل تھے۔ لیکن ویزے کے دفتر سے مطالبہ ہوا کہ بچوں کے پاسپورٹ علیحدہ ہونے چاہییں۔ چنانچہ پھر نئے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی گئی۔ ادھر تقاضے پر تقاضے آرہے تھے کہ امریکہ پہنچنے کی تاریخ کی اطلاع دیں تاکہ کارڈ چھپوائے جائیں اور شادی کے لیے کوئی ہال بک کرایا جائے۔ لیکن یہاں ابھی ویزے کا انتظار تھا۔ خدا خدا کر کے نئے پاسپورٹ بنے۔ ادھر یہ ہوا کہ ہم نے ٹریول ایجنسیوں سے رابطے شروع کیے۔ معلوم ہوا کہ ہمیں بھی نئے پاسپورٹ چاہییں اس لیے کہ ویزے کے لیے پاسپورٹ میں کم از کم چھ ماہ کی گنجائش ہونی ضروری ہے جب کہ ہمارے پاسپورٹ چھ ماہ سے صرف چند روز پہلے ختم ہو رہے تھے چنانچہ نئے پاسپورٹ کے لیے درخواستیں دی گئیں۔ پاسپورٹ پر انگوٹھے کا نشان صحیح رخ پر نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے فارم پر نشان بنایا گیا جو اس فارم سے کاٹ کر پرانے فارم پر چپکایا گیا۔ ایک ہفتہ کی تاریخ ملی مگر یہاں ایک اور خوبصورت مذاق ہوا۔ پچھلے پانچ چھ پاسپورٹوں پر میرا نام رضی عابدی لکھا ہوا ہے جب کہ شناختی کارڈ پر شروع سے ہی سید محمد رضی عابدی لکھا ہے۔ اس مرتبہ پاسپورٹ افسر مصر تھے کہ پاسپورٹ پر وہی نام ہوگا جو شناختی کارڈ پر ہے۔ میں نے بہت کہا کہ دیکھیے ویزے پر صرف رضی عابدی ہے اور کہیں بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے۔ مگر وہ نہیں مانے۔ یہ خاصا پریشان کن مسئلہ تھا اس لیے کہ ۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد سے امریکی مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانیوں سے

بہت چڑے ہوئے ہیں اور ویزا اور پاسپورٹ کے ناموں کے فرق سے مشکل پیش آسکتی تھی۔ آج کل امریکی اسی طرح کے مین میخ نکالتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پاسپورٹ جمع کرانے کے ایک ہفتہ بعد پیغام آیا کہ اگلے ہی روز ویزا کے لیے انٹرویو ہے۔ ہمارے داماد کو پھر مشکل پیش آئی اس لیے کہ کسی سفارت خانے میں جانے کے لیے جی ایچ کیو سے اجازت لینی ضروری تھی اور ان کے پاس صرف ایک دن تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ لیکن اس پریشانی میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ میں ان کا بٹوہ کہیں گر گیا جس میں ان کے شناختی کارڈ تھے۔ شناختی کارڈ کا ہونا بیرونی سفر کے لیے نہایت ضروری ہے۔ پھر نئے شناختی کارڈ کے لیے درخواست دی گئی۔ اس طرف یہ ہوا کہ مقررہ تاریخ کو جب پاسپورٹ کے دفتر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آٹھ دس روز اور انتظار کرنا پڑے گا اس لیے کہ پاسپورٹ کی کاپیاں ختم ہوگئیں تھیں۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ امریکی ویزا افسر نے بچوں اور ان کی ماں کے ویزے تو دے دیے لیکن خود میجر صاحب کو ویزا نہیں دیا۔ اعتراض یہ تھا کہ پورے خاندان کو ایک ساتھ ویزا نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے کسی ایک کو یہاں ٹھہرنا ہوگا اور صرف میجر صاحب ہی اکیلے ٹھہر سکتے تھے۔ ان کے ویزے کی درخواست کو مسترد بھی نہیں کیا گیا بلکہ انھیں کہا گیا کہ ۹ دن بعد پتہ کریں۔ ۹ دن گزرے پھر پندرہ دن پھر بیس دن گذرے اور اسی انتظار میں ہمارا امریکہ جانا مسلسل ملتوی ہوتا رہا۔ ادھر دلھن والوں کی طرف سے تقاضے پر تقاضے آرہے تھے کہ جلد آئیں۔ چنانچہ طے ہوا کہ ہم میجر صاحب کے بغیر ہی چلے جاتے ہیں اور وہ بعد میں آتے رہیں گے۔

پاسپورٹ اور ویزوں کے ناموں میں فرق کا مسئلہ بھی پریشان کیے ہوئے تھا۔ گو کہ دونوں پاسپورٹ ایک ساتھ منسلک بھی تھے پھر بھی پریشانی تو تھی۔ چنانچہ پہلے ڈسٹرکٹ کورٹ سے حلف نامہ پر دستخط کرائے اور پھر انگلش ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی سے سرٹیفکیٹ لیا گیا کہ سید محمد رضی عابدی اور رضی عابدی ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ بہرحال لاہور سے اٹلانٹا تک کسی

نے اس فرق کو محسوس نہیں کیا۔ البتہ واشنگٹن میں امیگریشن افسر جو ایک خاتون تھیں انھیں یہ اعتراض تھا کہ بچوں کے نام آپس میں نہیں ملتے ہیں۔ انھیں دکھا کر بتایا گیا کہ ایک لڑکا ہے ایک لڑکی۔ پھر انھیں یہ اعتراض تھا کہ بچوں کے نام باپ کے نام سے نہیں ملتے میں نے انھیں سمجھایا کہ ہمارے ہاں فیملی نیم لکھنے کا عموماً رواج نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارے کام کبھی رکتے نہیں ہیں۔ ہم جو ارادہ کرتے ہیں ہو جاتا ہے لیکن آسانی سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہی ساری زندگی کا رنگ ڈھنگ رہا ہے چاہے ایم اے کا داخلہ ہو یا فائنل امتحان، کیمبرج جانا ہو۔ وہاں وظیفہ ملنا اور وہاں سے امریکہ جانا سب کام آخری لمحہ میں ہی ہوتے ہیں۔

آج ستمبر کی پہلی تاریخ ہے۔ چند روز پہلے ہم بیٹے کی شادی سے فارغ ہو گئے۔ آج دونوں دولھا دلھن صبح اپنی کلاس کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی شادی بالکل ایسے ہی ہوئی جیسے پاکستان میں ہوتی ہے۔ صرف یہاں عزیز کم تھے۔ دوست احباب زیادہ تھے۔ بہت سے آشنا لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں بیٹے کی شادی ہوئی ہے وہ بھی کوئی بالکل غیر لوگ نہیں ہیں بلکہ ان سے بھی کئی رشتہ داریاں نکل آئی ہیں۔ دنیا کس قدر مختصر ہے۔

اس دورے میں زیادہ تر تو شادی کی گہما گہمی رہی لیکن اس کے باوجود ہم نے سیر و سیاحت کے لیے بھی وقت نکال لیا اٹلانٹا کے علاوہ ٹینیسی اور نیو یارک بھی گئے۔ گذشتہ ڈھائی تین سال میں امریکہ میں عمومی طور پر زبردست تبدیلیاں دیکھی گئیں۔ کچھ تو حفاظتی اقدامات کی وجہ سے تھیں۔ مثلاً مین ہٹن پر اب سکیورٹی کے لوگ بڑی تعداد میں نظر آتے تھے۔ بڑی بڑی شاہراہوں پر بجلی کے کھمبوں پر لکھے ہوئے اعلانات تھے۔ مثلاً اگر کوئی مشکوک شخص نظر آئے تو فوراً اس کی رپورٹ کریں۔ واشنگٹن جو پہلے بہت کھلی ہوئی وسیع جگہ تھی اب جا بجا اس میں باڑھیں لگا دی گئیں تھیں۔ وہایٹ ہاؤس مکمل طور پر عوام کے لیے بند تھا جب کہ پہلے وہ سیاحوں کے لیے کھلا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مہنگائی بھی بہت بڑھ گئی ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا

جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۱ء میں پٹرول ۷۰ سے ۸۰ ڈالر فی گیلن تھا لیکن وہ ۲۰۰۴ء میں ۱۷۰ سے ۲۰۰ ڈالر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ نیو یارک میں لوگوں کے چہروں پر وہ پہلی بشاشت نہیں تھی۔ البتہ اٹلانٹا میں لوگ کسی حد تک اب بھی آسودہ نظر آتے تھے۔ لیکن دوسری طرف اخلاقی طور پر ہر جگہ بہتری نظر آئی۔ اب لوگ سڑکوں پر عاشقی کے مظاہرے کرتے نظر نہیں آئے گو امریکہ میں لباس کے معاملے میں ہر طرح کی آزادی ہے اور مرد عورت چپل اور نیکریں پہن کر ہی بازاروں میں گھومتے رہتے ہیں۔ لیکن اب وہ پہلا نیم عریانی بلکہ عریانی کا عالم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کچھ بڑے سٹورز پر نوٹس لگا دیے گئے ہیں کہ قمیض اور جوتے ضروری ہیں۔ نیم عریاں لڑکیاں اب بھی نظر آ جاتی ہیں۔ مگر خال خال، ریڈیو، ٹی وی پر اب فیملی کی اہمیت کی باتیں بھی ہونے لگی ہیں۔

۲۰۰۴ء میں امریکہ میں صدارتی انتخابات ہونے والے ہیں۔ ڈیموکریٹ اور ریپبلکن دونوں ہی بڑا زور لگا رہے ہیں۔ بائیں بازو والے بش کی عراق اور افغانستان کی پالیسیوں پر سخت تنقید کر رہے ہیں۔ ڈیموکریٹ بھی اس پروپیگنڈے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا امریکہ سے نفرت کرنے لگی ہے لیکن دائیں بازو کا پریس اور ریپبلکن پلیٹ فارم اس الزام کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکی دنیا بھر میں مقبول ہیں اسی لیے تو ساری دنیا کے لوگ یہاں آنا چاہتے ہیں۔ امریکہ نے جگہ جگہ اسکول ہسپتال اور دیگر NGO قائم کیے ہوئے ہیں۔ امریکہ نے کویت میں بوسنیا میں اور دوسری جگہ مسلمانوں کی بڑی مدد کی ہے اور امریکہ مسلمانوں کا سب سے بڑا دوست ہے۔ یہاں بہت سے غیر قانونی طور پر ٹھہرے ہوئے لوگ ہیں جو امریکہ میں مہمانوں کی طرح عزت سے رہتے ہیں۔

بائیں بازو کی پروپیگنڈہ مشین بھی بہت تیزی سے سرگرم عمل ہے ۱۱ ستمبر کے واقعات پر فلمیں بنی ہیں کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں بش کی پالیسیوں پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ اس کی ایک مثال کریگ انگر کی کتاب خاندان بش اور خاندان سعود ہے جس میں عربوں اور امریکی

حاکموں کے اقتصادی تعلقات سے نقاب اٹھائے گئے ہیں۔اس کتاب سے کچھ اقتباسات یقیناً عمومی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

۱۱/۹ بوسٹن کے لوگن ہوائی اڈے سے ۷:۵۹ پر ایک پرواز لاس اینجلس کے لیے روانہ ہوئی،اس پر القاعدہ کے پانچ کارکن سوار تھے۔واشنگٹن کے ڈلس کے ہوائی اڈے سے ایک اور پرواز AA۷۷ لاس انجلس کے لیے ۸:۱۰ پر روانہ ہوئی۔اس پر تین عرب سوار تھے۔تقریباً ۸:۱۳ پر AA۱۱ لاس اینجلس کے بجائے نیو یارک کی طرف مڑ گئی۔۸:۴۱ پر یہ جہاز ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے شمالی مینار سے ٹکرا گئی۔۹:۰۳ پر UA۱۷۵ جسے بوسٹن سے اغوا کیا گیا تھا دوسرے مینار سے ٹکرائی۔۹:۳۰ بش نے TV پر خطاب کیا۔پھر تیسرا جہاز پنٹاگون پر گرا۔۱۰:۰۶ پر چوتھا جہاز UA۹۳ جو نیو آرک سے چلا تھا پٹسبرگ سے ۸۰ میل دور گر کر تباہ ہوگیا۔لگتا تھا کہ مسافروں نے اغوا کرنے والوں کو قابو کر لیا تھا۔

شاہ فہد نے سعودی باشندوں،خصوصاً شاہی خاندان کے افراد کو امریکہ سے نکالنے کے لیے ہنگامی اقدامات کے احکام جاری کیے۔خطرہ صرف یہ نہیں تھا کہ سارے امریکہ میں عربوں کو گرفتار کیا جا رہا تھا اور انھیں پریشان کیا جا رہا تھا۔اس سے بھی بڑا خطرہ یہ تھا کہ وہاں ایسی تشویش ناک صورتِ حال میں شاہی خاندان کے افراد کی عیش وعشرت کی زندگی کسی طرح قابل برداشت نہ ہوتی۔چنانچہ سفارتی کوششوں کے بعد عرب شاہی خاندان کو امریکہ سے نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔تقریباً ۱۴۰ افراد کو امریکہ سے باہر لے جایا گیا۔ان میں بن لادن خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔اس انخلاء کی اجازت براہ راست حاکم اعلیٰ نے دی۔اس لیے کہ ۱۱ستمبر کے واقعہ کے فوراً بعد امریکہ میں تمام نجی پروازیں منسوخ کردی گئی تھیں۔۱۱ستمبر کے صرف دو روز بعد جب کہ فضائی آمدورفت مکمل طور پر بند تھی سعودی اور بن لادن خاندان کے افراد کو سہولت کے ساتھ باہر جانے دیا گیا۔کسی سے کوئی پوچھ گچھ بھی نہیں ہوئی جب کہ ۱۵ اغوا کرنے والوں میں ۱۱عرب تھے اور ان خاندانوں سے ان کے قریبی مراسم تھے۔کریگ انگر

کا خیال ہے کہ سعودی،امریکی تعلقات کی تاریخ ۷۰ء تک جاتی ہے جب اوپیک کی عائد کردہ تیل کی رسد کی پابندی کے بعد تیل کی قیمتیں بے انتہا بڑھ گئی تھیں سعودی عرب نے امریکہ کا رخ کیا۔سعودی عرب کو اپنی حفاظت اور اربوں ڈالروں کی کھپت کے مسئلے تھے۔اس طرح سعودی سرمایہ کاروں نے بااثر امریکی سیاست دانوں سے تعلقات بڑھائے۔ان میں سب سے اہم بش خاندان تھا جس کی وساطت سے امریکی حکمران طبقہ سے ان کے تعلقات قائم ہوئے۔جنگ،تیل اور سرمایہ کاری میں ان کا اشتراک بڑھتا رہا۔یہاں تک کہ افغانستان پر امریکی حملہ میں بھی دونوں ساتھ ساتھ تھے جس کی سربراہی اوسامہ بن لادن کو سونپی گئی اس طرح ہتھیاروں کے غیر قانونی سودے بینکنگ اور دوسرے شعبوں میں امریکی اور سعودی ساتھ ساتھ کام کرتے رہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ سعودی عرب میں ہی اسلامی بنیاد پرستی اور دہشت گردی پروان چڑھتے رہے۔

گو اس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ ان حملوں کے پیچھے اوسامہ کا ہی ہاتھ ہے تاہم امریکی قیادت نے اوسامہ کے بجائے اپنی توجہ دوسرے ایجنڈے کی طرف منتقل کردی۔یعنی صدام حسین کی معزولی،سعودی شاہی خاندان نے اعلان کیا کہ ان کا اوسامہ سے کوئی تعلق نہیں اور وہ اب سعودی باشندہ بھی نہیں اس لیے اس کی شہریت بہت پہلے ہی اس کی تخریبی کاروائیوں کی وجہ سے منسوخ کردی گئی تھی۔۱۴ستمبر کو دو لاکھ امریکی پروازیں زبردست حفاظتی اقدامات کے ساتھ بحال کردی گئیں۔اس سے پہلے ہی کم از کم آٹھ خصوصی پروازوں کے ذریعہ عربوں کو امریکہ کے مختلف علاقوں سے اکٹھا کیا گیا اور باہر بھیج دیا گیا تھا۔ایسے ہی ایک جہاز میں بن لادن خاندان کی ایک لڑکی جو اس پرواز کی واحد مسافر تھی لاس اینجلس سے اورلینڈو آ رہی تھی۔جہاز کے عملہ کے ایک شخص سے اس نے ۱۱/۹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا یہ بہت بُرا ہوا اس پر اس شخص نے جواب دیا کہ اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔جواب میں لڑکی نے کہا ٹھیک ہے۔لیکن وہ میرا بھائی تھا،امریکہ سے جانے والے یہ عرب کچھ یورپ کے مختلف ملکوں میں

چلے گئے اور کچھ سعودی عرب کے لیے روانہ ہو گئے۔ بظاہر حکومت کے تمام اداروں نے اس غیر معمولی انخلا کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب محکمے اس پروگرام میں شامل تھے۔ ایک واقفِ حال کے مطابق جب لوگ بوسٹن سے روانہ ہوئے تو ہر محکمہ کے افسران وہاں موجود تھے۔ ہر ہوائی اڈے پر F.B.I کے افسر موجود تھے۔ صرف بوسٹن میں ہی F.B.I، محکمہ ٹرانسپورٹ، FAA، کسٹمز، امیگریشن اور نیچر لائیزیشن، میساچوسٹ سٹیٹ پولس اور پورٹ اتھارٹی اور غالباً بیورو آف الکوحل، تمباکو اور اسلحہ کے محکموں کے لوگ اتنی تعداد میں تھے جتنی تعداد میں مسافر نہیں تھے گو کہ زیادہ تعداد سعودی عرب والوں کی تھی تاہم مسافروں میں دوسری اقوام مثلاً مصر، انگلستان، ایتھوپیا، اردن، لبنان، مراکش، نائیجیریا، ناروے، فلپائن، سوڈان اور شام کے لوگ بھی شامل تھے اس لیے کہ سعودی چھوٹے موٹے Menial کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ انگر کے مطابق امریکی حکام اور خود صدرِ امریکہ عربوں کے مداح تھے لیکن عربوں نے امریکہ کے ساتھ مناسب تعاون نہیں کیا۔ سعودیوں نے افغانستان پر حملہ کرنے کے لیے امریکیوں کو اپنے اڈے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی اور جب کہ ساری دنیا میں دہشت گرد پکڑے جا رہے تھے اور ان کے اثاثے منجمد کیے جا رہے تھے۔ سعودی عرب نے ایسے کوئی اقدامات نہیں کیے۔ مبصرین کے مطابق بش اور سعودی خاندان کے مشترکہ اقتصادی مفادات کی وجہ سے ایسا ہوا گراؤنڈ زیرو Zero جلتا رہا اور سعودیوں اور امریکیوں کے درمیان اربوں ڈالر کے معاہدے طے ہوتے رہے۔ بہت سے سعودیوں نے میناروں کے گرانے کی ذمہ داری عربوں کے بجائے یہودیوں پر ڈالی۔ یہ کام صرف ۱۹ افراد کا۔ جن میں سے ۱۵ سعودی تھے۔ نہیں ہو سکتا۔

۲۸ مارچ ۲۰۰۲ء کو فیصل آباد میں پاکستانی کمانڈوز نے امریکن سپیشل فورسز اور SWAT F.B.I ٹیموں کی مدد سے ابو زبیدہ کو گرفتار کیا۔ ۳۰ سالہ ابو زبیدہ القاعدہ کا ایک بہت اہم رکن تھا۔ ابو زبیدہ نے جن لوگوں کی نشان دہی کی ان میں شہزادہ احمد بن سلمان

بن عبدالعزیز کا نام شامل تھا۔ اس نے بتایا کہ شہزادہ احمد کو پہلے ہی سے ۹/۱۱ کے حملہ کا علم تھا۔ دوسرا نام سلطان فیصل بن ترکی کا تھا اور تیسرا شہزادہ فہد بن ترکی کا، چوتھا نام ایئر مارشل مصحف علی میر کا تھا جسے بقول ابو زبیدہ، اسامہ بن لادن نے ۹/۱۱ کے حملہ سے آگاہ کیا تھا ۲۲ جولائی کو شہزادہ احمد کا انتقال ہو گیا جس کے متعلق بتایا گیا کہ سوتے میں اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ ۲۳ جولائی کو احمد کے جنازے پر جاتے ہوئے شہزادہ سلطان بن فیصل کار کے حادثہ میں ہلاک ہو گیا۔ ایک ہفتہ بعد ۳۰ جولائی کو شہزاد بن ترکی ایک صحرا میں مردہ پایا گیا جو غالباً پیاس سے مر گیا تھا، ۲۰ فروری ۲۰۰۳ء کو مصحف علی میر اور اس کے ۱۶ ساتھی ہوائی حادثہ میں ہلاک ہوئے یہ تمام کوائف انگر نے مہیا کیے ہیں۔

پچھلے دورے میں ہم ٹینسی گئے تھے اور وہاں روبی فالز کی سیر کی تھی۔ اس مرتبہ ہم وہاں ٹینسی اکویریم دیکھنے گئے یہاں مختلف دریائی مخلوق کو بہت خوبصورت شیشے کے گھروں میں رکھا گیا ہے۔ بچے تو وہاں سے آنے کو تیار ہی نہیں تھے بڑی مشکل سے کوئی چار گھنٹے کے گشت بعد ہم انہیں باہر لانے میں کامیاب ہوئے۔ پھر ایک روز ہم اٹلانٹا چڑیا گھر دیکھنے گئے یہاں بھی بچے بہت خوش تھے۔ کوشش کی گئی تھی کہ جانوروں کو جہاں تک ممکن ہو سکے ان کے فطری ماحول میں رکھا جائے۔ سارے دن بارش ہوتی رہی تھی لیکن ہمارے چڑیا گھر پہنچنے پر رک گئی تھی۔ پھر بھی وقفہ وقفہ سے بارش ہوتی رہی لیکن وہاں ہر جگہ برآمدے اور سائبان بنے ہوئے تھے اس لیے بارش سے کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ پھر شہر میں روزانہ مختلف مالز اور سٹور ہاؤسز کے دورے لگتے رہتے۔ یہاں بالعموم تین قسم کے بازار ہیں۔ ایک Malls کہلاتے ہیں جہاں دنیا کی تقریباً ہر چیز مل جاتی ہے۔ ہیرے جواہرات کی دکانوں سے لے کر کپڑے اور جوتے تک کی دکانیں اور گھریلو استعمال کی اشیاء سب یہاں مل جاتی ہیں۔ ایک ایک مال پورا ایک شہر معلوم ہوتی ہے جس کی ایک سے تین منزلیں ہوتی ہیں اور کئی ایسکلیٹر اور لفٹ اترنے چڑھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ہر جگہ سامان لانے لے جانے کے لیے ٹرالیاں رکھی ہوتی

ہیں۔کچھ ٹرالیوں میں بچوں کے بیٹھنے کی جگہ سٹرنگ وہیل بھی لگے ہوتے ہیں اور سامنے سے بالکل کار کی شکل ہوتی ہے۔اس میں بیٹھ کر بچے گاڑی چلانے کے مزے لیتے ہیں۔ہمیں یہ گاڑیاں بہت مفید ثابت ہوئیں اس لیے کہ سٹورز کے کشادہ راستوں پر بچوں کو بھاگنے دوڑنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ان گاڑیوں میں وہ سکون سے بیٹھے رہتے ہیں اور والدین کو تنگ نہیں کرتے۔ویسے بھی اگر بچوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ ہر چیز کو ہاتھ لگاتے اور اٹھا اٹھا کر دیکھتے رہتے ہیں۔دوسری Strip Malls یعنی جزوی مال کہلاتی ہیں۔یہاں صرف مخصوص چیزوں کی دکانیں ہوتی ہیں۔اسی طرح سبزی گوشت اور کھانے پکانے کی چیزوں کے پورے پورے سٹور ہوتے ہیں۔تیسری قسم کی وہ چھوٹی دکانیں ہیں جہاں صرف ایک طرح کی چیزیں ملتی ہیں مثلاً ویڈیو شاپ۔سب دکانیں گاہکوں کے لیے کھلی ہوتی ہیں۔تمام چیزیں سامنے ہی رکھی ہوتی ہیں۔آپ اپنی پسند سے چیزیں اٹھاتے جاتے ہیں۔ہر چیز پر قیمت بھی لکھی ہوئی ہوتی ہے۔کچھ چیزوں پر اصل قیمت کے ساتھ رعایتی قیمت بھی لکھی ہوتی ہے۔بظاہر کہیں کوئی چیکنگ نہیں ہوتی۔اکثر خواتین گاہکوں کی مدد کے لیے مشینیں ہوتی ہیں۔جن سے چیزوں کے ڈھونڈنے یا ان کی قیمتوں کے متعلق مدد لی جاسکتی ہے۔جگہ جگہ کیمرے بھی نصب ہوتے ہیں جو پورے سٹور پر نظر رکھتے ہیں۔سب دروازے،لفٹ اور ایسکلیٹر خودکار ہوتے ہیں۔ایک مرتبہ جب ہم کچھ چیزیں خرید کر باہر نکلنے لگے تو دروازے کے قریب ایک دم سے الارم بجنا شروع ہوگئے۔فوراً ایک لڑکی دوڑی ہوئی آئی کہ آپ سامان چیک کرالیں شاید کوئی سنسر Censor رہ گیا ہے۔پھر ایک نوجوان آیا جس نے سوٹ پہن رکھا تھا غالباً کوئی اعلیٰ عہدہ دار تھا۔اس نے ہمیں کاؤنٹر پر بلایا اور ایک ایک چیز کو ایک بجلی کے آلے سے چیک کیا۔ایک قمیض کے کاج میں سنسر لگا تھا۔یہ ایک بٹن نما تھا جس کی وجہ سے الارم بولا تھا۔اس نے بڑی معذرت سے کہا سیلز گرل آپ کو قمیض دیتے ہوئے سنسر اتارنا بھول گئی تھی۔پھر اس نے ساری چیزیں ہماری ٹرالی میں رکھیں اور دروازے تک ہمیں پہنچانے آیا۔لیکن مجھے اب بھی

شک ہے کہ شاید یہ بھول نہیں تھی بلکہ جان بوجھ کر سنسر کو وہاں چھوڑا گیا تھا تاکہ گاہک بھی چیک ہوجائے اور ان کا سکیورٹی سسٹم بھی۔زیادہ لین دین کریڈٹ کارڈز کے ذریعہ ہوتا ہے۔نوٹوں اور سکوں کا کام بہت کم ہے۔تمام مالز میں اور بڑے بڑے سٹورز میں بچوں کے کھیلنے کے لئے سامان بھی ہوتے ہیں اور ایک بڑا سا ریسٹورنٹ بھی ہوتا ہے۔ہر جگہ ریسٹ روم یا باتھ روم بھی ہوتے ہیں۔البتہ سب سے دلچسپ تجربہ ایک جاپانی ریسٹورنٹ میں جانے کا تھا۔ایک چوکور میز کے گرد جو لوہے کی تھی لکڑی کی میزیں لگی ہوئی تھی جن پر لوگ بیٹھتے تھے۔بینچ کی میز دراصل ایک کڑھائی تھی۔وہیں سب کے سامنے کھانا تیار کیا جاتا تھا جب پکانے والا اس پر تیل ڈالتا تو بڑا سا شعلہ اٹھتا۔اس سے بچوں کو بہت مزہ آیا۔وہ ایک ایک ڈش تیار کر کے لوگوں کے برتنوں میں ڈالتا جاتا۔

دو روز والدہ اور بھائی کے ساتھ گذارنے کے بعد ہم اپنے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئے جو شہر کے بالکل دوسری طرف تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر تھا۔اس علاقہ کا نام بوسویل Boswel ہے۔اپارٹمنٹ کو ہمارے لیے بالکل نئے سرے سے تیار کیا گیا تھا۔رنگ وروغن اور سارے قالین نئے ہیں۔اس کے علاوہ ایک عدد فرج اور کچن کا پورا سامان بمع کوکنگ رینج کے کرائے میں شامل ہے۔اپارٹمنٹ بہت کشادہ ہے۔یہ Autumn Ridge Apartment کہلاتے ہیں۔اس ایک بڑے سے احاطہ میں کوئی ۱۱۳ اپارٹمنٹ ہیں۔چوڑی چوڑی سڑکیں ہیں۔وسیع پارکنگ کی جگہیں ہیں۔ایک خوبصورت سا سوئمنگ پول ہے اور ایک بہت اچھا جمنیزیم ہے۔ہم سوئمنگ پول میں بچوں کو نہلانے لے جاتے وہاں بھی کبھی کبھی کوئی خاتون کوئی مرد کوئی لڑکی یا بچے نہا رہے ہوتے،زیادہ تر پول خالی ہی ہوتا۔پول کے چاروں طرف لمبی لمبی بینچ چیرز رکھی ہوئی ہیں۔ایک ہوا سے بھرا ہوا ٹائر بھی ہے جس میں بیٹھ کر بچے تیرتے ہیں۔جمنیزیم میں بھی مختلف قسم کی ورزش کرنے کی مشینیں لگی ہوئی ہیں۔سوئمنگ پول پر یا جمنیزیم میں کوئی اٹینڈنٹ نہیں ہوتا۔یہ اپارٹمنٹوں میں رہنے

والے خود ہی استعمال کرتے ہیں۔

گو یہاں پر ۱۱۱۳ اپارٹمنٹ ہیں جن میں دو تین سو لوگ تو یقیناً رہتے ہوں گے۔ مگر یہاں ہر وقت سناٹا رہتا ہے۔ پارکنگ میں بھی کوئی ۱۲۵ کاریں تقریباً ہر وقت کھڑی رہتی ہیں جب کہ گنجائش ۲۴۰ کی ہے۔ موٹر سائیکل صرف تین ہیں ہم نے مہینہ بھر میں صرف دو چار گاڑیوں کو آ جاتے اور دو چار لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھا۔ ایک دو بچے صبح سکول جاتے ہوئے نظر آئے یا تین چار خواتین اور کبھی کبھی کوئی ایک مرد کتوں کو ٹہلاتے ہوئے ملے۔ شادی کے سلسلے میں رات کو دو تین بجے تک غل غپاڑہ ہوتا رہا تو اوپر کے اپارٹمنٹ میں رہنے والی ایک بڑھی میم نے پہلے شکائت کی کہ وہ سو نہیں پا رہی ہے لیکن اگلے دن اس نے ایک چھٹی ٹائپ کر کے بھیجی کہ اس کا پیشہ کتوں کو سیر کرانا ہے اور اس کے لیے وہ تقریباً دس میل روزانہ پیدل چلتی ہے۔ اس لیے اس کو آرام سے سونے کی سخت ضرورت ہے اس نے درخواست کی کہ رات کو اگر لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر یا اپارٹمنٹ کے اندر جا کر باتیں کریں اور پارکنگ لوٹ میں شور نہ کریں تو وہ آرام سے سو سکے گی۔

امریکہ کی سب سے بڑی قدر جس پر یہ لوگ بہت ناز کرتے ہیں آزادی ہے اور اس کے مظاہرے ہر جگہ نظر آتے ہیں بلکہ ایک زمانے میں تو آزادی کا یہ جنون حد سے گذر گیا تھا اور لوگ تقریباً ننگے ہی بازاروں میں گھومنے لگے تھے۔ لیکن اب اس بے لگام آزادی کے خلاف ایک ردِعمل نظر آتا ہے اور لوگ سنجیدگی اور تہذیب کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اب نیم برہنہ لوگ بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ دوسری قدر جس پر امریکی فخر کرتے ہیں وہ رواداری اور مساوات ہے۔ یہ بات اب تسلیم کی جانے لگی ہے کہ امریکہ مختلف نسلوں کے لوگوں کا ملک ہے جو آپس میں بڑے بھائی چارے اور خوش اسلوبی کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن ابھی اس روشن خیالی میں کہیں امتیازات بھی نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ یہاں اکثر آبادیوں میں پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام نہیں ہے۔ لوکل سب ویز اور بسیں صرف چند مخصوص علاقوں تک

محدود ہیں۔ یہاں کی مقامی حکومتیں ٹرانسپورٹ کے نظام کو پھیلانا چاہتی ہیں۔ مگر مقامی لوگ اس کے حق میں نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر ٹرانسپورٹ کا نظام بڑھا تو اس سے جرائم بڑھیں گے۔ ان کے خیال میں چھوٹے موٹے جرائم جیسے چوری اور جیب کترنا ایسے جرائم ہیں جن میں کالے ملوث ہیں۔ چنانچہ ٹرانسپورٹ صرف کالوں کے علاقوں تک جاتی ہے اور وہ علاقے جہاں گورے اکثریت میں ہیں وہاں ان کی پہنچ نہیں۔ لیکن دراصل دیکھا جائے تو یہ امتیازی سلوک نسل کے بنیاد پر نہیں بلکہ طبقاتی ہے اس لیے کہ کالے اکثر غریب اور کم تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ بھی کہیں نہ کہیں نسلی امتیاز کا ہی نتیجہ ہے کہ کالے گوروں کی طرح ترقی یافتہ نہیں۔ اس نسلی امتیاز کی ایک مثال یہاں کا تعلیمی نظام ہے۔ کالوں کے علاقہ میں اچھے سکول نہیں ہیں اور بہت کم کالے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پہنچ پاتے ہیں۔ اسی لیے وہ اچھی ملازمتوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اسی طرح یہاں گریڈنگ کا سسٹم بھی عجیب ہے۔ ہر سکول، کالج اور یونیورسٹی کو ایک خاص تعداد میں A گریڈ دینا ہوتا ہے۔ اگر رزلٹ اچھے ہوں تو A گریڈ ۹۶% تک چلا جاتا ہے اور خراب نتیجہ کی صورت میں یہ ۷۰ یا ۸۰% تک رہ جاتا ہے۔ اس طرح کم معیار والے اداروں کے گریڈ تو A ہوتے ہیں لیکن وہ اچھے معیار کے اداروں کے طلباء سے مقابلہ نہیں کر سکتے جہاں صرف پرسنٹیج دیکھی جاتی ہے۔ یوں تعلیم میں بھی ایک طبقاتی اصول کارفرما ہے۔ اس سے سب سے زیادہ نقصان سیاہ نسل کے طلباء کا ہوتا ہے جو نہ اچھے اداروں میں داخل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اچھی ملازمتیں حاصل کر سکتے ہیں۔

اٹلانٹا میں بہت سے سینما گھر اور کئی اچھے تھیٹر ہیں اس میں شیکسپیئر ٹیورن Tavern اس لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ یہاں شیکسپیئر کے زمانے کی طرح کے تھیٹر کے ماحول کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

امریکہ کا ذکر ہو اور ہالی وُڈ کی بات نہ ہو۔ دنیا میں امریکہ ہالی وُڈ کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ اتفاقاً سان فرانسکو جانے کا موقع نکلا آیا۔ یہ اٹلانٹا۔۔جیورجیا۔۔سے چھ گھنٹے کی پرواز تھی۔ اس سفر کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ پہلی دفعہ ہمیں امریکہ کی غربت کا احساس ہوا۔ اس پوری طویل مسافرت کے دوران ایک چائے کی پیالی اور دو یا تین چھوٹے چھوٹے بسکٹوں سے مسافروں کی تواضح کی گئی جبکہ قیمت ادا کر کے مسافر کچھ بھی حاصل کر سکتے تھے۔ ہمارا انٹرنیشنل فلائٹز کا تجربہ بہت ہی مختلف تھا۔ وہاں کھانے پینے کی فراوانی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ لوکل فلائٹز بہت مالی مشکلات میں ہیں۔ سان فرانسسکو اس لحاظ سے ایک منفرد شہر ہے کہ یہاں کی سڑکیں سمندر کی لہروں کی طرح اونچی ہیں اور ٹریفک مسلسل پہاڑیوں پر چڑھتی اترتی رہتی ہے۔ یہاں کی دوسری خصوصیت وہ عظیم پل ہے جس کو گولڈن برج کہا جاتا ہے۔ اور جدید دنیا کا آٹھواں عجوبہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں بقول اُن لوگوں کے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ۔ جو ایک زمانہ میں دنیا کی سب سے اونچی عمارت تھی۔ سے زیادہ لوہا استعمال ہوا تھا۔ اِس کے قریب ہی بارکلے کی مشہور عالم یونیورسٹی UCLA تھی۔

وہاں پہنچتے ہی میں نے اپنے ایک بہت ہی عزیز دیرینہ دوست ذہانت حسین صاحب کو اپنی فرانسکو آمد کی اطلاع دی۔ وہ وہاں سے کافی دور سانتا ماریہ میں رہتے تھے۔ اور باقاعدگی سے بین الاقوامی مشاعرے منعقد کرواتے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیج دیا اور میں سانتا ماریہ چلا گیا۔ انہوں نے وہاں جا کر ایک سوشل ورکر پاکستانی خاتون سے شادی کر لی تھی اور وہ دونوں وہاں ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔

سانتا ماریہ کے قریب ہی غالباً تیس چالیس میل کے فاصلے پہ ہالی وڈ کا مشہور شہر ہے جو اپنی فلموں کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس شہر میں تھیٹر اور سینما ہال کثرت سے ہیں۔ ہالی وڈ کی سڑکوں کے کنارے پٹڑیوں پر یادگاری پتھر لگے ہوئے ہیں۔ جن پر مشہور اداکاروں کے نام لکھے ہوئے ہیں اور لوگ ان پر چلتے رہتے ہیں۔ تھوڑے فاصلے پر فلم

سٹوڈیوز ہیں جہاں مختلف چھوٹے چھوٹے سینما ہال ہیں جن میں حیرت انگیز سے لے کر دہشت انگیز improvised تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی سینما ہال کے باہر لکھا ہوا تھا ’’کمزور دل لوگ یہاں آنے کی کوشش نہ کریں۔‘‘

ہالی وڈ میں مختلف فلموں کے مشہور سیٹ بھی محفوظ کیے گئے ہیں جن میں جنوں اور چڑیلوں کے کردار بھی ہیں۔ جو سیاحوں پر بڑے خطرناک طریقے سے جھپٹتے رہتے ہیں۔ یہاں ایک مشہور فلم کا وہ سیٹ بھی ہے جس میں دریائے نیل کو دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ان کے درمیان سیاح سے گزرتے رہتے ہیں۔

ایک روز ہمیں پتہ چلا کہ اٹلانٹا کے ایک یونانی چرچ میں ایک جشن منایا جا رہا ہے۔ ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ کار پارکنگ چرچ سے دو یا تین فرلانگ دور تھی۔ وہاں سے چرچ تک جانے کے لیے خصوصی بسیں چلائی گئی تھیں۔ جو اٹلانٹا کے مختلف سکولوں سے لی گئی تھیں۔ چرچ میں داخلہ کے لیے ایک ٹکٹ بھی خریدنا پڑا۔ چرچ کے باہر بہت سے سٹال لگے ہوئے تھے جن پر تبلیغی لٹریچر رکھا ہوا تھا۔ پھر ہم چرچ میں داخل ہو گئے۔ یہ چرچ بہت خوبصورت تھا اور مذہبی تصاویر اور نقوش سے سجا ہوا تھا۔ چرچ سے ہو کر ہم ایک بڑے ہال میں گئے۔ وہاں مردوں اور عورتوں کا ایک گروپ یونانی لوک رقص کر رہا تھا، اِن میں سب ہی پختہ عمر کے لوگ تھے، حیرانی کی بات تھی کہ رقص کرنے والوں میں لڑکے لڑکیاں نہیں تھے۔ رقص ختم ہونے کے بعد ہم ہال میں لگے ہوئے مختلف اقسام کے سٹال دیکھتے رہے جن پر سامان آرائش و زیبائش اور فن پارے اور مجسمے فروخت کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ اِسی طرح مختلف اقسام کے کھانے قیمت ادا کر کے لئے جا سکتے تھے۔ چرچ کیلئے سرمایہ حاصل کرنے کا یہ عجیب طریقہ تھا، ویسے تو نیویارک کے ایک چرچ میں ہم نے Bingo Club کا بورڈ بھی دیکھا تھا۔

ایک اور پر لطف اور منفرد نظارہ جیورجیا ریاست کے صدر مقام اٹلانٹا میں دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ جشن جس میں میلے کا سا سماں ہوتا ہے لیبر ڈے کے قریب ہر سال ستمبر کے پہلے ہفتہ میں منایا جاتا ہے۔ جس میں پورے امریکہ سے بڑی تعداد میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شریک ہوتے ہیں۔ ایک تخمینہ کے مطابق اِس برس 2015ء میں کوئی اَسی ہزار لوگ اِس میں شریک ہوئے اِسے Dragon.com کا نام دیا گیا ہے۔ اِس میں لڑکے اور لڑکیاں کارٹونوں کے کرداروں کے لباس سے پہنے اِدھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں۔ کلبوں اور ریستورانوں میں بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں اور خوش گپیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ ہر شخص نے چہرے پہ کوئی نہ کوئی Mask چڑھایا ہوتا ہے۔ کوئی کچھوا بنا ہوتا ہے تو کوئی ریچھ اور کوئی فرعون اور فراعنہ۔ یہ کارٹون فلموں کو فروغ دینے کا ایک بہت کامیاب طریقہ بھی ہے اور تفریح کا منفرد انداز بھی ہے۔

اِس سارے ہنگامہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اِس میں کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ نہ دھکا پیل۔ نہایت مہذب اور سلیقہ کے ساتھ یہ سماں گھنٹوں جاری رہا۔ گو وہاں گھڑ سوار اور سپاہیوں کے ساتھ ساتھ تھوڑے گھوڑے سوار فاصلہ پر پولیس اہلکار بھی تعنیات تھے۔ لیکن یہ بھی جشن کا حصہ ہی نظر آتے تھے۔ نہ کوئی بدتمیزی نہ کوئی ہلّا گلا۔ پولیس والے بھی تماشائیوں کی طرح اِن مناظر کا لطف لے رہے تھے۔

سفر جاری ہے۔

☆☆☆

رضی عابدی

سونی پت مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم دلی میں حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئے اور پنجاب یونیورسٹی سے پہلے بی۔ایس۔سی، اور پھر ایم۔اے (انگریزی) کیا۔ بعدازاں کیمرج سے ٹرائی پاس کی ڈگری حاصل کی۔ اُردو اور انگریزی زبانوں میں تنقیدی مضامین لکھتے ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں کچھ تراجم بھی شامل ہیں۔

تصانیف اُردو:۔

1- مغربی ڈرامہ اور جدید ادبی تحریکیں
2- تیسری دنیا کا ادب
3- اچھوت لوگوں کا ادب
4- تین ناول نگار (قراۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین)
5- سوز و ساز (کچھ نظمیں کچھ غزلیں)
6- بازار کی رونق

تصانیف انگریزی:۔

1- The Tragic Vision
2- Educational Chaos
3- Search for Medium
4- Lays and Laments

تراجم:۔

1- جیون دھاڑا طلحہ حسین
2- انار کے سائے طارق علی
3- نوجوان شاعر کے نام خطوط رِلکے

KITAB MAHAL (Pvt.) Ltd.
FOLLOW US ON facebook Like www.facebook.com/kitabmahalbooks